مکالمہ

ڈاکٹر حافظ محمد زبیر

دار الفکر الاسلامی

نام کتاب: مکالمہ

مصنف: ڈاکٹر حافظ محمد زبیر

ناشر: دار الفکر الاسلامی

جلد: سوم

صفحات: 300

قیمت: 400روپے

طبع اول: اکتوبر، 2017ء

ای میل: mzubair@ciitlahore.edu.pk

hmzubair2000@hotmail.com

مصنف کی کتب کے ملنے کا پتہ:

- ☆ عبد المتین مجاہد: 36-K، ماڈل ٹاؤن، لاہور۔ 0300-4199099
- ☆ مجلس تحقیق اسلامی، 99-J، ماڈل ٹاؤن، لاہور۔ 042-35839404
- ☆ قرآن اکیڈمی، یسین آباد، فیڈرل بی ایریا، کراچی۔ 021-36337361

مصنف کی دیگر کتب:

- ☆ وجود باری تعالیٰ: مذہب، فلسفہ اور سائنس کی روشنی میں
- ☆ صالح اور مصلح: کتاب وسنت اور سلف صالحین کے منہج پر تزکیہ نفس اور اصلاح احوال کا پروگرام
- ☆ اسلام اور مستشرقین
- ☆ مولانا وحید الدین خان: افکار و نظریات
- ☆ فکر غامدی: ایک تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ
- ☆ عصر حاضر میں تکفیر، خروج، جہاد اور نفاذ شریعت کا منہج

مصنف کی جملہ کتب کے پی ڈی ایف ورژن کا ڈاؤن لوڈ لنک:

http://kitabosunnat.com/musannifeen/muhammad-zubair-temi.html

مکالمہ

ڈاکٹر حافظ محمد زبیر
اسسٹنٹ پروفیسر، کامساٹس انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی، لاہور
ریسرچ فیلو، مجلس تحقیق اسلامی، ماڈل ٹاؤن، لاہور
ریسرچ فیلو، شعبہ تحقیق اسلامی، قرآن اکیڈمی، لاہور

دار الفکر الاسلامی

لاہور

بسم الله الرحمن الرحيم
In The Name Of Allah, The Most Beneficent, The Most Merciful

﴿وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾

[النحل: 125]

”اور ان سے مکالمہ کریں، اس طریقے سے جو بہترین ہو۔“

انتساب

اہلیہ محترمہ کے نام

کہ بلاشبہ میں آج جو کچھ بھی ہوں، اس ہونے کے ظاہری اسباب میں

سے ایک بڑا سبب وہ بھی ہیں۔

فہرست مضامین

مقدمہ

مکالمہ کی تیسری جلد قارئین کے پیش خدمت ہے۔ اس جلد میں فیس بک اور سوشل میڈیا پر شیئر کی جانے والی اُن تحریروں کو جمع کرنے کے بعد تہذیب و تنقیح کے ساتھ پبلش کیا جا رہا ہے جو امن اور جنگ، اعلام اور شخصیات، مسالک اور جماعتیں، فنون لطیفہ اور اسلام، طنز و مزاح اور انکارِ حدیث اور حجیتِ حدیث سے متعلق ہیں۔

اس جلد میں کچھ تحریریں ایسی بھی جمع ہو گئی ہیں کہ جن میں بعض شخصیات اور جماعتوں پر نقد کی گئی ہے۔ چونکہ ہمارے ہاں تعصب کی جڑیں بہت گہری ہیں لہذا عموماً کوئی بھی فرد یا جماعت یہ پسند نہیں کرتی کہ اس پر نقد کی جائے لیکن سب یہ ضرور پسند کرتے ہیں کہ ان کے مخالفین پر نقد کی جائے۔ اس لیے جب آپ اُن پر نقد کر رہے ہوتے ہیں جو دوسروں کے لیے بھی فریق مخالف ہیں تو دوسرے آپ کے قصیدے پڑھتے رہتے ہیں لیکن جیسے ہی آپ کسی ایک شخصیت پر نقد کر دیتے ہیں جو دوسروں کی ممدوح ہو تو دوسروں کا بس نہیں چلتا کہ آپ کی مدح میں پڑھے ہوئے قصیدے کو کسی طرح ہجو میں تبدیل کر دیں۔

ایک بہت اچھے اور معروف رائٹر نے میری کتاب فکر غامدی کے مطالعہ کے بعد کہا کہ دل کرتا ہے کہ آپ کے ہاتھ چوم لوں۔ میں نے جواب میں کہا کہ اب تو ایسی تعریفوں سے وحشت ہونے لگی ہے۔ اور میں صاف کہتا ہوں کہ اس کی وجہ کوئی اندر کی نیکی نہیں ہے بلکہ یہ ڈر اور خوف ہے کہ اگر کسی مداح صاحب کو یہ معلوم ہو گا کہ میں نے ان کے کسی ممدوح پر بھی تنقید کر رکھی ہے تو وہی دل جو میرے ہاتھ چومنے کی خواہش رکھتا تھا، اب ہاتھ جھٹک دینے کی کوشش کرے گا۔

اور میں اب تکلف سے سچ کی طرف آنا چاہتا ہوں کہ جو میں ہوں، سو ہوں، اچھا ہوں یا برا ہوں۔ مجھے اب لوگوں کو خوش رکھنے کے لیے نیکی، تقوی، تواضع اور انکساری کی کوئی نقاب اوڑھنے کی خواہش نہیں رہ گئی۔ ایک دوست نے کمنٹ کیا کہ آپ نے مکالمہ کی دوسری جلد میں لکھا کہ آپ محقق اور مفکر ہیں حالانکہ یہ لکھنا آپ کے وصف

تواضع کے خلاف ہے۔ تو بھئی، متواضع تو میں پہلے بھی نہیں تھا۔ اگر آپ کو لگا تھا کہ میرے اندر تواضع ہے تو تو شاید میں نے کوئی نقاب اوڑھ رکھی ہو گی۔ اب تمام نقابیں اوڑھ کر ایک ہی حال کو اپنا حال بنانے کی فکر ہے اور وہ سچ کا حال ہے۔ میں اپنے آپ کو محقق اور مفکر سمجھتا ہوں تو اب یہی بیان کروں گا کہ یہی سچ کے حال کے موافق بات ہے۔ رہی جھوٹی تواضع ہے تو اس کا فائدہ نہیں ہے۔ اور سچی تواضع اگر اللہ نصیب فرما دے تو بڑی بات ہے اگرچہ ہم اس کے اہل نہیں ہیں۔

مجھے اس بات کا احساس ہے کہ اس کتاب میں نقد کے دوران الفاظ کی سختی در آئی ہے۔ اور مجھے اپنے اس غلط عمل کی کوئی ایسی گھسی پٹی توجیہ بیان نہیں کرنی کہ کسی کی رسولی نکالنے کے لیے نشتر لگانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ میں نے وہ سخت جملے نکالنے کی کوشش کی ہے لیکن بات یہ ہے کہ اُن کے بغیر بات بنتی نہیں ہے کیونکہ وہ عبارات ایک خاص کیفیت میں لکھی گئی ہیں لہذا اب انہیں ان کیفیات سے علیحدہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ اور میں یہ دعوی بھی نہیں کرتا کہ اس کتاب میں کسی کے بارے سخت جملے بولتے ہوئے اس کی تحقیر نہیں کی گئی۔ اگر ریڈر کو احساس ہو کہ کسی کی تحقیر کی گئی ہے تو مطلب کی گئی ہے۔ اور اگر خیال ہو کہ نہیں کی گئی تو نہیں کی گئی۔

جو کام ایک عرصے سے میں ضرور کرتا ہوں، چاہے تکلف سے کروں کہ جس پر تنقید کرتا ہوں تو اس کے حق میں لازماً دعا کرتا ہوں؛ ہدایت کی، مغفرت کی، دنیا و آخرت کے درجات کی بلندی کی۔ اور اس کتاب میں میں نے یہ بھی کوشش کی ہے کہ اگر کسی میں کوئی خوبی اور خیر ہے اور وہ میرے علم میں آگئی تو تنقید کے بعد اس خیر اور خوبی کی طرف بھی اشارہ ہو جائے۔ اور تیسرا کام کہ جس کا اہتمام کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ اپنے پر جوابی تنقید کو ہمیشہ ویلکم کہوں، چاہے گالم گلوچ ہی کیوں نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں دل سے سمجھتا ہوں کہ قیامت والے دن میری تنقید اگر بے جا نکلی اور ناحق کسی مسلمان کے حقوق میں کوتاہی ہوئی تو اس کی تلافی کی بہترین صورت یہی ہے کہ لوگوں نے اس دنیا میں مجھ سے بدلہ لے لیا ہو یا مجھ پر اس جیسی زیادتی کر لی ہو۔

دوسروں پر تنقید کرنا بہت مشکل کام ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں اگرچہ بت پرستی نہیں ہے لیکن نفس پرستی اور اکابر پرستی ضرور ہے۔ایسے معاشرے میں آپ اصلاح کا کام کیا خاک کریں گے کہ جہاں فرد اپنے آپ کو حجۃ الاسلام اور شیخ الاسلام، اپنے اکابر کو سپر مین اور فرشتہ اور اپنی جماعت کو صحابہ کی جماعت سمجھنے پر مصر ہو۔اب تو کبھی کبھی یہ کیفیت شدت سے طاری ہوتی ہے کہ تحقیق وتدریس، تعلیم وتعلم اور دعوت وتبلیغ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر انسان گوشہ نشین ہو جائے اور نفس کی یہ آخری خواہش بھی پوری کر ہی دے کہ دنیا میں یہی تو ہم کرنے آئے ہیں اور وہ بھی دین کے نام پر۔

ایسے میں بس اتنا ہی ہو سکتا ہے کہ میں آپ کو کچھ سنالوں اور آپ مجھے کچھ سنا لیں۔ جب میں سناؤں تو آپ خاموش رہیں اور جب آپ کی باری آئے تو میں ہمہ تن گوش ہو جاؤں۔اور اگر اتنا بھی نہ کر سکیں تو پھر اخلاص نہیں ہے بلکہ وہی نفس پرستی اور اکابر پرستی ہے۔ میں نے جو سنانا تھا، سنا دیا۔اور اب آپ کے سنانے کا وقت ہوا چاہتا ہے اور میں ہمہ تن گوش ہوں۔ [1]فٹ نوٹ میں میرا صراحہ اکاؤنٹ موجود ہے۔پلے اسٹور سے اپنے اسمارٹ فون میں یہ ایپ ڈاؤن لوڈ کریں، اس پر اکاؤنٹ بنائیں۔اور اپنی شناخت ظاہر کیے بغیر مجھ پر جو غصہ نکالنا ہے، نکال باہر کریں۔

اللہ آپ کو خوش رکھے اور آپ کے ممدوحین کو بھی۔اور آپ کی دنیا اور آخرت مجھ سے بہتر بنائے۔اور یہ آخری دعا انسان کسی ایسے شخص کو نہیں دے سکتا کہ جس سے اس کو بغض ہو۔ اللہ عزوجل آپ کو بھی اتنا حوصلہ دے کہ آپ بھی اپنی تنہائی میں میرے حق میں یہی دعا سچے دل سے کر سکیں۔ جزاکم اللہ خیرا۔

ابو الحسن علوی

[1] hmzubair2000.Sarahah.com

باب دوازدہم

فنون لطیفہ اور اسلام

اس باب میں فنون لطیفہ کے بارے بنیادی سوالات پر بحث کی گئی ہے۔

محبت کی خواہش

ہر شخص چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش رکھتا ہے۔ اگر تو اس نے کسی کو محبوب بنا لیا تو اس کے پاس زندہ رہنے کا بڑا جواز موجود ہے جیسا کہ والدین۔ اور اگر اسے کسی کا محبوب بننا نصیب ہو گیا تو اسے زندہ رہنے کا چھوٹا جواز میسر آ گیا جیسا کہ اولاد۔ اور جسے یہ دونوں میسر نہ آئیں، وہ زندہ رہنے کا جواز کھو بیٹھتا ہے، جدید انسان کا یہی المیہ ہے کہ نہ وہ کسی سے محبت کر سکتا ہے، نہ کسی سے محبت لے سکتا ہے۔

ٹائم لائن سے ہوم تک

جسے اچھا لکھاری بننا ہے، اسے چاہیے کہ زیادہ تر اپنی ٹائم لائن پر ہی رہے۔ ہوم پر تو اسے زیادہ تر کچرا ہی دیکھنے کو ملے گا۔ کوئی بیس پوسٹوں کے بعد ایک آدھ کام کی نظر آئے گی۔ اگر دوسروں کو پڑھنے کا شوق ہی پورا کرنا ہے تو کسی ویب سائیٹ مثلاً "دلیل" یا "مکالمہ" وغیرہ پر کچھ وقت گزار لے، یہ زیادہ بہتر بھی ہے اور مفید بھی۔

خواتین ناول نگار اور مذہبی رومانویت

جویریہ سعید کی اس موضوع پر ایک اچھی تحریر "دانش" پر نظر سے گزری۔[1] عمیرہ احمد اور نمرہ احمد نے جس مذہبی خاتون کو اپنے ناولز کا ہیرو بنایا ہے تو اس کا ایک تنقیدی مطالعہ اس مضمون میں پیش کیا گیا ہے۔ تنقید نگار کی بعض باتوں سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اس تنقید سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی ذہن نے تفریحی ادب کے ذریعے معاشرے کی فکری اور عملی اصلاح میں بڑے پیمانے پر مثبت کردار ادا کیا ہے اور مذہب کے مخالفین کو ان مذہب پسند ادیبوں کا یہ کام بالکل بھی پسند نہیں ہے۔

پس لفظ کی کیا اہمیت ہے، مذہبی لوگوں کو اب ایسی تحریریں پڑھ کر جان لینا چاہیے کہ لفظ کو سیکھنا بہت ضروری ہے، اس کے بغیر دین کی تبلیغ کا فریضہ بس ایک فریضہ ہی رہ جائے گا۔ کسی زمانے میں فلسفے کا دور تھا، پھر سائنس کا دور آیا اور اب ہم لسانیات کے دور

---

[1] http://daanish.pk

میں داخل ہو رہے ہیں۔ دنیا میں فکری غلبہ انہی کا مقدر بننے والا ہے جو اس میدان کے ماہر ہیں، چاہے حق پر ہوں یا باطل پر۔ تاریخ اسی طرف واپس آ رہی ہے، جہاں سے چلی تھی۔ قرآن مجید کو کلام ہونے کے اعتبار سے معجزہ بنایا گیا تھا کہ وہ لسانیات کا دور تھا۔

اسلام کی تبلیغ میں تفریحی ادب کا استعمال

تفریحی ادب سے مراد افسانہ، ناول، ڈائجسٹ، ڈرامہ، شارٹ اسٹوری، فلم، ڈاکومنٹری، اینیمیشن، کارٹون اور ویڈیو گیمز وغیرہ ہیں۔ اسلام کی دعوت و تبلیغ اور نشر واشاعت میں تفریحی ادب کے استعمال کے بارے میں اہل علم کی تین آراء ہیں:-

ایک رائے تو یہ ہے کہ یہ جائز ہے بلکہ مستحسن یعنی اچھا ہے بلکہ کسی حد تک ضروری ہے کہ آج دنیا میں نظریات اور افکار کی تبلیغ اور نشر وشاعت کا سب سے بڑا اور موثر ہتھیار یہی ہے یعنی تفریحی ادب۔ ہالی وڈ محض انٹرٹینمنٹ کا ادارہ نہیں ہے بلکہ مغربی افکار اور کلچر کے فروغ اور ان کی دعوت و تبلیغ کا سب سے بڑا عالمی ادارہ ہے جیسا کہ بالی وڈ نے بھی انڈین کلچر کو دنیا میں پھیلانے میں بڑا موثر کردار ادا کیا ہے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ اسلام کی تبلیغ کے لیے نہیں بلکہ دین کے دفاع کے لیے تفریحی ادب کا استعمال جائز ہے یعنی دین اسلام پر جو طعن و تشنیع کی گئی ہے، جو کیچڑ اچھالا گیا ہے، اس کے لیے تفریحی ادب ہی کو ٹول بنایا گیا ہے لہذا اس کا جواب بھی اسی ہتھیار کے استعمال سے ہی دیا جا سکتا ہے، کسی اور طرح سے دیا گیا ریسپانس نہ تو کارگر ہو گا اور نہ ہی موثر۔ اور تیسری رائے یہ ہے کہ یہ جائز نہیں ہے جیسا کہ عام طور روایتی فکر یہی ہے اور میرے خیال میں یہ تیسری رائے بہر صورت غلط ہے۔

تزئین حسن ہاورڈ یونیورسٹی میں صحافت کے شعبہ میں زیر تعلیم ہیں، "دلیل" ویب سائیٹ کی مستقل لکھاری ہیں۔ [1] کل ہی "دلیل" کی ورق گردانی کے دوران ان کے دو کالم سامنے آئے۔ جو لوگ اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں تو ان تحریروں کا ضرور مطالعہ کریں۔

---

[1] https://daleel.pk/

① کیا تفریحی ادب چھچھورا ہوتا ہے؟

② تاریخی فکشن: ادب کی صنف یا دشمن کو بدنام کرنے کا ہتھیار۔

ان تحریروں کے مطالعہ سے اس موضوع پر کام کرنے کی اہمیت کا احساس اجاگر ہو گا۔اور جو مذہبی ذہن رکھنے والے دوست ماس کمیونیکیشن یا صحافت کے شعبے سے وابستہ ہیں اور اس شعبے میں کچھ کرنا چاہتے ہیں تو وہ تو ضرور ان کو پڑھیں۔

کافی عرصے سے خواہش تھی کہ تحریک اسلامی "فلم میکنگ" کا کوئی عالمی ادارہ قائم کر لے اور اس بارے میڈیا سے وابستہ کچھ دوستوں کو مشورے بھی دیتا رہتا تھا لیکن تحریک اسلامی کی مذہبی پوزیشن ایسی ہے کہ اس پر خود سے کچھ کام کرنے کی ہمت کرنا شاید اس کے لیے ممکن نہیں ہے۔ لیکن اب اس موضوع پر یہ دو کالم پڑھے تو احساس ہوا کہ امت میں ایسے لوگ موجود ہیں، جو کچھ کرنا چاہتے ہیں اور کر رہے ہیں، اور ہر شعبے میں ہیں۔اور شاید کبھی تحریک اسلامی ایسے لوگوں سے فائدہ اٹھا لے۔

اور جب تک ایسا سوچنے والے امت میں موجود ہیں تو اس امت کو غزو فکری میں شکست سے دوچار کرنا مشکل ہی نہیں، ناممکن بھی ہے۔اللہ کا شکر ہے کہ امت میں ایسی سوچ موجود ہے اور اس پر دوبارہ شکر ہے کہ مذہبی ذہن اور فکر رکھنے والوں میں ہے۔

تصویر کا مسئلہ

ہاتھ سے بنائی ہوئی تصویر، چاہے وہ سایے والی ہو جیسا کہ مجسمہ (statue) یا بغیر سایے کے ہو جیسا کہ عام تصویر، اس کی ممانعت اور حرمت پر ائمہ اربعہ اور محدثین کا اتفاق ہے کہ صحیح مسلم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یہ حکم دے کر بھیجا کہ وہ ہر مجسمے کو زمین بوس کر دیں اور ہر اونچی قبر کو زمین کے برابر کر دیں۔ صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ قیامت والے دن شدید ترین عذاب ان لوگوں کو دیا جائے گا کہ جو تصویر بنانے والے ہیں۔ سنن البیہقی کی ایک روایت کے مطابق تصویر سے مراد سر ہے، چاہے بقیہ دھڑ نہ بھی ہو تو محض سر پر تصویر کا اطلاق ہو گا اور اگر سر نہ ہو تو وہ تصویر نہیں ہے۔

صحیح بخاری کی ایک روایت کے مطابق ایک شخص حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا کہ میں تصویریں بناتا ہوں اور یہ میرا پیشہ ہے تو انہوں نے اس شخص سے کہا کہ میں تمہیں اللہ کے رسول ﷺ کی حدیث سناتا ہوں کہ آپ نے کہا کہ جس نے کوئی تصویر بنائی تو اللہ عز و جل اس کو اس وقت تک عذاب دے گا جب تک کہ وہ اس میں روح نہ پھونک دے اور وہ اس میں کبھی روح نہ پھونک سکے گا۔ یہ سن کر اس شخص کا رنگ بدل گیا تو حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا کہ اگر تو نے تصویر بنانی ہی ہے تو غیر ذی روح چیزوں کی بنالے جیسا کہ یہ درخت ہے۔

تصویر کی حرمت کی علت جو روایات میں نقل ہوئی ہے، وہ "شرک" ہے؛ چاہے ربوبیت کا ہو یا الوہیت کا۔ تو تصویر بنانے والا ربوبیت میں شریک ہونے کی کوشش کرتا ہے جیسا کہ صحیح بخاری کی ایک روایت کے الفاظ کے مطابق "يخلق كخلقي" کہ اللہ کی مخلوق کی طرح مخلوق بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ یعنی خدا خالق ہے تو یہ بھی اپنے شاہکار کی تخلیق کے ذریعے خالق بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ یا الوہیت میں شرک کا ذریعہ بن جاتا ہے کہ یہ تصاویر عموماً اپنی تعظیم اور عبادت کے رستے شرک کا بہت بڑا سبب بن جاتی ہیں۔ لوگ ان تصاویر کو مقام عزت پر سجا کر جیسا کہ ڈرائنگ روم وغیرہ میں ٹانگ کر ان کی تعظیم کرتے ہیں یا ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر یا ان کا دھیان، گیان اور مراقبہ کر کے ان کی عبادت کرتے ہیں۔

البتہ معاصر علماء میں اس مسئلے میں اختلاف ہو گیا کہ کیمرے اور ویڈیو کی تصویر، تصویر ہے یا نہیں ہے۔ علماء کے ایک گروہ کا موقف ہے کہ کیمرے اور ویڈیو کی تصویر بھی احادیث میں منقول تصویر کے حکم میں شامل ہے اور حرام ہے۔ البتہ یہ علماء اضطرار کے تحت پاسپورٹ اور آئی۔ڈی کارڈ کی تصویر وغیرہ یا مصلحت کے تحت بچوں کے کھلونے وغیرہ کو مستثنیٰ قرار دیتے ہیں جیسا کہ شیخ بن باز، علامہ البانی، ڈاکٹر سرفراز نعیمی، مولانا رشید میاں تھانوی، حافظ صلاح الدین یوسف وغیرہ کا موقف یہی ہے۔

علماء کے دوسرے گروہ کا کہنا ہے کہ کیمرے اور ویڈیو کی تصویر، احادیث میں جس

تصویر سے منع کیا گیا ہے، اس کے حکم میں شامل نہیں ہے اور ممانعت اور حرمت صرف ہاتھ سے بنائی جانے والی تصاویر کی ہے کہ وہ انسانی ذہن کی تخلیق ہوتی ہیں لہذا اس پر "يخلق كخلقي" کے الفاظ صادق آتے ہیں جبکہ کیمرے اور ویڈیو کی تصویر میں آپ اللہ ہی کی تخلیق کو ایک آلے کے واسطے سے بعینہ کاغذ یا پردہ اسکرین پر منتقل کر دیتے ہیں۔ لہذا ان کے نزدیک کیمرے اور ویڈیو کی تصویر میں اصل اباحت ہے۔ یہ موقف علامہ یوسف قرضاوی، شیخ محمد بن صالح العثیمین اور شیخ عبد الرحمن عبد الخالق وغیرہ کا ہے۔

علماء کے تیسرے گروہ کا موقف یہ ہے کہ ہاتھ سے بنائی ہوئی تصویر ہو یا کیمرے کی جبکہ اسے ثبات اور دوام حاصل ہو جائے یعنی اسے کاغذ پر اتار لیا جائے تو وہ حرام ہے کیونکہ اب اس میں شرک کا سبب بننے کی اہلیت مکمل ہو گئی ہے۔ اور ویڈیو کی تصویر ان کے نزدیک جائز ہے کہ اسے ثبات اور دوام حاصل نہیں ہے اور اس کی حقیقت برقی ذرات ہیں۔ یہ موقف مولانا تقی عثمانی، مولانا محمد یوسف خان اور مولانا عتیق الرحمن سنبھلی وغیرہ کا ہے۔ راقم کا رجحان اس مسئلے میں اسی موقف کی طرف ہے اور اسی کو درست سمجھتا ہے۔ البتہ کیمرے اور ویڈیو کی وہ سافٹ تصویر جو بے پردگی، بے حیائی، فحاشی، تشدد یا دیگر کسی نوعیت کے معاشرتی فساد اور بگاڑ کا باعث بنے تو وہ حرام ہو گی۔

موویز اور فلمیں دیکھنا

مولانا رعایت اللہ فاروقی صاحب معروف صحافی ہیں۔ یہاں فیس بک پر بھی اور اس کے علاوہ بھی اچھا لکھتے ہیں۔ مولانا ان لوگوں میں سے ہیں کہ جن سے اختلاف رکھنے کے باوجود میں کچھ نہ کچھ سیکھتا ہی رہتا ہوں۔ مولانا نے حال ہی میں موویز، ناولز اور فلموں کے موضوع پر ایک پوسٹ لگائی ہے کہ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر وہ فلمیں نہ دیکھتے تو آج وہ اتنے اچھے لکھاری نہ ہوتے جتنا کہ لوگ انہیں سمجھتے ہیں بلکہ وہ اسی طرح کے روایتی مولوی ہی ہوتے کہ جنہیں کوئی پڑھنا پسند نہیں کرتا۔

ہمارے خیال میں یہ ایک ایسی پوسٹ ہے کہ جو مذہبی طبقات خاص طور نوجوانوں کو فلمیں دیکھنے کا ایک جواز فراہم کر دے گی۔ جو پہلے ڈر ڈر کے دیکھتا تھا، اب کچھ بننے کی

امید پر دیکھے گا۔ اور جو نہیں دیکھتا تھا، وہ بھی یہ سوچے گا کہ شاید کچھ بننے کا رستہ ادھر سے ہی ہو کر گزرتا ہے حالانکہ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ اس لیے ہمیں مولانا کی اس پوسٹ پر کچھ گزارشات پیش کرنی ہیں، امید ہے کہ وہ غور فرمائیں گے۔

ہمارے سامنے بہت سی ایسی زندہ مثالیں بھی ہیں کہ جنہوں نے فلموں کے بغیر ہی وہ کام کر لیا ہے جو مولانا کے بقول روایتی علماء نہیں کر سکے یا اس منزل تک پہنچ گئے کہ جس تک روایتی علماء نہ پہنچ سکے لہذا اگر ہم ان حضرات کو آئیڈیل بنائیں تو بھی اس منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہیں کہ جس کا مولانا نے اپنی پوسٹ میں ذکر فرمایا ہے۔ نام تو میرے ذہن میں اس وقت بہت سے آ رہے ہیں لیکن صرف ایک کا ذکر کرنا چاہوں گا کہ جو مولانا کے بھی بہت ممدوح ہیں؛ احمد جاوید صاحب۔

اور ابھی فلم کی بات آ ہی گئی تو یہ بھی مولانا کے فالوورز کو بتلاتا چلوں کہ جسے فلم چھوڑنے کی خواہش ہو لیکن چھوٹتی نہ ہو تو کسی صاحب حال کہ جسے فلم دیکھنے کی عادت نہ ہو، کی مجلس میں ایک سال تک جائے، اسے فلم سے طبعی نفرت پیدا ہو جائے گی، ان شاء اللہ۔ یعنی اسے فلم دیکھنے کے لیے اپنے نفس سے مجاہدہ کرنا پڑے گا اور فلم چھوڑنا اس کی طبیعت کا حصہ بن جائے گا، یہ کر کے دیکھ لیں۔

باقی میں کسی حد تک فلموں اور فلم انڈسٹری سے اپ ڈیٹ رہتا ہوں لیکن پرنٹ میڈیا کے ذریعے سے جیسا کہ بی بی سی یا وکی پیڈیا وغیرہ جیسے مصادر سے فلموں کے بارے آرٹیکلز اور رپورٹس اور خبروں کا مطالعہ کر لیا۔ یا معروف صحافی آفتاب اقبال اپنے مزاحیہ شو "خبردار" میں فلموں پر بہت معلوماتی گفتگو کرتے ہیں، میں نے کوئی دو چار مرتبہ یہ پروگرام دیکھا ہے۔ اگر موویز کے بارے معلومات حاصل کرنا زیادہ ہی ضروری ہو تو یہ پروگرام دیکھ لیا جائے کہ اس کا ضرر بہر حال موویز دیکھنے سے تو کم ہے لیکن اب تسلسل کے ساتھ ایسے ٹاک شوز دیکھنے کا بھی کوئی حال نہیں ہے۔ تو یہ بات مولانا کی درست ہے کہ جسے نوجوانوں میں کام کرنا ہے، اسے ان خرافات سے واقف ہونا چاہیے لیکن میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس واقفیت کے لیے ضروری نہیں ہے

کہ فلم ہی دیکھی جائے۔ واللہ اعلم

اگرچہ مولانا کی ان پوسٹوں کی وجہ سے بعض دوست انہیں مولانا فلمی کہنے لگ گئے ہیں لیکن میرے دل میں مولانا کی اب بھی قدر اور عزت موجود ہے کہ میرے نزدیک اچھا انسان وہ نہیں ہوتا کہ جس میں کوئی خامی نہ ہو بلکہ اچھا انسان وہ ہوتا ہے کہ جس میں خیر کا پہلو غالب ہو اور مولانا میں خیر کا پہلو غالب ہے۔ مولانا نے ایک مرتبہ پوسٹ لگائی تھی کہ جس میں عرب دنیا کے معروف قاری ماہر المعقیلی کی تلاوت کو شیئر کیا گیا تھا اور اس میں مولانا نے لکھا تھا کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے ان کی تلاوت سنی ہو اور میری آنکھیں نم نہ ہوئی ہوں۔ تو یہ بہت بڑی خیر ہے، اگر کوئی غور کرے تو!

حضرت یوسف علیہ السلام پر فلم بنانا اور اس کا دیکھنا

دوست کا سوال ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام پر جو فلم بنائی گئی ہے، کیا اس کا بنانا اور دیکھنا جائز ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ نہ تو اس کا بنانا جائز ہے اور نہ ہی اس کا دیکھنا جائز ہے بلکہ میری رائے میں تو یہ معاملہ بعض صورتوں میں کفر تک پہنچ جاتا ہے کہ جس کی تفصیل یہ ہے؛

دیکھیں، یہ بات تو بالکل درست ہے کہ جسے بھی آپ نے نبی کی صورت میں فلم میں پیش کیا ہے، وہ نبی تو ہے نہیں۔ لیکن وہ اپنے آپ کو نبی شو کر رہا ہے تو جھوٹا نبی ہوا۔ اب چاہے فلم میں ہی اس نے یہ دعوی کیا ہو اور حقیقی زندگی میں اس کا یہ دعوی نہ ہو لیکن یہ مذاق تو ہو گیا ناں، اور نبوت اور رسالت کوئی ایسا مقام نہیں ہے کہ جسے ہم اپنے کھیل تماشے کا موضوع بنا لیں۔

اب کوئی شخص یہ کہے کہ حقیقی زندگی میں تو کسی کے لیے نبی ہونے کا دعوی کرنا جائز نہیں ہے لیکن ڈرامے اور فلم میں جائز ہے تو یہ دین کو کھیل تماشا بنانے والی بات ہے اور دین کو کھیل تماشا بنانے سے منع کیا گیا ہے بلکہ مشرکین پر قرآن مجید نے یہی اعتراض کیا ہے کہ انہوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنا لیا تھا۔ اور حدیث میں ہے کہ جھوٹ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جھوٹ قرار دیا ہے، چاہے مذاق میں ہی ہو اور مذاق میں بھی اس سے

منع کیا ہے۔

اور اس کا دوسرا نقصان یہ ہے کہ یہ فلم دیکھنے کے بعد آپ کے ذہن میں حضرت یوسف علیہ السلام کی ایک امیج بیٹھ جائے گی۔ اور آئندہ زندگی میں جب بھی حضرت یوسف علیہ السلام کا نام آپ کے سامنے آئے گا، چاہے وہ قرآن مجید میں سورہ یوسف کی تلاوت کرتے ہوئے سامنے آئے، تو وہ فلم والا امیج آپ کے سامنے یا دماغ میں گھوم جائے گا حالانکہ وہ تو یوسف ہیں ہی نہیں، وہ تو ایک اداکار ہے، بس! اور ان کی اکثریت فساق وفجار پر مشتمل ہے۔ تو کہاں ایک نبی کی عصمت اور مقام اور کہاں ایک اداکار اور فلمی ایکٹر، بات بہت دور چلی جائے گی۔

اور اس کا ایک تیسرا نقصان یہ بھی ہے کہ جب آپ فلم میں کچھ دیکھ لیں گے تو اس کا تاثر زیادہ لیں گے، اور اب اگر قرآن مجید میں بھی اس فلم کے خلاف کچھ پڑھیں گے تو قرآن مجید کی تصحیح کرنے بیٹھ جائیں گے نہ کہ فلم کو غلط قرار دیں گے۔ حالانکہ فلم تو فلم ہے، وہ کوئی تحقیق یا ریسرچ تو ہے نہیں لیکن انسان نفسیاتی طور تصویر کا اثر گہرا اور زیادہ لیتا ہے۔ اور اگر آپ نے اسلامی تاریخ سے لوگوں کو روشناس کروانا ہی ہے تو صحابہ کرام کے بعد کے ادوار کو فلما لیں مثلاً نسیم حجازی کے ناولوں کو فلما لیں تو میری رائے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

بلین ڈالرز بیوٹی انڈسٹری

بیوٹی انڈسٹری کا آغاز تقریباً بیسویں صدی کے شروع میں ہوا۔ اس کا مقصد ایسی پراڈکٹس تیار کرنا تھا کہ جنہیں استعمال کر کے لوگ زیادہ خوبصورت لگیں۔ فی زمانہ عورتوں میں اس انڈسٹری کی مقبولیت کی وجہ سے یہ ایک بہت بڑی گلوبل انڈسٹری بن چکی ہے۔ 2014ء میں اس انڈسٹری کی مالیت 460 بلین ڈالرز تھی۔ اور ایرانی خواتین بیوٹی پراڈکٹس کے استعمال میں دنیا میں ساتویں نمبر پر ہیں اور سعودی خواتین ان سے دو ہاتھ آگے ہی ہیں۔ یہ تو مولویوں کی بیویوں کا حال ہے۔

اس انڈسٹری کی سب سے زیادہ استعمال ہونے والی پراڈکٹس، اسکن کیئر (skin

care) سے متعلق ہیں۔اس کے بعد بالوں کی کیئر کی پراڈکٹس اوراس کے بعد میک اپ اوراس کے بعد پرفیومز کا استعمال ہوتا ہے۔ اس انڈسٹری میں بیوٹی کریم سے لے کر کاسمیٹکس سرجری تک خوبصورت بننے کی لاکھوں پراڈکٹس موجود ہیں۔ اب تو خوبصورت بننے کے لیے وٹامن ای کے کیپسول بھی آپ کو کاسمیٹکس اسٹورز پر مل جاتے ہیں۔ اگر بازار میں چائنہ کی اسکن (skin) ملنا شروع ہو جائے تو یقین مانیے کہ سال کی سب سے زیادہ فروخت ہونے والی پراڈکٹ بن جائے۔

میک اپ کی نہ معلوم ہزاروں صورتیں اور درجات موجود ہیں۔ان میں سے ایک "منرل میک اپ" (mineral makeup) کہلاتا ہے۔ میں تو اسے "پینٹ میک اپ" کہتا ہوں کہ آپ کا چہرہ جیسا بھی ہو، ایسے پینٹ ہو جاتا ہے جیسے گھر کی دیوار۔ اخبار میں یا کہیں اور سوشل میڈیا پر ایک لطیفہ سنا تھا کہ ایک سعودی شہزادہ اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ ساحل سمندر پر گیا تو سوئمنگ کی وجہ سے جب بیگم کا میک اپ اتر گیا تو اس نے کھڑے کھڑے اسے طلاق دے دی۔ ایسی خوبصورتی کا کیا فائدہ کہ چہرہ دھونے کے بعد وہ آپ کی نہیں رہی، چاہے آپ نے برائیڈل میک اپ دو لاکھ کا کروایا تھا۔ اب دولہن باجی بس شادی کی تصویریں دیکھ دیکھ کر خوش ہو گی کہ وہ کتنی پیاری لگ رہی تھی۔ اتنا جھوٹا اطمینان اور اتنی جھوٹی خوشی!

خیر یہ تو ایک لطیفہ تھا لیکن ایک ویڈیو شیئر کر رہا ہوں کہ جس میں ایک بہت ہی معمولی یا بھدے چہرے کا لڑکا میک اپ کے ذریعے اپنے چہرے کو کیسے پینٹ کرتا ہے، اس کا مظاہرہ ہے۔ اور رہی عورتیں تو اللہ کی پناہ، کیا کچھ نہیں کر رہی ہیں۔ ایسے چہرے کا کیا فائدہ کہ جو آپ کا اپنا نہیں ہے۔ کسی حد تک عورتوں کا یہ نفسیاتی مسئلہ ہے کہ وہ خوبصورت نظر آئیں لیکن اتنا بھی کیا پاگل پن کہ ہر لڑکی حسینہ عالم نظر آنے کے چکر میں ہے۔ اور تماشا تو یہ ہے کہ اس انڈسٹری نے افریقن لڑکی کو بھی یقین کروا دیا ہے کہ ان کی بیوٹی کریم استعمال کرنے سے وہ بھی گوری ہو جائے گی۔

کیا کریں میک اپ انڈسٹری نے یہ بھی معروف کرر کھا ہے کہ میک اپ کرنے سے

عورتوں کی اینگزائٹی دور ہوتی ہے حالانکہ ریسرچ اس کے بالکل خلاف کہتی ہے۔ عورت اپنے سادہ حلیے میں زیادہ خوبصورت لگتی ہے یا میک اپ میں، یہ فیصلہ ہمیشہ اختلافی رہے گا۔ عورتیں اپنے میک اپ اور بننے سنورنے پر اتنا پیسہ برباد کر رہی ہیں کہ کوئی حساب نہیں۔ اور وہ بھی شوہر کے لیے نہیں بلکہ دوسری عورتوں میں نمایاں ہونے کے لیے، شوہر بے چارے کو تو وہ سادی زیادہ بھلی لگتی ہے کہ اسی میں اس کا خرچہ کم ہے۔

قرآن اور شاعر

قرآن مجید میں سورۃ الشعراء میں شعراء کے بارے ارشاد ہے: ﴿وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ۔ أَلَمْ تَرَ أَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ۔ وَأَنَّهُمْ يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ۔ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَذَكَرُوا اللَّهَ كَثِيرًا وَانْتَصَرُوا مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوا﴾ ترجمہ: اور شعراء تو ان کی پیروی کرنے والے لوگ بھٹکے ہوئے ہیں، کیا آپ نہیں دیکھتے کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ اور وہ جو کہتے ہیں، وہ کرتے نہیں ہیں۔ سوائے ان شعراء کے کہ جو ایمان لائے، جنہوں نے نیک عمل کیے، جنہوں نے کثرت سے اللہ کو یاد کیا، اور جنہوں نے ظلم ہونے کے بعد بدلہ لیا۔

قرآن مجید کی ان آیات میں تمام شعراء کی مذمت کی گئی ہے البتہ چند ایک کو ان سے مستثنی کر دیا گیا ہے۔ اب اہم تر اور اصولی بات یہ ہے کہ کتاب وسنت کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ فنون لطیفہ موسیقی، مصوری، مجسمہ سازی، شعر وشاعری اور فن تعمیر میں اصل ممانعت ہے[1] البتہ ان سب میں کچھ استثناءات (exceptions) موجود

[1] اگر کوئی ریڈر یہ اعتراض کرے کہ آپ نے اپنی کتاب "اسلامی نظریہ حیات" میں لکھا ہے کہ فنون لطیفہ میں اصل "اباحت" ہے اور یہاں لکھ رہے ہیں کہ اصل "ممانعت" ہے تو یہ "کھلا تضاد" نہیں ہے۔ تو عرض یہ ہے کہ اگر کسی ریڈر کو میری تحریروں میں "کھلا تضاد" نظر آئے تو کوشش کریں کہ اپنی پوزیشن تبدیل کر لیں کہ اگر صوفہ پر بیٹھے ہیں تو زمین پر بیٹھ جائیں تو ان شاء اللہ، تضاد رفع ہو جائے گا کہ زاویہ نگاہ کا اختلاف ہو گا جیسا کہ ہم نے اپنی کتاب "صالح اور مصلح" میں بیان کیا ہے کہ ایک ہی چیز کو کبھی ایک زاویے سے دیکھ کر حکم لگا دیا اور کبھی دوسرے زاویے سے بیان کر دیا۔ اور اگر پھر بھی تضاد رفع نہ ہو تو ناسخ منسوخ کا کلیہ استعمال کر لیں۔ تو یہاں ہم نے فنون لطیفہ سے مراد معاصر اور رائج معانی میں فنون لطیفہ لیے ہیں یعنی ان کا "عرفی معنی" جیسا کہ آرٹسٹوں کا بیان ہے اور اسلامی نظریہ حیات میں فنون لطیفہ سے مراد اس کے

ہیں۔اوراس ممانعت کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ تمام فنون انسان کے مقصد زندگی یعنی بندگی رب میں رکاوٹ بنتے ہیں۔

قرآن مجید نے جن شعراء کی مذمت کی ہے،ان کی تین صفات بیان فرمائی ہیں۔جن شعراء میں یہ تین صفات ہوں تو وہ قابل مذمت شعراء ہیں۔ وہ شعراء کہ جن کے پیروکار،ان کے شارحین اور انہیں سراہنے والے نقاد، بھٹکے ہوئے لوگ ہوں۔اور وہ شعراء کہ جن کی شاعری بے مقصد کی ہو کہ فن برائے فن ہو،ادب برائے ادب ہو،اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جو تصورات اور تخیلات کی ہر وادی میں گھومتے پھرتے ہوں۔تیسرا وہ شعراء جو بے عمل ہوں۔ حضرت عمر نے نعمان بن عدی رضی اللہ عنہما کو بصرہ میں امیر بنا کر بھیجا کہ انہوں نے کچھ اشعار ایسے کہے کہ جن میں شراب پینے پلانے کا ذکر تھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں صرف اسی بات پر معزول کر دیا۔

اوران شعراء کو قرآن مجید نے مستثنیٰ قرار دیا ہے کہ جن میں چار صفات ہوں۔ان میں سے تین صفات تو شاعر کی ہیں اور دو اس کے کلام کی ہیں۔شاعر کی تین صفات میں سے یہ ہیں کہ وہ شاعر ایمان والے ہوں،دوسرا عمل صالح کرنے والے ہوں، تیسرا اللہ کا کثرت سے ذکر کرنے والے ہوں۔اور ان کے کلام کی دو صفات میں سے یہ ہیں کہ ان کے کلام میں اللہ کا ذکر کثرت سے موجود ہو اور ان کا کلام ظلم کے خلاف ہو۔پس وہ شاعری مذموم نہیں ہے کہ جس میں توحید کا بیان ہو،رسالت کا ذکر ہو،آخرت کا تذکرہ ہو،اور وہ شاعری کہ جس میں ظلم کا بدلہ لیا جائے، ظلم کے خلاف آواز بلند کی جائے۔

جہاں تک یہ دعوی ہے کہ شاعری انسانی جذبات میں لطافت اور نزاکت پیدا کرتی ہے کہ جس کی بنا پر ایک شاعر کو قرآن مجید کی آیات کو سمجھتے ہوئے جو احساسات حاصل ہوتے ہیں،وہ غیر شاعر کو حاصل نہیں ہوتے ہیں۔ ہمارا اس بارے کہنا یہ ہے کہ ایک غیر شاعر کے احساسات اور جذبات،ایک شاعر سے بہت بہتر ہو سکتے ہیں کیونکہ شاعری میں جن جذبات اور احساسات کو مخاطب کیا جاتا ہے،وہ غیر حقیقی ہوتے ہیں کہ جھوٹے

اصل معنی ہیں یعنی "لغوی معنی"۔

تخیلات اور تصورات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ایک دوست نے کہا کہ فلاں مفسر نے "دیوان غالب" سے قرآن مجید کی اردو میں ضخیم تفسیر لکھی ہے کہ "دیوان غالب" ہر وقت ان کے سرہانے ہوتی تھی۔تو میں نے کہا: اسی لیے تو غلط تفسیر کی ہے اور یہ صرف میں نہیں کہہ رہا اور بھی بہت سے علماء کہہ رہے ہیں کہ غلط تفسیر کی ہے۔

اس کے برعکس ہمارا دین، جو دین فطرت ہے، وہ انسانی جذبات اور احساسات کی تربیت اور نشوونما جس حقیقی اصول پر کرتا ہے، وہ صلہ رحمی، مسلم اخوت، باہمی الفت اور ہمدردی کا رشتہ ہے کہ دنیا کے ایک کونے میں کسی مسلمان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو دوسرے کونے میں موجود مسلمان بے چین ہو جاتا ہے۔یہ ایک حقیقت ہے کہ سارے جہاں کا درد اگر کسی دل میں ہو سکتا ہے، وہ سچے مومن کا دل ہے کہ جو انسانوں اور مسلمانوں بلکہ جانوروں تک سے اپنے تعلق میں سچا ہے کہ ان کی تکلیف محسوس کرتا ہے نہ کہ جھوٹے شاعر کا کہ جس کا کلام اور نہ سہی تو کم از کم مبالغہ آمیز محبت یا نفرت کے اظہار کی وجہ سے ہی جھوٹا ہے۔

کیا نبی کریم ﷺ شاعرانہ ذوق رکھتے تھے؟

قرآن مجید، نبی کریم ﷺ کے بارے فرماتا ہے کہ ﴿وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهُ﴾ [الشعراء: 69] ترجمہ: نہ تو ہم نے آپ کو شعر کی تعلیم دی ہے اور نہ ہی آپ کو شعر پسند ہے۔"انبغی" کا لفظ "بغي" سے ہے کہ جس کا بنیادی معنی چاہت اور پسند ہے جیسا کہ سنن الترمذی کی ایک روایت کے الفاظ "يا باغي الخير" میں ہے یعنی اے خیر کی چاہت رکھنے والے۔امام ابن کثیر رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: {وَمَا يَنْبَغِي لَهُ} أَيْ: وَمَا هُوَ فِي طَبْعِهِ، فَلَا يُحْسِنُهُ وَلَا يُحِبُّهُ، وَلَا تَقْتَضِيهِ جِبِلَّته۔ ترجمہ "وما ينبغي له" کا معنی یہ ہے کہ آپ طبعاً شعر کو پسند نہیں فرماتے تھے، نہ ہی اسے اچھا سمجھتے تھے، اور نہ ہی اس سے محبت رکھتے تھے، اور نہ ہی آپ کی جبلت اس کا تقاضا کرتی تھی۔

یہی وجہ ہے کہ آپ اکثر اوقات غلط شعر پڑھ دیتے تھے اور صحابہ اس کی تصحیح

فرماتے۔ ابن اسحاق رحمہ اللہ کی روایت کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عباس بن مرداس السلمی کا شعر الٹ دیا کہ "بين الأقرع وعيينة" کہہ دیا تو ابو بکر رضی اللہ عنہ نے تصحیح کی کہ یہ "بین عيينة والاقرع" ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب ٹھیک ہے۔ تو ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ عزوجل نے صحیح کہا ہے کہ آپ نہ تو شاعر ہیں اور نہ ہی شاعری آپ کے لائق ومناسب ہے۔ مسند احمد کی صحیح روایت میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سوال ہوا کہ کیا آپ کی مجلس میں شعر سنا سنایا جاتا تھا تو ام المومنین نے جواب دیا کہ شعر آپ کے ہاں "أبغض الحديث" تھا یعنی آپ کو بہت ہی ناپسند تھا۔ البتہ ام المومنین کے بیان کے مطابق آپ کو دعا میں جوامع الکلم پسند تھے۔ صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ آپ نے ایک شاعر کو شعر گنگناتے سنا تو آپ نے صحابہ سے کہا کہ اس شیطان کو روکو کہ تم میں کسی کا پیٹ قے سے بھرا ہے تو وہ اس سے بہتر ہے کہ شعر سے بھرا ہو۔

قرآن مجید اور احادیث کی نصوص صریحہ سے معلوم ہوا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہرگز شاعری کا ذوق نہیں رکھتے تھے۔ البتہ بعض واقعات ایسے ملتے ہیں کہ آپ نے اشعار سنے ہیں یا ان کے کہنے کی اجازت دی ہے جیسا کہ کعب بن زہیر رضی اللہ عنہ کا قصیدۃ "بانت سعاد" معروف ہے اور قصیدے کی تشبیب بتلا رہی ہے[1] کہ اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذوق کہنا ظلم ہوگا۔ پس شعر کہنے اور سننے کی یہ اجازت دو صورتوں میں محصور تھی: ایک توحید کے بیان میں، اور دوسرا نبی کے دفاع میں۔ پس اگر کوئی بڑی دینی مصلحت پیش نظر ہو تو شعر کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور اس کا کہنا جائز ہے بلکہ بعض حالات میں مستحب اور واجب بھی ہے۔ شان نزول کی روایات میں ملتا ہے کہ جب قرآن مجید کی یہ آیات نازل ہوئیں کہ شعراء کے پیروکار گمراہ لوگ ہیں اور وہ ہر وادی میں گھومتے پھرتے ہیں اور بے عمل ہیں تو حضرت حسان بن ثابت، حضرت کعب بن مالک اور حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم آپ کے پاس روتے ہوئے آئے تو آپ نے فرمایا کہ تم

[1] تشبیب سے مراد کسی قصیدے کے ابتدائی غزلیہ اشعار ہوتے ہیں کہ جن میں شاعر اپنی محبوبہ کا تذکرہ کرتا ہے۔

ان سے مستثنیٰ ہو کہ ایمان اور عمل صالح والے ہو، اور کثرت سے اللہ کا ذکر کرنے والے ہو اور کفار سے بدلے میں شعر کہنے والے ہو۔

اور صحیحین میں مروی آپ ﷺ کا یہ فرمان کہ "إن من الشعر حكما" تو اس میں "من" تبعیض کے لیے ہے کہ جس کا معنی یہ ہے کہ بعض اشعار میں حکمت ہوتی ہے اور یہ وہی ہیں جو توحید، رسالت اور آخرت وغیرہ کے باب میں ہوں جیسا کہ دوسری روایات سے واضح ہے۔ پس اس قسم کی احادیث سے یہ ثابت کرنا کہ اللہ کے رسول ﷺ شاعرانہ ذوق رکھتے تھے، ایسا ہی ہے جیسا کہ بدر و حنین اور احد و خندق کی مثالوں سے یہ ثابت کرنا کہ آپ جنگ و جدال کا ذوق رکھتے تھے۔ یا دف بجانے کی اجازت دینے والی روایات سے کوئی یہ ثابت کرے کہ آپ ﷺ میوزک کا ذوق رکھتے تھے یا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دوڑ لگانے والی روایات سے کوئی یہ ثابت کرے کہ آپ کھیل کود کا بھی خوب ذوق رکھتے تھے وغیر ذلک کثیر۔ ذوق نبوی اس طرح ثابت نہیں ہوتا، اس کے لیے صریح نص چاہیے جیسا کہ سنن النسائی کی روایت ہے: "وجعلت قرة عيني في الصلوة"۔ ترجمہ: میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھ دی گئی ہے۔ اس طرح ذوق نبوت ثابت ہوتا ہے۔

قرآن مجید شعر ہے یا نثر؟

ہمارے ایک فاضل دوست جناب ڈاکٹر شہباز احمد منہج صاحب کا کہنا ہے:

"نفس شعر کے بارے میں قرآن کا مزاج اس سے ہی واضح ہے کہ وہ خود شاعرانہ اترا۔ قرآن کو اگر شعر سے کد ہوتی تو وہ خود ایسا شعر بن کر نہ آیا ہوتا کہ شعراء بھی اس کے آہنگ، اثر انگیزی، لطافت اور معانی آفرینی پر مٹ مٹ جاتے۔ اس نے عام شاعری کے ردھم سے بڑھ کر ردھم و موسیقیت اور حسِ لطیف کو اپیل کرنے والے اندازِ کلام کا اہتمام کیا۔ بعض شعرا نے قرآن سے متاثر ہو کر جو شاعری چھوڑی تھی تو اسی وجہ سے کہ قرآن ان کو اپنے شعر سے بہت آگے کی شاعری نظر آیا تھا۔"

ڈاکٹر صاحب کا کہنا یہ بھی ہے:

”قرآن نے فی الواقع ان آیات میں فضولیات شعری کی مذمت کی ہے، نہ کہ مطلق شعر کی۔“

سوال یہ ہے کہ آپ کے استدلال کی بنیاد کیا ہے، خود قرآن مجید؟ اگر ہاں تو کیا قواعد لغویہ عربیہ کے مطابق آپ قرآن مجید کی آیات کا فہم بیان کر رہے ہیں یا آپ ہوا میں تیر چلا رہے ہیں؟ قرآن مجید نے جہاں شعراء کی مذمت کی ہے یعنی ﴿وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ﴾ [الحاقة: 224] میں تو یہاں لام، استغراق کا ہے اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ بعد میں استثناء موجود ہے لہذا تمام شعراء اس میں شامل ہیں۔ اسی طرح عربی زبان کا مسلمہ قاعدہ یہ ہے کہ نکرہ کے سیاق میں جب نفی ہو تو وہ اپنے عموم میں نص ہوتی ہے لہذا﴿وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ﴾ [الحاقة: 41] میں ہر قسم کے شاعر کی نفی ہے، اور اس معنی میں یہ آیت نص ہے اور نص کہتے ہیں "ما سيق الكلام لأجله" کو یعنی جس مقصد سے کلام لایا جائے، وہ مقصد نص ہے نہ کہ لفظ۔ اگرچہ اس مقصد کے تعین کا واحد ذریعہ وہ لفظ ہی ہے۔ لہذا مقصد کو جاننے کا ہر دروازہ لفظ سے ہو کر گزرتا ہے اگرچہ لفظ خود مقصد نہیں ہے۔

قرآن مجید نہ تو شعر ہے اور نہ ہی نثر ہے۔ یہ کیا ہے؟ یہ قرآن مجید ہے۔ یہی جواب قرآن مجید کے بارے میں ائمہ دین بلکہ سچے شعراء اور ادباء تک نے دیا ہے۔ سورہ فصلت کی آیات سنانے پر آپ ﷺ کے دشمنوں میں سے عتبہ بن ربیعہ نے قرآن مجید کے شعر ہونے کا مطلقاً انکار کیا تھا۔ انیس الغفاری رضی اللہ عنہ نے کہا تھا کہ میں نے قرآن مجید کو شاعری کی انواع پر پرکھا اور یہ جانا کہ قرآن مجید کا شاعری سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ابو بکر الباقلانی، ابو العباس القرطبیؒ اور عیسی بن علی الرمانی رحمہم اللہ نے بھی یہی بات کی ہے۔ طه حسین مصری تک نے کہا ہے کہ قرآن مجید نہ تو شعر کی صورت ہے اور نہ ہی نثر کی، بس اسے قرآن مجید کہو۔

ڈاکٹر صاحب کا کہنا یہ بھی ہے:

”شعر و سخن نافہمی اور بدذوقی قرآن میں بصیرت سے مانع ہے۔“

اگر ایسا ہی ہے تو حضرت حسان بن ثابت، کعب بن مالک، عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم وغیرہ حضرت عمر بن خطاب، حضرت عبد اللہ بن مسعود، حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے زیادہ قرآن فہمی میں ماہر ہوتے حالانکہ پہلے تین کا تو قرآن فہمی میں کچھ حصہ منقول نہیں ہے حالانکہ ان کے شعری دیوان موجود ہیں جبکہ آخری تین وہ ہیں کہ جنہیں دربار نبوت سے قرآن فہمی کی سند جاری ہو چکی ہے۔

مانا کہ ہمارے دوستوں کا شعر و شاعری کا ذوق اچھا ہے لیکن اس پر توجہ نہیں ہے کہ شعر و شاعری نے خیر کتنا پیدا کیا ہے اور شر کتنا؟ برصغیر پاک وہند میں تو شعر و شاعری نے لوگوں کو قرآن مجید سے دور ہی کیا ہے بلکہ آپ نقادوں کو پڑھ لیں تو صاف محسوس ہوتا ہے میر وغالب کا کلام معاذ اللہ! اللہ کے کلام پر بوجوہ فوقیت رکھتا ہے۔ ان میں سے وہ بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ مثنوی معنوی، فارسی زبان کا قرآن مجید ہے۔ اور ان میں سے وہ بھی ہیں، جو یہ کہتے ہیں کہ اقبال سمندر تھا لیکن قرآن مجید کے دریا میں غرق ہو گیا۔ انہیں میر وغالب کے کلام میں جو خوبیاں نظر آتی ہیں، اس کا دس فی صد بھی یہ قرآن مجید سے نہیں بیان کر سکتے لیکن دعوی یہی ہے کہ شاعری سے قرآن فہمی کا ذوق بڑھتا ہے۔

بھائی، تم نے اپنے شاعرانہ ذوق سے جو قرآن فہمی کا ذوق پیدا کر کے دکھا دیا ہے، وہ سامنے رکھ دو تو تمہارا مخاطب لا جواب ہو جائے گا۔ لیکن تمہارے بوجھے میں سوائے قرآن فہمی کے دعوے کے اور ہے ہی کیا؟ جن میں قرآن فہمی کا حقیقی ذوق پیدا ہوا تھا، انہوں نے شاعری کی معراج پر پہنچ کر اس کو ترک کر دیا تھا جیسا کہ لبید بن ربیعہ کا واقعہ آگے نقل ہو گا۔ انہوں نے اسلام لانے کے بعد پچپن سالہ زندگی میں صرف ایک شعر کہا اور اس کی وجہ یہ بیان کی کہ میرے رب نے مجھے شعر سے بہترین نعمت قرآن مجید کی صورت میں دے دی ہے۔

صدرِ اسلام میں شاعری

دو باتوں کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں؛ ایک یہ کہ صدرِ اسلام سے ہماری مراد خلفائے راشدین کا دور ہے اور دوسرا یہ کہ میرا شعر و شاعری کا زیادہ مطالعہ بلا واسطہ

نہیں بلکہ بالواسطہ ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ کسی زبان کے ادب اور لٹریچر کے نقادوں کا مطالعہ کروں اور یہی نقاد ہی کسی زبان کے ادب کے بارے میری معلومات کا بنیادی مصدر رہیں۔

دورِ جاہلیت کی شاعری اور صدرِ اسلام کی شاعری کا اگر ہم تقابلی مطالعہ کریں تو واضح طور محسوس ہوتا ہے کہ خلفائے راشدین کے دور کا شعر اس پائے کا نہیں ہے کہ جس پائے کا جاہلی شعر ہے بلکہ نقادوں کا کہنا تو یہ بھی ہے کہ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کا جاہلی شعر ان کے اسلامی شعر سے بہتر ہے کہ اس کے مضامین میں وسعت اور گہرائی بہت ہے۔ ابن سلام، ابن خلدون اور احمد الزیات رحمہم اللہ کی رائے یہ ہے کہ صدر اسلام میں شعری فن کمزور پڑ گیا تھا البتہ اس کے کمزور پڑنے کے اسباب کے بیان میں ان کا باہمی اختلاف ہے۔

ہمارے نزدیک اس کا ایک سبب یہ تھا کہ اسلام نے شعر جاہلی کے بنیادی مضامین کو حرام قرار دے کر اس پر شعر کہنے کے رستے بند کر دیے تھے جیسا کہ تشبیب، ہجو اور مبالغہ وغیرہ ہیں۔ اور دوسری بڑی وجہ قرآن مجید کی فصاحت اور بلاغت تھی کہ جس سے مرعوب ہو کر یا اس سے متاثر ہو کر بڑے بڑے شعراء نے شعر کہنے چھوڑ دیے۔ واضح رہے کہ اخطل، فرزدق اور جریر وغیرہ بنوامیہ کے دور کی بیماریاں ہیں۔

اسلام نے اگر شاعری کی سرپرستی کی ہوتی تو خلفائے راشدین کے دور میں شاعری اور شعراء کی حالت دور جاہلیت سے لازماً بہتر ہوتی بلکہ یہاں تو صورت حال یہ ہے کہ صحیح مسلم کی روایت کے مطابق بہترین دور یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں وہ حضرت حسان رضی اللہ عنہ کو مسجد نبوی میں شعر پڑھتے دیکھ کر ڈانٹتے ہیں تو وہ یہ کہہ کر جان چھڑاتے ہیں کہ میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی پڑھ لیتا تھا۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر کس کو ذوق نبوت حاصل ہو گا؟ کہ جن کے بارے سنن الترمذی کی روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر رضی اللہ عنہ ہوتے لیکن شعر سے ان کی مناسبت دیکھیں کہ کتنی ہے!

لبید بن ربیعہ رضی اللہ عنہ کہ جو اصحاب معلقات میں سے ہیں، عربی زبان کے چوٹی کے شاعر، اسلام لانے کے بعد 55 سال زندہ رہے لیکن اس دوران صرف ایک شعر کہا۔ امیر کوفہ نے لبید رضی اللہ عنہ سے شعر کہنے کی خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے سورۃ البقرۃ کی تلاوت شروع کر دی اور جب ختم کر لی تو کہا کہ میرے پروردگار نے اسلام لانے پر مجھے میرے شعر کے بدلے میں یہ نعمت عطا کی ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے یہ سنا تو ان کا وظیفہ بڑھا دیا جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "الإصابة في تمييز الصحابة" میں اس کا تذکرہ فرمایا ہے۔ بھئی، میر وغالب کی شاعری کی وکالت کرنے والوں سے صاف بات کہتا ہوں کہ جن پر قرآن مجید کا اثر ہوا، ان کی یا تو زبانیں بند ہو گئیں یا پھر شعر کے مضامین بدل گئے، تشبیب اور ہجو کی جگہ زہد اور ورع نے لے لی۔

صدرِ اسلام میں شعر کے کمزور پڑنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ ذوق نبوت شعر کا نہیں بلکہ جوامع الکلم کا تھا کہ جس سے خطابت کے فن نے ترقی کی کہ اسلام کی دعوت اور پھیلاؤ میں زیادہ مفید خطابت تھی نہ کہ شعر۔ اور دوسرا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے مدح میں مبالغہ کرنے والے کے منہ میں مٹی ڈالنے کا حکم دیا کہ جس سے امراء کی مبالغہ آمیز مدح کی بنیاد پر شاعروں کے بڑے بڑے وظیفوں کے جاری ہونے کے رستے بند ہو گئے اور ان کا کاروبار ماند پڑ گیا۔ علاوہ ازیں اور بھی اسباب ہیں لیکن ان کے بیان کا یہاں موقع نہیں ہے۔

خلاصہ کلام یہی ہے کہ شاعری کہ جسے شعراء کے ہاں شاعری کہا جاتا ہے یعنی تشبیب، غزل، ہجو، مدح، وصف، فخر، مرثیہ، حماسہ وغیرہ کا اکثر ان لغویات کے قبیل سے ہے کہ جن سے اعراض کرنا مومنین صالحین اور عباد الرحمن کی صفات میں سے اہم صفت ہے۔ باقی اگر آپ شاعر ہیں یا میر وغالب جیسا شاعرانہ ذوق رکھتے ہیں تو میرا مقصود آپ کی تحقیر وتذلیل ہرگز نہیں اور میں آپ کو اپنے آپ سے دینی اور اخلاقی طور بہتر ہی سمجھتا ہوں کہ اگر آپ ایک لغو کا ارتکاب کر رہے ہیں تو میری زندگی میں اس سے زیادہ لغویات ہوں گی لیکن مجھے دین کا ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے ہر چیز

کے بارے خیر اور شر کے پہلو کا ایک حکم لگانا ہے اور پھر اس کے مطابق زندگی گزارنے کی کوشش کرنی ہے۔

میر و غالب کی شاعری

رومی، حافظ اور سعدی کی شاعری میں وہ سب کچھ موجود ہے کہ جس پر حرام یا شرک کا اطلاق ہوتا ہے۔ توحید کے نام پر وجودی فکر تو شاعری کے رستے پھیلا ہی فارسی شعراء سے ہے۔ باقی مدارس میں تو امرء القیس بھی پڑھایا جاتا ہے، مدارس میں پڑھائے جانے سے وہ پاک کلام نہیں بن جاتا۔ وہ فحش کلام ہے اور فحش ہی رہے گا کہ جس کے قریب بھی جانے سے اللہ عزوجل نے منع فرمایا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ﴾ [الأنعام: 151]۔ ترجمہ: اور بے حیائی کے کاموں کے قریب بھی مت جاؤ۔

یہ سب قرآن کا ذوق نہ ہونے کی نحوست ہے کہ جن کی آنکھیں پورا قرآن مجید پڑھ لینے سے نم نہیں ہوتی، انہیں رومی کے ہر دوسرے شعر پر حال طاری ہو جاتا ہے۔ اور ان میں وہ قصہ گو بھی ہیں کہ جنہوں نے مثنوی کو فارسی قرآن کا درجہ دیا کہ مثنوی معنوی را قرآن در زبان فارسی۔ انہوں نے اللہ کی کتاب سے منہ موڑا تو اللہ عزوجل نے اپنی کتاب کے احوال ان پر بند کر دیے۔ اب شاعری سے وجد میں آنے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ سارا وجد ذہنی ہوتا ہے کہ جسے خواہ مخواہ تکلف سے حال بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ شاعری سے طاری ہونے والے احوال پر کسی وقت علم نفسیات کی روشنی میں لکھوں گا کہ یہ وجد اور حال صوفی پر اس وقت کیوں طاری نہیں ہوتا جبکہ اسے اونچی دیوار پر بٹھا دیا جائے۔

سید صاحب! دل تو یہ تھا کہ دس پوسٹیں پوری کر دیتا کہ جن میں میر و غالب کی شاعری کے مزعومہ محاسن پر بھی گفتگو ہو جاتی لیکن آپ جیسے دوستوں کی دل آزاری سے بچنے کے لیے ابھی بہت سی پوسٹیں نہیں کیں۔ بھئی، آجکل تو شاعری کے بارے ہر پہلو سے ایسے ایسے مضامین کا نزول ہو رہا ہے کہ کبھی سوچتا ہوں کہ انہیں مرتب کر کے

شاعری کے بارے مستقبل کے مذہبی نقادوں کے دبستان کا امام بن جاؤں۔ جہاں نوے فی صد نے صرف غالب کا نام ہی سنا ہو اور یہ نہ معلوم ہو کہ وہ اپنے عقائد میں کٹر اثنا عشری شیعہ ہے اور اپنے شعر اور نثر میں اس پر فخر کرتا ہے بلکہ شاعری میں تو نصیری شیعہ ہے کہ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خدا مانتے ہیں۔ اور میر بھی شیعہ تھے، کلیات میر میں حمدیہ اشعار، نعتیہ اشعار اور منقبت علی میں کہے گئے اشعار کی تعداد کا ہی تقابل کر لیں۔ اور منقبت علی میں جو اشعار کہے گئے ہیں، ان میں اور کسی شیعہ ذاکر پڑھی گئی مجلس میں کوئی فرق نظر نہ آئے گا۔ اور وجودی فکر کے بیان میں تو یہ دونوں ایک دوسرے سے چار ہاتھ آگے ہیں۔ غالب نے تو جس طرح جنت اور جہنم کا مذاق اڑادیا ہے تو وہی اس کے منحوس ہونے کے لیے کافی ہے۔ اور صرف شیعہ ہونے کا طعن نہیں بھائی، کبھی اس پر غور کریں کہ بڑے شاعر ہمیشہ شیعہ ہی کیوں ہوتے ہیں کہ شاعری مبالغے کے بغیر ممکن نہیں ہے اور مبالغہ اس طرح کا سنیوں میں ممکن نہیں ہے۔ اور تخیل سے مبالغہ اور جذبات سے مبالغہ پیدا کرنے میں بھی فرق ہے۔ اب مزید نہیں لکھنا چاہتا کہ ایک اور تحریر تیار ہو جائے گی۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب "شرح دیوان غالب" میں لکھتے ہیں کہ غالب نے بھی کہا تھا کہ جو زندگی میں ایک دن نماز پڑھی ہو تو کافر اور جو ایک دن شراب چھوڑی تو گناہ گار، اور پھر سمجھ نہیں آتا کہ انگریزوں نے مجھے مسلمان کیوں سمجھا۔ انہی شاعروں کی تو قرآن مجید مذمت کر رہا ہے کہ ﴿وَأَنَّهُمْ يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ﴾ [الشعراء: 226]۔ ترجمہ: یہ شاعر جو کہتے ہیں، وہ کرتے نہیں ہیں۔ لیکن نقادوں نے ان کے شاعری کے محاسن بیان کر کر کے ان کی عظمت ایسی دلوں میں بٹھا دی ہے کہ جیسے مشرکین کے دلوں میں بتوں کی عظمت کہ قرآن مجید کی تاویلیں شروع کر دیں گے لیکن شاعر پر حرف نہ آنے دیں گے، بھلے وہ خدا کو گالیاں دے۔ تو سمجھائیں گے خدا کو، نہ کہ شاعر کو۔

ایمان کی، علی کی ولا پر اساس ہے۔ یوم التناد میں بھی علی ہی کی آس ہے

بے گاہ و گاہ ناد علی اپنے پاس ہے۔ قبلہ علی، امام علی، مقتدا علی۔
مقصود خلق و مطلب ارض و سماء علی۔ یعنی کرم شعار ہے، مشکل کشا علی۔

یہ کسی مجلسی ذاکر کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ شاعر مشرق میر تقی میر کے الفاظ ہیں۔ پچھلے دنوں دیوان میر دیکھ رہا تھا تو ان اشعار پر نظر پڑی تو نقل کر دیے۔ شاعری کے مطالعے کا اتنا ذوق اگرچہ نہیں ہے لیکن "ریختہ" (www.rekhta.org) نے اسے اتنا آسان بنا دیا ہے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی انسان مطالعہ کر لیتا ہے۔

شاعری کیا ہے؟

شاعری کے بارے اپنے کچھ خیالات کا اظہار کیا ہے، اب سوچ رہا ہوں کہ ایک آخری تحریر کے ساتھ بات کو سمیٹ لیا جائے اور بحث کو ختم کر دیا جائے۔ اس ساری بحث میں کہ قرآن فہمی اور عالم دین بننے کے لیے شاعرانہ ذوق ہونا ضروری ہے، میں بنیادی نکتہ یہ ہے کہ شاعری اور شاعرانہ ذوق ہے کیا؟ شاعری کی کسی فنی تعریف میں پڑے بغیر آسان الفاظ میں اس کا جوہر بیان کر دیتا ہوں کہ ہر زبان میں شاعری اس زبان کے معروف شعراء کے کلام کو کہتے ہیں۔ اردو شاعری کا کوئی تصور میر و غالب اور عربی شاعری کا کوئی تصور اصحاب معلقات کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

اگر تو شاعری سے آپ کی مراد یہ ہے کہ بات کہنے کا ایک خاص اسلوب کہ آپ اپنی بات کو ایک خاص ردیف، قافیے، ردھم اور غناء میں، متعین بحروں میں، بیان کر دیں تو اس شاعری کی اباحت میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ یہ بات کرنے کا ایک انداز اور اسٹائل ہے جیسا کہ نثر بات کرنے کا ایک انداز اور اسٹائل ہے لیکن شاعری اپنے عرفی معنوں میں اس کو نہیں کہتے بلکہ شاعری معروف شعراء کے کلام کو کہتے ہیں۔ اسی لیے قرآن مجید نے شعر سے زیادہ شعراء کی نفی کی ہے۔ اور یہی وہ شاعری ہے کہ جس کے بارے ہمارا کہنا ہے کہ اس میں اصل ممانعت ہے یعنی ہر زبان کے معروف شاعروں کی شاعری کہ جس کا ایک بڑا موضوع بیوی کی بجائے محبوبہ سے رومانس کا اظہار ہے۔

صحابہ اور ائمہ دین کی شاعری کے بارے ہم بیان کر چکے کہ وہ زہد و ورع کی شاعری

ہے، توحید ورسالت کی شاعری ہے، جسے معروف نقاد تو شاعری میں شمار ہی نہیں کرتے۔ ہمارے نزدیک یہ شاعری جائز ہے۔ اور تو اور ہمارا ہر علم دین، شاعری میں مدون ہے۔ علم قراءات کو امام شاطبی رحمہ اللہ نے "شاطبية" میں اور علم نحو کو امام ابن مالک رحمہ اللہ نے "ألفية" میں مدون کر دیا ہے لیکن کیا نقاد اس کو شاعری کہتے ہیں؟ بھئی، اگر قرآن فہمی میں آپ اس شاعری کی بات کر رہے ہیں کہ اس کو سیکھنا ضروری ہے، تو ہمیں آپ سے اتفاق ہے کہ یہ تو علوم دینیہ ہی ہیں نہ کہ معروف معنی میں شاعری۔

ہمارے دوست شاعرانہ ذوق کے حق میں ائمہ دین سے استدلال کرتے ہیں کہ وہ شاعر تھے، ان کے دیوان موجود ہیں مثلاً امام شافعی۔ اب امام شافعی رحمہ اللہ کیسے اشعار کہتے تھے، امام ابن العز الحنفی رحمہ اللہ شرح عقیدہ طحاویہ میں لکھتے ہیں:

كل العلوم سوى القرآن مشغلة-۔إلا الحديث وعلم الفقه في الدين
العلم ما كان فيه قال حدثنا-۔ وما سوى ذاك وسواس الشياطين

قرآن مجید کے علاوہ تمام علوم لغو ہیں، سوائے حدیث اور فقہ کے علم کے۔ علم تو وہی ہے کہ جس میں حدثنا موجود ہو۔ اور جو حدثنا کے بغیر ہے، وہ شیاطین کے وساوس ہیں۔

اب نقادوں سے رائے لے لیں کہ یہ شاعری ہے؟ کہ جس میں قرآن، حدیث اور فقہ کے علاوہ سب علوم کو شیطانی وساوس قرار دیا گیا ہے۔ چلیں، ایک سوال سے بحث کو نکھار لیتے ہیں۔ جسے آپ شاعرانہ ذوق کہتے ہیں، وہ آپ کے نزدیک میر وغالب میں بدرجہ اتم موجود ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو ہمارا اختلاف لفظی ہے۔ اور اگر ہاں، تو میر وغالب کی شاعری قرآن فہمی میں مطلوب ہے یا نہیں؟ چلیں، یوں بھی پوچھ لیتے ہیں کہ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں غالب میاں مدینہ منورہ میں ہوتے اور وہی شاعری فرماتے کہ جو فرما گئے ہیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ انہیں مدینہ سے نکال باہر کرتے یا ان کا وظیفہ جاری فرماتے؟

چلیں، یوں بھی سوال کرتے ہیں کہ معلقات کی شاعری، عربی شاعری کی معراج ہے اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے، صحابہ نے اس شاعری کو رواج دیا یا ختم کیا؟

چلیں، یوں بھی سوال کر لیتے ہیں کہ امرء القیس جب اپنے معلقہ میں اپنی محبوبہ کو کنویں پر نہاتے دیکھتا ہے، اس کے کپڑے چھپا لیتا ہے، اور اس شرط پر واپس کرتا ہے کہ اس کی محبوبہ اس کے سامنے بے لباس ہو کر آئے، اور اس سارے واقعے کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ وہ عربی شاعری کی معراج بن جاتی ہے اور تمام اصحاب معلقات میں امرء القیس کا مقام سب سے بڑھ جاتا ہے، اب کیا ایسے معلقات کا مطالعہ قرآن فہمی کے لیے ضروری ہے؟ یا تو آپ یہ کہیں کہ امرء القیس شاعرانہ ذوق نہیں رکھتا تھا یا پھر یہ کہیں کہ امرء القیس کا ذوق، قرآن فہمی کی بنیاد بنے گا اور عالم بننے کے لیے ضروری ہے؟

بلکہ علامہ اقبال جیسے شعراء کہ جنہوں نے اپنی شاعری کو قرآنی مضامین کے لیے مخصوص کرنا چاہا تو نقادوں نے ان کا رتبہ گرا دیا اور یہاں تک کہہ دیا کہ اقبال سمندر تھا لیکن قرآن کے دریا میں غرق ہو گیا۔ معاذ اللہ! اقبال سمندر اور قرآن دریا! اب یہ شاعرانہ ذوق قرآن فہمی کی بنیاد بنے گا جو قرآن کی توہین میں مصروف ہے! شاعری ایک فن ہے، بطور ایک فن کے وہ مذہب اور خیر اور شر کے تصورات کی پابند نہ تو رہی ہے اور نہ ہی رہے گی تو یہ قرآن فہمی میں لازمی امر کی حیثیت کیسے رکھ سکتی ہے!

کیا موسیقی روح کی غذا ہے؟

دوست نے پوچھا ہے کہ کیا موسیقی روح کی غذا ہے؟ میں نے کہا، ہاں! بد روحوں کی غذا ہے، جیسی روحیں ہوں گی، ویسی ہی ان کی غذا بھی ہو گی۔ اس نے کہا نہیں، ایسے نہ کریں، آپ کو معلوم نہیں کہ اچھی موسیقی سن کر انسان کے قدم رک جاتے ہیں، دل مچلنے لگتا ہے، پاؤں اور جسم تھرکنے کی لاشعوری کوشش کرنے لگتا ہے۔

میں نے کہا جو باتیں تم کہہ رہے ہو، مجھے اس سے انکار نہیں لیکن میں چیزوں کو گہرائی میں سمجھنے کا عادی ہوں۔ کبھی تم نے اس پر غور کیا کہ موسیقی سن کر جسم کا تھرکنے کو دل کیوں کرتا ہے؟ یا موسیقی سنتے ہوئے انسان اطمینان کی کیفیت میں کیوں چلا جاتا ہے؟ اس نے کہا کہ نہیں۔

ویسے میوزک کی کوئی چھتیس تو قسمیں ہیں اور ہر ایک کے اپنے اثرات ہیں۔ ہم ان

میں سے دو معروف قسموں کا تذکرہ کرتے ہیں پوپ میوزک اور غزل۔ پوپ میوزک کیا کرتا ہے؟ وہ میوزک سننے والے کے دل میں حرکت پیدا کرتا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اگر دل میں حرکت نہ ہو تو وہ مردہ ہو جاتا ہے، میڈیکلی نہیں بلکہ نفسیاتی طور پر۔

دل کی زندگی اس کی حرکت ہی ہے اور دل کی موت اس کا سکوت ہے کہ سکوت کا نتیجہ اداسی ہے۔ پوپ میوزک سن کر ساکت دل میں حرکت پیدا ہوتی ہے تو اسے اچھا لگتا ہے اور اس کا دل تھرکنے کو کرتا ہے۔ میں نے کہا کہ اگر دل پہلے سے ہی حرکت میں ہو تو پوپ میوزک سننے کا اثر الٹا ہو گا یعنی سنتے ہی انسان بھڑک اٹھے گا اور یہ میرے ساتھ تو کئی دفعہ ہوا ہے۔

دوست نے کہا کہ میوزک کے علاوہ کیا چیز ہے کہ جس سے دل حرکت میں آجاتا ہے۔ میں نے کہا کہ اللہ کا مسلسل ذکر کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ ذکر کرنے والے دل کی مثال زندہ کی سی ہے اور ذکر نہ کرنے والے دل کی مثال مردہ کی سی ہے۔ میوزک تو مردہ دلوں میں حرکت پیدا کر رہا ہے، بس۔ اور یہ حرکت بھی عارضی ہوتی ہے اور بے مقصد بھی کہ اس حرکت نے کھپنا کہاں ہے؟ شراب میں، زنا میں، فساد میں؟ جبکہ ذکر کی حرکت اپنے پیچھے اچھے اثرات چھوڑ کر جاتی ہے جو کچھ دیر تک باقی رہتے ہیں۔ اور بامقصد بھی ہوتی ہے کہ یہ حرکت خیر پیدا کرنے میں صرف ہوتی ہے۔ پس دونوں کی حرکت کے رخ میں فرق ہے۔

میں نے کہا کہ غزل کو دیکھ لو کہ اس کے سننے سے لوگوں کا غم اور بوجھ ہلکا ہوتا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ لوگوں کا خیال ہے کہ ایسا ہوتا ہے لیکن یہ بات ایک پہلو سے درست ہے اور ایک پہلو سے غلط ہے۔ غزل وغیرہ صرف وقتی طور غم اور دل کے بوجھ کو ہلکا کرتے ہیں، مستقل طور نہیں جیسا کہ شراب وقتی طور آپ کو غم سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ بھئی، غزل کی لذت کھجلی کی سی لذت ہے کہ جسم میں پھوڑہ ہو تو کھجلی کرنے میں مزا آتا ہے لیکن یہ مزہ وقتی ہوتا ہے۔ اور مزہ لینے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ زخم اور بڑھ چکا ہے۔ اس نے کہا کہ تلاوت اور نعت کے علاوہ بھی کوئی متبادل ہے تو میں کہا کہ ہاں، زین

بھیکا(zain bhika) کو سن لیا کرو۔ البتہ اب تو اناشید (poems) میں بھی بہت میوزک شامل کر لیا گیا ہے مثلاً حارث کی معروف نظم "سلام علیکم" ہی سن لیں۔ وقتی طور تو دل میں بہت حرکت محسوس ہو گی لیکن دل اگر ذکر کا عادی ہے تو سننے کے کچھ دیر بعد احساس پیدا ہو گا کہ جیسے دل پر کوئی حجاب آ گیا ہو۔

قاری حنیف ڈار صاحب اور موسیقی

قاری حنیف ڈار صاحب آج کل حدیثوں سے یہ ثابت کرنے میں لگے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ موسیقی سماعت فرمایا کرتے تھے۔ معلوم نہیں ایسی روایتیں بیان کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی ذات کے حوالے سے ان کی وہ غیرت کہاں چلی جاتی ہیں کہ جس کا حوالہ یہ مذہبی طبقات کو دیتے نہیں تھکتے۔ مذہبی طبقات کو قاری صاحب طعن کرتے ہیں کہ انہیں شرم نہیں آتی کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف ایسی حدیثوں کی نسبت کو صحیح مان لیتے ہیں؟ اور ان کا اپنا حال دیکھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ ان متجددین کے سامنے کوئی ایسی حدیث بیان کر دیں کہ جس سے ماڈرنٹی کی تائید ہوتی ہو تو آنکھیں بند کر کے اس پر ایمان لے آئیں گے۔ قاری حنیف ڈار صاحب لکھتے ہیں:

"دلیل 4: منظر پر غور فرمائیے، محبوب ﷺ بستر پر محو استراحت ہیں، منہ پر چادر ڈالی ہوئی ہے تو یارِ غار نے آپ ﷺ کو سوتا ہوا سمجھ کر یقیناً آرام کے خیال سے منع کر دیا نہ کہ حرام سمجھ کر، لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا کہ رہنے دو ان کو گانے دو۔ گویا رسول اللہ ﷺ منہ پر چادر ڈالے ان کو گاتے ہوئے سن بھی رہے تھے - اب آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نہ صرف حرام گانے کو سماعت فرما رہے تھے بلکہ آپ نے ایک حرام کام کی اجازت بھی دے دی، اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو نہی عن المنکر سے روک بھی دیا؟ آپ تو یہ سوچ سکتے ہیں مگر میں ہر گز ایسا نہیں سوچ سکتا کہ خاتم الانبیاء والمرسلین اپنے سامنے کسی حرام کام کی اجازت دیں گے،، سبحانک ھذا بھتان عظیم۔"

اس روایت کے جمیع طرق کو سامنے رکھیں تو یہ تصویر سامنے آتی ہے:

① یہ انصار کی دو بچیاں تھیں اور پروفیشل مغنیہ یعنی گانے بجانے والی نہیں تھیں۔

② رسول اللہ ﷺ نے انہیں عید کے دن کی وجہ سے گانے کی اجازت دی۔

③ کل آلات موسیقی جو ان کے پاس تھے، وہ دف تھا۔

④ جو وہ گا رہی تھیں، وہ یوم بعاث کے بارے شاعری تھی۔ یوم بعاث، اوس اور خزرج کے درمیان ہجرت مدینہ سے پہلے ہونے والی آخری جنگ تھی۔

اب اگر کوئی دو چھوٹی بچیاں، دف ہاتھ میں لے کر، 65ء کی جنگ میں پاکستانی سپاہیوں کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے کوئی ملی نغمہ پڑھ لیں، تو کیا یہ وہ موسیقی ہے جس کا جواز قاری صاحب ثابت کرنا چاہ رہے ہیں؟ اور کیا اسے عرف عام میں موسیقی کہتے ہیں؟ تو اس موسیقی کو حرام کہا کس نے ہے کہ جس کے جواز کے لیے قاری صاحب اتنا زور لگا رہے ہیں؟

خیر ہماری نقد کی وجہ سے آج کل ان کا کاروبار کافی مندے میں جا رہا ہے، لوگ انہیں تیزی سے چھوڑ رہے ہیں۔[1] ان کی منطق، لاجک اور دلیل پاؤں تلے رُل رہی ہے لیکن پھر بھی یہ پوسٹ اسی لیے سہی کہ "گرتی ہوئی دیوار کو ایک دھکا اور دو۔"

احادیث اور موسیقی

کچھ لوگ احادیث سے موسیقی کا جواز اخذ کر رہے ہیں۔ ایسے لوگوں سے گزارش ہے کہ اس موضوع پر تحقیق بہت آگے جا چکی ہے، اور آپ ابھی محض احادیث کا ترجمہ بیان کرنے پر ہی پہنچ پائے ہیں۔

اگر کسی کو کسی موضوع پر تحقیق کا شوق ہے تو اس کا صحیح طریقہ کار یہی ہوتا ہے کہ اس موضوع پر جو تحقیق پہلے سے موجود ہے، اس کو سامنے رکھے اور پھر اس کی بنیاد پر کوئی بات کرے۔ چاہے تو اس کی تائید کرے، چاہے اس کا رد کرے۔ اگر کسی شخص کو اس موضوع پر موجود تحقیقات کا علم ہی نہ ہو، اس نے اس موضوع پر کیا بات کرنی ہے؟ یا اگر

[1] اس نقد کے تفصیلی مطالعہ کے لیے اس کتاب کے آخری باب کی طرف رجوع فرمائیں۔

کر بھی لی تو محققین نے اسے کیا اہمیت دینی ہے؟

احادیث اور موسیقی کے موضوع پر روایتی فکر میں مولانا ارشاد الحق اثری صاحب نے اپنی دو کتابوں میں جو تحقیق پیش کر دی ہے، وہ اب تک اس موضوع پر پیش کی جانے والی تحقیقات میں حرف آخر ہے۔ اگر کسی کو غنا کی احادیث کا معنی و مفہوم سمجھ نہ آرہا ہو تو اثری صاحب کی درج ذیل دو کتابوں کا مطالعہ کریں۔ پھر اگر کوئی اختلاف ہے تو وہاں سے بات آگے بڑھائیں، جہاں انھوں نے چھوڑی ہے۔ یقین مانیں، اس ایکٹوٹی کے بغیر کوئی اہل علم کہ جسے اس موضوع پر تحقیق سے دلچسپی ہو گی، آپ کی پوسٹوں کو پڑھنا تو در کنار، دیکھنا بھی پسند نہیں کرے گا۔ کتابوں کے نام درج ذیل ہیں:

① اسلام اور موسیقی- شبہات و مغالطات کا ازالہ

② اسلام اور موسیقی پر "اشراق" کے اعتراضات کا جائزہ

موسیقی صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کی نظر میں

امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"قال الله تعالى في سورة لقمان: ﴿ومن الناس من يشتري لهو الحديث ليضل عن سبيل الله﴾، قال حبر الأمة ابن عباس رضي الله عنهما: هو الغناء، وقال مجاهد رحمه الله: اللهو الطبل."

"اللہ سبحانہ و تعالی نے سورۃ لقمان میں فرمایا ہے: اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو لغو باتیں خریدتے ہیں، تاکہ بغیر کسی علم کے اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکیں، اور اسے مذاق بنائیں، انہیں لوگوں کے لیے ذلت ناک عذاب ہے۔ حبر الامۃ ابن عباس رضی اللہ عنہ اس کی تفسیر میں کہتے ہیں، یہ گانا بجانا ہے۔ اور مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں: لہو سے مراد ڈھول اور ناچ گانا ہے۔"

امام ابن کثیر رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"وقال الحسن البصري رحمه الله: نزلت هذه الآية في الغناء والمزامير. قال أبو الصهباء: سألت ابن مسعود عن قوله تعالى: ﴿ومن الناس من يشتري لهو الحديث﴾، فقال : والله الذي لا إله

غيره هو الغناء - يرددها ثلاث مرات، وصح عن ابن عمر رضي الله عنهما أيضا أنه الغناء."

"حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ آیت مبارکہ گانے بجانے کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ابو الصہباء کہتے ہیں کہ میں نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے اللہ تعالی کے فرمان: ﴿ومن الناس من يشتری لهو الحديث﴾ کے متعلق سوال کیا کہ اس سے مراد کیا ہے تو ان کا جواب تھا: اس اللہ تعالی کی قسم جس کے علاوہ کوئی اور معبود برحق نہیں اس سے مراد گانا بجانا ہے۔ انہوں نے یہ بات تین بار دہرائی۔ اور ابن عمر رضی اللہ عنہ سے صحیح روایت سے ثابت ہے کہ اس سے مراد گانا بجانا ہی ہے۔"

امام ابو داؤد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

عن نافع رحمه الله قال: "سمع ابن عمر مزمارا، قال: فوضع إصبعيه على أذنيه، ونأى عن الطريق، وقال لي: يا نافع هل تسمع شيئا ؟ قال: فقلت: لا قال: فرفع إصبعيه من أذنيه، وقال: كنت مع النبي صلى الله عليه وسلم فسمع مثل هذا، فصنع مثل هذا."

"اور نافع رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے بانسری بجنے کی آواز سنی تو انہوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں رکھ لیں اور راستے سے ہٹ کر مجھے کہنے لگے نافع کیا تم کچھ سن رہے ہو؟ تو میں نے عرض کیا: نہیں، تو انہوں نے اپنے کانوں سے انگلیاں نکال لیں، اور کہنے لگے، میں ایک بار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا تو انہوں نے ایسی آواز سنی تو اسی طرح کیا۔"

موسیقی: مذاہب اربعہ اور مسالک ثلاثہ کا موقف

فقہ حنفی اور موسیقی:

علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ "الدر المختار" میں فرماتے ہیں:

"وَالْمَذْهَبُ حُرْمَتُهُ مُطْلَقًا... وَلَا تُقْبَلُ شَهَادَةُ مَنْ يَسْمَعُ الْغِنَاءَ أَوْ يَجْلِسُ مَجْلِسَ الْغِنَاءِ."

"مذہب حنفی میں گانا بجانا مطلقاً حرام ہے...اور اس شخص کی گواہی قابل قبول نہیں ہے جو گانا بجانا سنتا ہے یا گانے بجانے کی مجلس میں بیٹھتا ہے۔"

فقہ مالکی اور موسیقی:

امام خلال رحمہ اللہ "الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر" میں فرماتے ہیں:

"عن إسحاق بن عيسى الطباع قال: سألت مالك بن أنس عما يترخص فيه أهل المدينة من الغناء؟ فقال: إنما يفعله عندنا الفساق."

"امام مالک رحمہ اللہ سے یہ سوال ہوا کہ اہل مدینہ گانے بجانے کو جائز سمجھتے ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ ہمارے ہاں کے فاسقوں کا مشغلہ ہے۔"

فقہ شافعی اور موسیقی:

امام شافعی رحمہ اللہ "الأم" میں فرماتے ہیں:

"إن الغناء لهو مكروه يشبه الباطل، ومن استكثر منه فهو سفيه ترد شهادته."

"امام شافعی رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ گانا بجانا لہو ولعب میں سے ہے، مکروہ ہے بلکہ باطل سے مشابہت رکھتا ہے۔ جو اس میں بہت زیادہ مشغول ہو، تو وہ احمق ہے اور اس کی گواہی قابل قبول نہیں ہے۔"

فقہ حنبلی اور موسیقی:

امام خلال رحمہ اللہ "الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر" میں فرماتے ہیں:

"عن عبد الله بن أحمد بن حنبل قال: سألت أبي عن الغناء فقال: الغناء ينبت النفاق في القلب لا يعجبني."

"عبد اللہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے گانے بجانے کے بارے سوال کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ گانا بجانا دل میں نفاق پیدا کرتا ہے اور مجھے پسند نہیں ہے۔"

بریلویت اور موسیقی:

پروفیسر ڈاکٹر مسعود احمد "خوب وناخوب" میں اعلی حضرت احمد رضا خان بریلوی

رحمہ اللہ کا فرمان نقل کرتے ہیں:

"مزامیر جنھیں مٹانے کے لیے حضور اکرم ﷺ تشریف لائے کما فی الحدیث مطلقاً حرام ہے۔"

دیوبندیت اور موسیقی:

مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ اپنی کتاب "اسلام اور موسیقی" میں لکھتے ہیں:

"موسیقی قرآن اور حدیث کی روشنی میں ناجائز ہے اور فقہاء امت کے چاروں مکاتب فکر اس مسئلے پر متفق ہیں۔"

اہلحدیث اور موسیقی:

مولانا ارشاد الحق اثری رحمہ اللہ اپنی کتاب "اسلام اور موسیقی: شبہات و مغالطات کا ازالہ" میں لکھتے ہیں:

"موسیقی کے حرام اور ناجائز ہونے میں کوئی شبہہ نہیں ہے۔"

اسلامی میوزک

دوست کا سوال ہے کہ میوزک بہت سنتا ہوں اور سننے کو دل بھی بہت کرتا ہے لیکن ساتھ میں ڈر بھی لگتا ہے تو کیا اسلامک میوزک نام کی کوئی چیز موجود ہے؟ جواب: بھئی، اسلامک میوزک تو نہیں کہتا لیکن جائز موسیقی ضرور کہہ سکتا ہوں، اگر سننا چاہتے ہیں تو زین بھیکا (Zain Bhikha) کے اناشید (poems) سنیں۔

زین بھیکا بہت ہی باذوق اور نفیس الطبع سنگر ہے، شاعری کا انتخاب بھی عمدہ ہے اور آواز بھی خوبصورت ہے اور کمال یہ ہے کہ دل سے پڑھتا ہے۔ زین بھیکا نے اس میدان میں ایک بہت بڑے خلاء کو پُر کیا ہے، لیکن ہمارے مذہبی طبقات شاید اس بات کو نہیں سمجھ سکتے۔ زین بھیکا کے جو اناشید سننے کے لائق ہیں:

1- Allah Made Everything

2- The Moment He Smiled (Naat)

3- Mountains of Makkah

4- Eidun

5- First, We Need the Love

6- Better Day

نوٹ: زیادہ مذہبی لوگ انہیں سننے سے پرہیز کریں۔

اردو کے بہترین ناول

"علی پور کا ایلی": اگر میرے پاس اس کی ہارڈ کاپی ہوتی تو کسی پکوڑے سموسے بیچنے والے کو ہدیہ کر دیتا کہ اس کا صحیح استعمال یہی ہے کہ ضخیم بھی کافی ہے، شاید اردو ادب کا سب سے ضخیم ناول ہے۔

"آگ کا دریا": ایک دل تو کرتا ہے کہ ابوالکلام آزاد کو عالم برزخ میں تحفے میں بھجوا دوں کہ رات ہی عالم نیند میں برزخ سے ان کا اڑھائی صفحات کا ایک تعریفی خط موصول ہوا ہے کہ جس میں انہوں نے راقم کی ایک تحریر کی ستائش فرمائی ہے۔ اور ایک دل کرتا ہے کہ کسی اچھے سنسکرت جاننے والے کو ہدیہ کر دوں کہ اس کے پہلے دو سو صفحات کا اردو ترجمہ کر دے۔

"اداس نسلیں": بس ٹھیک ہے۔ اس لیے ضرور پڑھ لینا چاہیے کہ اسے اردو کے دس بہترین ناولوں میں شمار کیا گیا ہے۔ پڑھ کر وقت اچھا گزر گیا لیکن کوئی خاص اثر نہ ہوا۔

"راجہ گدھ": ایک اچھا ناول ہے۔ بہترین دماغوں اور سوچنے سمجھنے والے اذہان کے لیے اردو ادب میں ایک عمدہ تحفہ ہے۔ پڑھنے کے بعد تقریباً ایک ہفتہ تک اس کے اٹھائے گئے فلسفیانہ سوالات کے سحر میں شدت سے مبتلا رہا۔

"خدا کی بستی": عمدہ اور بہترین ناول ہے۔ ضرور پڑھنا چاہیے۔ پڑھ کر یہ اثر ہوا کہ ختم کرنے کے بعد دو رکعت نماز ادا کی اور سجدے میں خوب رویا۔

"قیصر و کسریٰ": اردو زبان کا شاہکار ناول۔ ہر ایک کو ضرور پڑھنا چاہیے۔ پڑھ کر یہ اثر ہوا کہ اب کے زندگی بامقصد معلوم ہونے لگی۔

جانگلوس از شوکت صدیقی: ایک تنقیدی مطالعہ

"جانگلوس" اردو کے ضخیم ترین ناولوں میں سے ہے کہ میرے پاس اس کا جو نسخہ ہے، وہ تین حصوں میں تقریباً دو ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ شوکت صدیقی اچھے لکھاری ہیں اور ان کے دونوں شاہکار ناولوں، خدا کی بستی اور جانگلوس، میں مجرمانہ معاشرے کی عکاسی کی گئی ہے۔ جانگلوس کی کہانی دراصل دو قیدیوں، لالی اور رحیم داد، کی کہانی ہے کہ جو جیل سے فرار ہوتے ہیں۔ اور پولیس سے چھپنے کے لیے در بدر کی ٹھوکریں کھاتے ہوئے مختلف جرائم پیشہ افراد سے ان کو سابقہ پڑتا ہے۔

شوکت صدیقی ایک تخلیق کار لکھاری ہے کہ کہانی کو اس انداز میں مرتب کیا ہے کہ قاری اس میں کھو جاتا ہے۔ ان کی کہانی میں ہر درجے کے ذہن کے لیے طمانیت کا سامان موجود ہے، ان کے لیے بھی کہ جو کہانی کو ایک کہانی کے طور پڑھتے ہیں اور ان کے لیے بھی جو کہانی کو ایک فلسفہ سمجھ کر پڑھتے ہیں۔ پہلے حصے میں کہانی کا پلاٹ بہت جاندار ہے کہ قاری کا دل کہانی چھوڑنے کو آمادہ نہیں ہوتا لیکن جیسے ہی لالی کے کردار سے کہانی کا رخ رحیم داد کے کردار کی طرف مڑتا ہے اور ناول کے دوسرے حصے کا آغاز ہوتا ہے تو قاری کو احساس ہوتا ہے کہ اب ناول کی ضخامت بڑھانے کی خواہ مخواہ کی کوشش جاری ہے لہذا دلچسپی کم ہو جاتی ہے۔

جہاں تک ناول کی زبان کا تعلق ہے تو شوکت صدیقی صاحب نے ناول میں دیہاتی لب ولہجے کو اسی زبان میں نقل کیا ہے جیسا کہ "قتل" کو "کتل" اور "موقع" کو "موکع" لکھا ہے۔ یہ ایک طرف کہانی کا حسن بھی ہے اور دوسری طرف خامی بھی ہے۔ حسن اس اعتبار سے کہ ناول نگار نے حقیقت کا اس حد تک بیان کرنے کا اہتمام کیا ہے کہ الفاظ کے حقیقی رسم کو بھی پیچھے چھوڑ دیا اور خامی اس پہلو سے کہ زبانیں اسی طرح بگڑتی ہیں۔ اگر کوئی دو چار الفاظ کا معاملہ ہوتا تو ہم یہ بات بیان نہ کرتے لیکن ناول کے ہر صفحہ پر آپ کو دس بارہ الفاظ ایسے مل جائیں گے کہ جو اپنے اصل رسم میں نہیں لکھے گئے ہیں بلکہ دیہاتی لب ولہجے کے اعتبار سے انہیں نیا رسم دیا گیا ہے۔ اور تنقید کا مطلب بھی یہی ہوتا ہے کہ

آپ کسی شاہ پارے کی خوبی اور خامی دونوں نقل کر دیں۔

جہاں تک ناول نگار کی سوچ کا تعلق ہے تو کسی ناول کے تنقیدی مطالعے میں اس کا جاننا بہت ضروری ہے اگرچہ اس میں مبالغے سے بچنا چاہیے۔ کچھ نقاد تو اس قدر مبالغہ کرتے ہیں کہ وہ ناول کے ہر دوسرے جملے میں مصنف کا ذہن پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ ضروری نہیں ہے کہ ناول نگار کا ہر جملہ اس کے ذہن ہی کی عکاسی کرتا ہو، بعض اوقات وہ معاشرے کے مسائل بھی بیان کر رہا ہوتا ہے۔ اور یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ ناول نگار اپنی تصنیف میں بس معاشرے کے حقائق ہی کو نقل کرتا ہے، اس کی اپنی سوچ اس میں نہیں ہوتی۔

ناول نگار نے ناول کے پہلے صفحہ پر کارل مارکس کا اقتباس نہ بھی دیا ہوتا تو بھی ناول سے یہ معلوم کرنا بہت آسان ہے کہ مصنف پر اشتراکیت کے فلسفے کا گہرا اثر موجود ہے اور ان کے ناول میں جو مقصدیت پائی جاتی ہے، وہ اشتراکی ہے نہ کہ مذہبی۔ اگرچہ ناول نگار کی سوچ کا مثبت پہلو یہ ہے کہ وہ اشتراکی فلسفہ سے متاثر ہونے کے باوجود معاشرے کو مذہب سے اس طرح بدظن کرنے کی کوشش نہیں کرتے جیسا کہ اشتراکیوں کی عادت ہے کہ اہل مذہب کی برائیاں بیان کر کر کے مذہب کو بدنام کیا جائے اور اسے ایک افیون ثابت کیا جائے۔

ناول میں کہیں کہیں مذہب کے نام پر معاشرے میں پائی جانے والی برائیوں کا ذکر موجود ہے لیکن میرے رائے میں وہ مناسب انداز میں موجود ہے کہ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کیا گیا ہے۔ جانگلوس میں اہل مذہب پر تنقید کا انداز یہ بتلاتا ہے کہ مصنف مذہب سے تعصب نہیں رکھتا ہے لیکن یہی مصنف جب خدا کی بستی میں اہل مذہب ہر نقد کرتا ہے تو اسلوب یہ بتلاتا ہے کہ وہ مذہب پر زیادہ تنقید اس لیے نہیں کرنا چاہتا کہ معاشرہ اسے قبول نہ کرے گا، اسے اس کی حکمت کہیں یا مصلحت، بہر حال یہ تو کہنا بنتا ہے کہ مناسب طرز عمل ہے۔

عام لوگ تو ناول کو کہانی کی طرح پڑھتے ہیں کہ بس تفریح ہے، وقت گزارنے کا

ایک بہانہ ہے لیکن ایک نقاد اس طرح سے کہانی کا مطالعہ نہیں کرتا بلکہ وہ تو یہ بھی دیکھتا ہے کہ اس ناول یا کہانی کے انسانی لاشعور پر کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ ناول نگار نے ناول میں جس طرح سے جرم کو پیش کیا ہے، اس میں صاف طور مبالغہ موجود ہے۔ چلیں، مبالغے کے بغیر تو کہانی بنتی ہی نہیں ہے، یہ ہمیں بھی معلوم ہے لیکن اتنا مبالغہ کہ ہر شخص ہی مجرم نظر آئے تو یہ مناسب نہیں ہے۔ معاشرے میں شر کے علاوہ خیر بھی ہر دور میں موجود رہا ہے کہ جس طرح دکھ کے ساتھ سکھ انسانی زندگی کا لازمی حصہ ہے۔ البتہ اس اعتراض کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ناول معاشرے کے ایک خاص طبقے کے احوال بیان کرتا ہے نہ کہ بحثیت مجموعی پورے معاشرے کی تصویر کشی ہے۔

اب تک جو باتیں ہم نے کی ہیں تو ان میں خوبی اور خامی دونوں پہلو موجود ہیں لیکن ناول نگار کی دو باتیں ایسی ہیں کہ جن میں خامی ہی کا پہلو غالب ہے۔ ایک یہ کہ ناول نگار جب بھی کسی جرم کو بیان کرتا ہے تو اس کے بیان کا جو اسلوب ہے، وہ معتدل نہیں ہے۔ جرم تو اپنی تفصیل میں بیان ہو گیا لیکن اس جرم کی برائی اور شناعت اتنی تفصیل سے نہ نقل ہو سکی۔ اس کا قاری پر اثر یہ ہو گا کہ جب قاری نے یہ پڑھا کہ معاشرے میں تو ہر طرف جرم ہی جرم ہے کہ ہر دوسرا شخص جرم میں مبتلا ہے تو اب اگر وہ خود کسی جرم میں مبتلا ہے تو بڑی آسانی سے اپنے آپ کو یہ کہہ کر مطمئن کر لے گا کہ یہاں ہر دوسرا شخص بھی تو مجرم ہی ہے ناں۔

اس کا حل یہی تھا کہ ناول نگار ہر جرم کے بیان کے ساتھ اس کی برائی اور برے اثرات کو اس قدر مبالغے سے بیان کرتے کہ قاری کو اس جرم سے طبعاً نفرت پیدا ہو جاتی تاکہ اگر وہ کسی جرم میں مبتلا بھی ہے یا ہونے جا رہا ہے تو کم از کم اپنے لیے یہ کہہ کر اطمینان کا سامان نہ پیدا کر لے کہ ہر دوسرا شخص بھی تو مجرم ہی ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ناول نگار جرم کے بیان میں جس قدر فصیح ہے، قاری کے دل میں جرم سے نفرت پیدا کرنے میں اس قدر کامیاب نہیں ہے۔ اور ہم یہ نہیں کہہ رہے کہ جرم سے نفرت پیدا کرنے کے لیے آپ ناول میں وعظ شروع کر دیں، آپ جب اسے جرم کہہ رہے ہیں تو وہ

لازماً عقل اور طبعیت کے بھی خلاف ہی ہو گا، تو اس سے عقل و منطق، انسانی جذبات واحساست کے تعلق کی نسبت سے نفرت پیدا کریں۔

اس ناول کی دوسری خامی جو کہ نسبتاً گہری ہے اور عام افراد کی سمجھ سے بہت بالا ہے، کو ایک مثال سے سمجھیں۔ ناول نگار نے اپنے ناول میں ایلیٹ (elite) کلاس کے ایک لائف اسٹائل کو بیان کیا ہے کہ جسے وہ سسپنس نائٹ کہتا ہے۔ سسپنس نائٹ یہ ہے کہ آٹھ بیوروکریٹس ہیں کہ جن میں ایک ڈپٹی کمشنر، ایک ایس ایس پی، ایک کامیاب بزنس مین، ایک سیکرٹری وغیرہ ہیں۔ وہ آٹھوں ہر مہینے ایک رات اپنی بیویوں سمیت ایک بنگلے میں جمع ہوتے ہیں اور ایک کھیل کھیلتے ہیں کہ جس کا ایک ایمپائر ہوتا ہے۔ اتفاق سے لالی جو کہ جیل سے مفرور ہے، اس کا واسطہ ڈپٹی کمشنر سے پڑتا ہے کہ جس کی گاڑی کا ٹائر پنکچر ہو چکا ہے اور اسے دھکا لگانے کے لیے کسی فرد کی ضرورت ہے۔ لالی یہ ضرورت پوری کرتا ہے اور ڈپٹی کمشنر اسے اپنے گھر میں رکھ لیتا ہے۔

جب سسپنس نائٹ آتی ہے تو اتفاق سے ایمپائر بیمار ہو جاتا ہے لہذا لالی کو ایمپائر بنا لیا جاتا ہے۔ ایک رات ایک بیوروکریٹ کے بنگلے میں آٹھوں بیوروکریٹس اپنی بیویوں سمیت جمع ہوتے ہیں جو کہ خوب بن سنور کر آئی ہوتی ہیں۔ ایک طرف صوفے پر آٹھ بیویاں بیٹھتی ہیں، دوسری طرف آٹھ مرد۔ اوپر والی منزل میں دس کمرے ہیں۔ قرعہ اندازی ہوتی ہے اور پہلے ہر بیوی کے نام سے ایک کمرے کا نمبر نکلتا ہے تو اس بیوی کو وہاں اسی کمرے میں لالی چھوڑ آتا ہے اور باہر سے دروازہ لاک کر دیتا ہے۔ اس طرح آٹھ بیویوں کے آٹھ کمروں میں چلے جانے کے بعد مردوں کی قرعہ اندازی ہوتی ہے اور ہر مرد کے نام سے ایک کمرے کا نمبر نکلتا ہے اور اسے اسی کمرے میں لالی چھوڑ آتا ہے۔ اگر اتفاق سے کسی مرد کے نام ایسے کمرے کا نمبر نکلے کہ جس میں اسی کی بیوی موجود ہو تو اس کی قرعہ اندازی دوبارہ کی جاتی ہے۔ اس طرح یہ آٹھوں بیوروکریٹس ایک دوسرے کی بیویوں کے ساتھ قرعہ اندازی کر کے رات گزارتے ہیں۔

مجھے اس پر اس وقت کوئی مذہبی نقد نہیں کرنی کہ اس کا مذہبی اسٹیٹس سب کو

معلوم ہے اور ویسے بھی ادیبوں کو وعظ سے نفرت ہوتی ہے کہ ان کے نزدیک واعظ کا ذہن سطحی ہوتا ہے۔ یہاں دراصل لالی کا ڈپٹی کمشنر اور اس کی بیگم سے ایک مکالمہ ہوتا ہے جبکہ وہ ان دونوں کو ان کے کمرے میں چھوڑنے جارہا ہوتا ہے، وہ مکالمہ بہت اہم ہے۔ لالی، ڈپٹی کمشنر سے پوچھتا ہے کہ اس کا دل کیسے اس پر راضی ہو جاتا ہے کہ اس کی بیوی دوسرے کے ساتھ رات گزارے جبکہ یہ تو سیدھی سادھی بے غیرتی ہے۔ ڈپٹی کمشنر اپنے اس فعل کو لاجیسائز کرتا ہے یعنی اس کو لاجیکل بنا کر پیش کرتا ہے۔ مثلاً ڈپٹی کمشنر کا کہنا یہ ہے کہ انسانی طبیعت کی یہ فطرت ہے کہ وہ ایک ہی چیز سے اکتا جاتی ہے لہذا ہم دراصل اپنی اکتاہٹ کا علاج کرتے ہیں اور یہ اکتاہٹ میاں اور بیوی دونوں کو ایک دوسرے سے ہو جاتی ہے۔ بہر حال دوسری شادی اور ہیرا منڈی کے چکر لگانے کے جو جھنجھٹ ہیں، وہ اس میں نہیں ہیں۔

چلیں، آپ کسی درجے میں کہہ سکتے ہیں کہ یہ تو ایک سطحی لاجک ہوئی لیکن اس لاجک پر ایک اور لاجک بیوی کی طرف سے یہ دی گئی کہ اس طرح کرنے سے بیویوں کو یہ فائدہ ہوا کہ اب وہ بننا سنورنا شروع ہو گئی ہیں یعنی پہلے وہ شوہروں سے اکتاہٹ کے نتیجے میں موٹی اور بھدی ہو گئی تھیں لیکن جب سے سپنس نائٹ کا دور شروع ہوا ہے تو انہوں نے دوسرے مردوں کی خواہش میں تیار ہونا شروع کر دیا ہے اور اب جسمانی طور پرفٹ ہیں کہ جس کا فائدہ ظاہری بات ہے کہ ان کے شوہروں کو بھی ہوتا ہے۔

چلیں، یہ بھی ایک اور سطحی لاجک کہہ لیں، لیکن خطرناک ترین بات وہ تھی جو ڈپٹی کمشنر نے یہ کہہ کر لالی سے کہی کہ اس طرح کی نائٹ گزارنے سے میاں بیوی کی محبت بڑھ جاتی ہے۔ وہ اس طرح کہ جب اس کی بیوی دوسرے کے شوہر کے ساتھ رات گزارتی ہے اور اگر وہ شوہر اس سے زیادہ ہینڈسم اور مضبوط ہو تو وہ اس کی طرف ایٹریکٹ ہوتی ہے اور شوہر اس ایٹریکشن سے خار کھاتا ہے لہذا بیوی کی طرف زیادہ توجہ کرتا ہے اور دوسرے مرد کو اپنا رقیب سمجھتا ہے، اس طرح وہ اپنی بیوی کا زیادہ خیال رکھنا شروع ہو جاتا ہے اور ان کی ازدواجی زندگی بہتر ہو جاتی ہے۔

جس طرح سے شوکت صدیقی صاحب نے اس سسپنس نائٹ کو فلو سوفائز کیا ہے، اس سے ایلیٹ کلاس میں اس کی طرف رغبت تو بڑھ سکتی ہے، اس سے نفرت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ لاجکس تو اس کے خلاف بھی بہت موجود ہیں۔ ہمیں اکتاہٹ کے مسئلہ ہونے سے انکار نہیں ہے لیکن ہم آپ کو یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ میاں بیوی کی اکتاہٹ کا جو علاج سسپنس نائٹ میں تجویز کیا گیا ہے، اس سے اکتاہٹ دور نہیں ہوتی بلکہ بڑھ جاتی ہے۔ مغرب کو بیوی سے اکتاہٹ ہوئی تو عورت کی طرف متوجہ ہوا، اس سے اکتاہٹ ہونے لگی تو ہم جنس پرستی پر آ گئے کہ مرد، مرد سے اور عورت، عورت سے شہوت حاصل کرے۔ اس سے اکتائے تو جانوروں کی طرف متوجہ ہو گئے، وہاں سے بھی اکتا گئے تو اب انہیں سمجھ نہیں آ رہی کہ کیا کریں، سب کچھ تو کر لیا ہے۔

بات یہ ہے کہ سیکس دو قسم کا ہے؛ ایک وہ جو انسان کی بائیولاجیکل ضرورت ہے، اور اس کے لیے بیوی کافی ہے بشرطیکہ وہ شوہر سے اس مسئلے میں مکمل تعاون کرتی ہو جبکہ عورت کی طبعاً زیادہ ضرورت رومانس ہے نہ کہ سیکس۔ اور دوسرا سیکس وہ ہے جو انسان کی ذہنی ضرورت ہے تو اس کے لیے کچھ بھی کافی نہیں ہے۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ جب سیکس انسان کے دماغ میں گھس جائے تو وہ ہمیشہ سیکس کے مسئلے میں پریشان رہے گا۔ ہمارے معاشروں بلکہ فلسفیوں، ادیبوں اور آرٹسٹوں کا اصل مسئلہ یہی ہے کہ سیکس جو کہ بائیولاجیکل ضرورت تھی، اسے ذہنی ضرورت بنا دیا گیا ہے۔ مصنف نے لالی کی زبانی اسے بے غیرتی کہہ کر اس پر جو نقد کی ہے، اسے جذبات سے جوڑ کر ہلکا بنا دیا ہے اور خود اس عمل کو لاجک کی بنیاد فراہم کر کے اعلی سوچ بنا دیا ہے۔

اس لیے جب سے وہ ذہنی ضرورت بنا ہے، ہر ناول نگار نے اسے معاشرے کا بنیادی ترین مسئلہ دکھایا ہے۔ بھائی، سامنے کی بات ہے کہ ایک بھوک وہ ہے جو تمہارے پیٹ کی ہے اور یہی اصل بھوک ہے اور ایک وہ ہے جو تمہارے ذہن میں ہے، تو جو تمہارے ذہن میں ہے، وہ دھوکا ہے۔ اس کا حل یہ نہیں ہے کہ ذہنی بھوک کو مٹانے چل پڑو بلکہ اس کا علاج یہ ہے کہ ذہن کی اصلاح کرو۔ بھئی' دو لفظوں میں خلاصہ یہ ہے کہ اکتاہٹ

تمہارے دل میں نہیں، ذہن میں ہے۔ اور ذہن کی اکتاہٹ' ایبنارمیلٹی ہے' اس کا علاج کرو۔ اور بھی بہت سی باتیں کرنے کا جی چاہ رہا ہے، لیکن تحریر پہلے ہی کافی طویل ہو گئی ہے۔

جنت کی تلاش از رحیم گل

"جنت کی تلاش" از رحیم گل کمال ناول ہے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ اردو ادب میں دانش کی انتہائی مثال "راجہ گدھ" کی صورت میں ہی ہے لیکن اب یہ خیال تبدیل ہو گیا ہے۔ اگر اردو ادب میں دانش کی انتہاء دیکھنی ہو تو "جنت کی تلاش" کا مطالعہ ضرور کریں۔ باقی ناولز ایک خاص پاس منظر رکھتے ہیں، کچھ تاریخی ہوتے ہیں، کچھ رومانوی اور کچھ سماجی لیکن اس ناول کا اصل خاصہ عصر حاضر کی دانش کا تجزیاتی مطالعہ ہے۔

میرے بس میں ہو تو اس ناول کو درس نظامی کے نصاب میں ادب کے مضمون کا حصہ بنا دوں کہ طلباء کی ذہنی، فکری، تجزیاتی اور تنقیدی صلاحیتوں کو بہتر بنانے کے لیے اس سے بہتر متن نظر سے نہیں گزرا۔ جن لوگوں کا ذوق فکری ہے، وہ اس کا مطالعہ ضرور کریں لیکن داستان عشق سمجھ کر نہیں بلکہ فلسفہ حیات اور انسان کے بارے پوشیدہ راز جاننے کے لیے۔

اہلیہ کے نام محبت کا خط

عید کے موقع پر اہلیہ کو تحفہ دیا تو اصرار کے ساتھ فرمائش کرنے لگیں کہ اتنا کچھ لکھتے ہیں، کچھ میری تعریف میں بھی تحفے کے ساتھ لکھ دیں کہ سند رہے۔ پہلے تو بہت پریشانی ہوئی کہ کہاں سنجیدہ مذہبی تحریریں اور کہاں محبت نامہ بلکہ سند نامہ، کیسے لکھ پاؤں گا لیکن پھر ذہن میں خیال آیا کہ اللہ کے رسول ﷺ کی عادت تھی کہ ازواج کی تعریف کیا کرتے تھے جیسا کہ کہا کہ عائشہ کو عورتوں پر ایسی فضیلت حاصل ہے جیسا کہ ثرید کو کھانوں پر۔

ایک اور موقع پر فرمایا کہ مجھے عورتوں میں سب سے زیادہ محبت عائشہ سے ہے اور مردوں میں عائشہ کے والد سے۔ نکتہ یہ ہے کہ یہ نہیں کہا کہ مردوں میں ابو بکر سے

سب سے زیادہ محبت ہے بلکہ عائشہ کے والد سے ہے، رضی اللہ عنہما۔ ایک موقع پر اماں عائشہ کے سامنے خاوندوں کی گیارہ قسموں اور ان کی خصوصیات کا ذکر فرمایا اور آخر میں کہا کہ اے عائشہ! میں آپ کے لیے ایسا ہی ہوں جیسا کہ ابو زرع، ام زرع کے لیے تھا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تمام تعریفیں حدیث کی کتابوں میں نقل ہوئی ہیں۔ اب تو عجب تقوی ہے کہ بیوی کی تعریف کریں تو واعظ صاحب وعظ شروع فرمادیں گے کہ بیڈ روم میں کیا کرو۔ اور اگر محبوبہ کی تعریف میں غزل کہہ دیں تو یہی واعظ صاحب ادیب کا خطاب عنایت فرمادیں گے۔

سو یہ سب سوچ کر کہ شاعروں نے تو ہمیشہ محبوباؤں کی تعریف میں مبالغہ کیا ہے اور بڑا شاعر ہی اسے سمجھا جاتا ہے جو محبوب کی تعریف میں زمین وآسمان کے قلابے ملا دے۔ اور رہی بیوی تو اس کے بارے معروف کر دیا کہ وصال کے بعد کہاں کی محبت کہ عشق کا بخار تو سارا فراق میں چڑھتا ہے۔ اور ہمارے بہترین اردو ادب میں شاید ہی بیوی کے لیے کوئی غزل کہی گئی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ کہی گئی ہو لیکن میرے علم میں نہیں ہے۔

پس اسی سبب سے کہ اور نہ سہی تو اسے رومانس کی اسلامائزیشن ہی سمجھ لیں کہ اہلیہ کے لیے نصف بھر گھنٹہ میں ایک ہلکی پھلکی تحریر مرتب کر دی کہ شاید ان کی خوشی کا باعث بن جائے۔ پہلے سوچا کہ اس کے حقوق عام کر دوں کہ تمام مومن مرد اس سے ترغیب پا کر عید کے موقع پر اپنی بیویوں کے لیے اس سنت کو تازہ کر سکیں کہ ان کے لیے کسی طرح سے بھی خوشی اور راحت کا باعث بنیں لیکن پھر یہ سوچ کر رک گیا کہ زیادہ مذہبی لوگوں کا تقوی خراب ہو جائے گا اور اس کا الزام بھی مجھ پر آئے گا۔ ہمارے مشرقی مرد، خاص طور مذہبی لوگ اپنی بیوی سے اظہار محبت کے بارے کنواری لڑکی کی طرح شرمیلے واقع ہوئے ہیں جبکہ میر وغالب کی شاعری کے ان کے خیالی محبوب کے بارے یہ ساری حیاء معلوم نہیں کہاں چلی جاتی ہے؟ اور یہ شاعری تو اردو کی ٹیکسٹ بکس میں شامل ہے، لڑکے بھی پڑھ رہے ہیں، لڑکیوں کو بھی پڑھنا ہے۔ بس ہمارے مذہبی طبقات کی دینی غیرت ایسی ہی رہ گئی ہے کہ مسجد میں عورت نماز کے لیے نہیں جاسکتی

لیکن بازار جاسکتی ہے۔اور دلیل یہ ہے کہ مسجد جانے میں فتنہ زیادہ ہے۔

عشق کیا ہے؟

آج صبح صبح "ریختہ" [1] کی ورق گردانی کے دوران ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب کی ایک کتاب بعنوان "رموز عشق" سامنے آئی کہ جس کا مطالعہ کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ کتاب "ندوۃ المصنفین"، دہلی سے شائع ہوئی ہے اور تقریباً دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ اس موضوع پر اس سے جامع کتاب اردو، فارسی اور انگریزی میں موجود نہیں ہے۔

بہر حال عشق کیا ہے؟ اس بارے ولی الدین صاحب نے صوفیاء اور علماء کی آراء کو بالتفصیل نقل کیا اور یہ جان کر حیرت ہوئی کہ ہماری تاریخ کے بڑے بڑے نامور صوفیاء اور علماء نے عشق اور محبت کے موضوع پر تفصیل سے گفتگو کی ہے جیسا کہ جنید بغدادی، امام غزالی، امام ابن قیم، شیخ عبد الحق محدث دہلوی، شاہ ولی اللہ دہلوی، شاہ عبد العزیز رحمہم اللہ وغیرہ۔

عشق کیا ہے؟ اس کا جواب ایک جیسا آنا ممکن نہیں ہے کہ ہر کسی کے تجربات یا احساسات اپنے ہیں لہذا اس کو ڈیفائن کرنے میں لوگوں کا اختلاف ہو گیا بلکہ اس کے درجات کے بارے میں بھی اختلاف ہے کہ کتنے ہیں اور کس ترتیب سے ہیں۔ شرح عقیدہ طحاویہ میں قلبی تعلق کے دس درجات بیان ہوئے ہیں کہ جن میں سے پانچویں کا نام عشق ہے۔ بہر حال میر تقی میر سے اختلاف کے ساتھ اس سوال کا جواب کہ "عشق کیا ہے؟"، یہ بھی ہو سکتا ہے:

کیا کہوں میں تم سے کہ کیا ہے عشق..... دل کا درد بلا کا سوز ہے عشق

ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب نے اپنی کتاب میں اسباب عشق پر بھی ایک باب باندھا ہے اور یہ لکھا ہے کہ عشق کے اسباب میں صرف "حسن وجمال" شامل نہیں ہے جیسا کہ عام طور سمجھا جاتا ہے بلکہ بعض اوقات آپ کو کسی سے محبت اس لیے ہو جاتی ہے کہ اس

[1] https://rekhta.org/

نے آپ پر "احسان" کیا ہو۔ یا محبت کا ایک سبب "کمال" بھی ہے کہ کسی کے اوصاف اور اخلاق کے کسی درجے کامل ہونے کے سبب اس سے محبت محسوس ہونے لگتی ہے۔

یا محبت کا ایک سبب "تعارف روحانی" بھی ہے جیسا کہ صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ اس دنیا میں آنے سے پہلے یہ ارواح لشکروں کی صورت میں ایک ساتھ تھیں۔ تو کچھ ارواح کی آپس میں ملاقات ہوئی تو ان میں الفت پیدا ہو گئی اور کچھ ارواح ایک دوسرے سے دور رہیں تو ان میں ناآشنائی باقی ہے۔ تو بعض اوقات آپ کو خواہ مخواہ کسی سے الجھن محسوس ہوتی ہے اور معلوم بھی نہیں ہوتا کہ کیوں ہو رہی ہے؟ تو اس کی وجہ یہی ناآشنائی ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

کتاب میں ایک باب عشق مجازی پر بھی ہے اور اس کی دو قسمیں انہوں نے بیان کی ہیں؛ عشق حیوانی اور عشق نفسانی۔ عشق حیوانی وہ ہے جو معشوق کی رنگت، شکل وصورت اور حسن وجمال کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور اس میں حرص وہوس ہوتی ہے لہذا اس میں کوئی خیر نہیں ہے اور نہ ہی عشق کی یہ قسم پسندیدہ ہے۔

عشق مجازی کی دوسری قسم یعنی عشق نفسانی یہ ہے کہ جو عشق کسی سے اس کے اوصاف اور خصائل کی وجہ سے پیدا ہوا اور اس میں لطافت اور نفاست ہوتی ہے لہذا یہ دل کی نرمی، فکر کی اصلاح اور شخصیت کی تعمیر کا باعث بن جاتا ہے لہذا یہ مذموم نہیں ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

فن تعمیر کی شرعی حیثیت

تعمیر میں اصل اباحت ہے کہ سورۃ النحل میں ہے کہ اللہ عزوجل نے تمہارے لیے تمہارے گھروں کو سکونت کی جگہ بنایا اور اس نے تمہارے لیے چوپایوں کی کھالوں سے گھر بنائے کہ جنہیں تم سفر اور قیام میں ہلکا پھلکا پاتے ہو۔ لیکن فن تعمیر اپنے عرفی معنی میں، تو دین اسلام میں یہ اصلاً ممنوع ہے کہ جس دین کا مزاج یہ ہو کہ ضرورت سے زائد بستر بنانے کو ناپسند جانا گیا ہو وہاں ضرورت سے زائد عمارت بنانا کیسے پسندیدہ ہو سکتا ہے۔

صحیح مسلم کی روایت کے مطابق آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایک بستر تمہارے لیے، ایک

تمہاری بیوی کے لیے، تیسرا مہمان کے لیے، اور چوتھا شیطان کے لیے ہے۔

اُس دین میں تاج محل یا اہرام مصر بنانے کی اجازت کیسے ہو سکتی ہے کہ جس دین کے پیغمبر ﷺ کا فرمان ہو کہ ہر عمارت اس کے بنانے والے پر وبال ہے، سوائے اس عمارت کے کہ جس کے بنائے بغیر کوئی چارہ نہ ہو۔ یہ روایت سنن ابو داؤد میں ہے۔ اور اللہ کی کتاب میں اس کی مذمت قوم عاد کے جرائم کی فہرست بیان کرتے ہوئے یوں کی گئی ہے: ﴿أَتَبْنُونَ بِكُلِّ رِيعٍ آيَةً تَعْبَثُونَ﴾ [الشعراء: 128]۔ ترجمہ: کیا تم ہر اونچے ٹیلے پر ایک یادگار عمارت تعمیر کرتے ہوئے بے کار کام کرتے ہو۔ اور خود ازواج مطہرات کے حجرات اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے گھر اس پر شاہد ہیں کہ مومن، مسافروں کی طرح گھر بناتا ہے نہ کہ بادشاہوں کی طرح محلات۔

حدیث جبرئیل علیہ السلام میں قیامت کی نشانیوں میں سے ایک بڑی نشانی کے طور اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ چرواہے بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کرنے میں ایک دوسرے سے مقابلہ کریں گے۔ یہ روایت صحیح بخاری میں ہے۔ پس ہر وہ عمارت کہ جو ضرورت سے زائد ہو اور اسراف اور فضول خرچی ہو یا ہر وہ عمارت کہ جس کا مقصد فخر اور ریا ہو، اس کا بنانا اصلاً ممنوع ہے۔ سنن الترمذی کی ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ انسان کو اس کے ہر قسم کے خرچ کا ثواب ملے گا سوائے اس خرچ کے کہ جو اس نے مٹی میں لگا دیا یعنی عمارت بنانے میں۔ صحیح مسلم کی اور ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے قبر پر عمارت بنانے سے منع فرمایا۔

سنن ابن ماجہ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ ایک دن باہر نکلے تو آپ نے ایک بلند گنبد دیکھا۔ آپ نے فرمایا کہ اس قسم کی ہر عمارت قیامت والے دن اس کے بنانے والے پر وبال ہو گی۔ یہ بات ان انصاری صحابی تک پہنچی کہ جنہوں نے وہ گنبد بنایا تھا تو انہوں نے اسے گرا دیا۔ کچھ دن بعد آپ ﷺ کا دوبارہ اس رستے سے گزر ہوا تو وہاں وہ گنبد موجود نہ تھا تو آپ نے صحابہ سے پوچھا تو صحابہ نے سارا قصہ بیان کر دیا۔ آپ نے یہ سن کر ان صحابی کو دعا دی کہ اللہ ان پر رحم فرمائے،

اللہ ان پر رحم فرمائے۔

لڈو کھیلنے کا شرعی حکم

دوست کا سوال ہے کہ کیا لڈو کھیلنا حرام ہے کہ مفتی صاحب کا کہنا ہے کہ حدیث میں لڈو کھیلنے سے منع کیا گیا ہے۔ جواب: حدیث میں جس کھیل سے منع کیا گیا ہے، اس کا نام "نرد" یا "نرد شیر" ہے جیسا کہ صحیح مسلم کی روایت کے الفاظ ہیں کہ جس نے "نرد" کھیلا تو اس نے گویا خنزیر اور اس کے خون میں اپنا ہاتھ ڈبویا۔ "نرد" در اصل آپ ﷺ کے زمانے میں اہل فارس کا ایک کھیل تھا جسے ہم انڈور گیمز میں شامل کر سکتے ہیں۔

اسلام میں کھیل کے مقاصد میں راحت نفس، ذہنی سکون اور جسمانی صحت شامل ہے لہذا ایسے تمام کھیل جائز ہیں کہ جن سے یہ مقاصد پورے ہوتے ہوں۔ اور جو کھیل اذیت نفس، ذہنی بے سکونی اور جسمانی صحت کے لیے نقصان کا باعث بنے تو وہ اسلام میں جائز نہیں ہے۔ یہ تو ایک اصولی بات ہو گئی۔ اب اس میں تفصیل یہ ہے کہ ایسے تمام کھیل کہ جن میں جواء شامل ہو جائے کہ یہ اذیت نفس اور ذہنی بے سکونی کا باعث ہے، حرام ہیں۔ اور جو کھیل جائز بھی ہیں، اگر انہیں اس قدر کھیلا جائے کہ وقت کا ضیاع ہو اور دینی فرائض مثلاً نماز وغیرہ سے کوتاہی ہو اور کھیل ایک نشہ (addiction) کی صورت اختیار کر جائے تو ایسی صورت حال میں وہ جائز کھیل بھی ناجائز بن جاتا ہے۔

"نرد" کے کھیل سے جو رسول اللہ ﷺ نے منع کیا ہے تو اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ اس منع کرنے کی علت یعنی وجہ کیا ہے؟ بعض علماء نے کہا کہ یہ کھیل چونکہ لکڑی کے ایک تختے پر کھیلا جاتا تھا لہذا ایسے تمام کھیل ممنوع ہیں جو لکڑی کے تختے پر کھیلے جاتے ہوں جیسا کہ لڈو، کیرم بورڈ اور اسنوکر وغیرہ۔ کچھ علماء نے کہا کہ "نرد" ایک ایسا کھیل تھا کہ جس میں پاسہ (dice) یعنی دانہ پھینکا جاتا ہے لہذا ایسے تمام کھیل جائز نہیں ہیں کہ جن میں دانہ پھینکا جاتا ہو جیسا کہ لڈو وغیرہ۔

ہماری نظر میں اس کھیل کی ممانعت کی یہ دونوں وجہ اصل نہیں ہیں کیونکہ کسی شیء

کے ممانعت کی وجہ معقول (reasonable) ہونی چاہیے اور لکڑی کے تختے کو ممانعت کی وجہ بنانا تو بالکل بھی لاجیکل نہیں ہے البتہ دانے اور ڈائس کو وجہ بنایا جا سکتا ہے کہ یہ جوئے اور قمار کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن اس صورت میں بھی یہ کھیل اسی وقت حرام قرار پائے گا جبکہ اس میں شرط اور جواء وغیرہ شامل ہو جائے۔ پس لڈو اگر شرط اور جوئے کے بغیر ہو تو جائز ہے۔

ہمارے نزدیک "نرد" کی ممانعت کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس کھیل کا تعلق شرک سے تھا، ربوبیت کے شرک سے جیسا کہ اس کھیل کی تفصیل کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے مثلاً علامہ الدمیری رحمہ اللہ نے "حياة الحيوان" میں لکھا ہے کہ "نرد" میں بارہ گھر بارہ مہینوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور ان کی چار حصوں میں تقسیم سے مراد سال کے چار موسم ہیں۔ اور تیس سفید اور سیاہ خانوں سے مراد مہینے کے دن رات ہیں۔ اور دانے کی چھ جہات سے مراد جہات ستہ (three dimensions) ہیں۔ اور دانے کی چھ اطراف میں جو نکتے ہیں، وہ آسمانوں، افلاک، زمین، اور سیاروں کی تعداد واضح کرتے ہیں۔ تو "نرد" کھیلنے والا دراصل اس کائنات کے نظام کو اپنی حسن تدبیر اور عقل سے چلانے کی کوشش کرتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ کوئی کھیل ایسا ہو کہ جس میں غالب طور شرط اور جواء ہی لگایا جاتا ہو تو ایسا کھیل اگر شرط اور جوئے کے بغیر بھی کھیلا جائے تو اس سے منع ہی کیا جائے گا کہ شریعت نے ایسے برتنوں کے استعمال سے بھی منع کر دیا کہ جو شراب کے لیے مستعمل ہوں۔ پس تاش کے پتوں اور اسنوکر وغیرہ سے کھیلنے کو اسی اصول کے تحت دیکھ لیا جائے کہ جائز ہے یا نہیں؟ لیکن بغیر شرط کے ایسے کھیل کے کھیلنے کو بھی حرام نہیں بلکہ مکروہ (discouraged) ہی کہیں گے کہ حرام وہ شرط اور جوئے سے ہی ہو گا۔

تیسری بات یہ ہے کہ شریعت میں علل (causes) کے علاوہ مقاصد (objectives) بھی اہم ہیں۔ پس اگر کسی جائز کھیل سے دین کا کوئی مقصد فوت ہو رہا ہو تو اس کھیل سے اس وقت تک منع کر دیا جائے گا جب تک کہ وہ مقصد پورا نہ ہو

جائے یعنی نماز کے لیے آذان ہو جانے کے بعد جائز کھیل سے بھی روک دیا جائے گا یہاں تک کہ نماز ادا کر لے۔ اسی طرح اگر کسی جائز کھیل میں اتنی زیادہ مشغولیت ہو جائے کہ وہ ایڈکشن بن جائے یا اس سے وقت کا ضیاع ہو تو اس سے بھی منع کیا جائے گا کیونکہ اسلام ایڈکشن کو پسند نہیں کرتا کہ ذہنی بے سکونی کا باعث ہے۔

چوتھی بات یہ کہ بعض کمپیوٹر یا موبائل گیمز ایسی ہیں کہ جن میں آپ کوائنز جیتتے یا ہارتے ہیں تو کیا یہ گیمز کھیلنا جائز ہے؟ ایسی گیمز کا کھیلنا بھی جائز ہے کیونکہ یہ جیتنا اور ہارنا ورچوئل ہے نہ کہ حقیقی لیکن اگر ان گیمز میں انوالومنٹ اس قدر بڑھ جائے کہ یہ اصل جوئے کی طرف جانے کا ذریعہ بن جائیں تو ایسی صورت میں ان گیمز سے بھی منع کر دیا جائے گا۔ اور اگر کوئی کمپیوٹر یا موبائل گیم ایسی ہو کہ جس کے کھیلنے والے غالب طور اس کی ایڈکشن میں مبتلا ہو جاتے ہوں تو ایسی گیم سے بھی منع کیا جائے گا۔

پانچویں اور آخری بات یہ کہ انڈور گیمز میں بھی ان گیمز کو ترجیح دیں کہ جن سے شریعت کے مقاصد پورے ہوں مثلاً ایسی گیمز کھیلیں کہ جن سے ذہنی استعداد اور صلاحیت بڑھے یعنی ذہانت میں اضافہ ہو۔ محض گیم کھیلنا کوئی مقصد نہیں ہے جیسا کہ لڈو وغیرہ۔ اس لیے لڈو کھیلنا اگرچہ حرام نہیں ہے لیکن بہتر نہیں ہے کہ اس کھیل سے کسی انسانی صلاحیت کی نشوونما نہیں ہوتی۔ امید ہے کہ اس تفصیل سے معاملے کی وضاحت ہو گئی ہو گی۔

فیس بک ایک مایا جال ہے!

دوست کا کہنا ہے کہ فیس بک ایک مایا جال (matrix) ہے، ہم سب کو یہ پہچان کر فیس بک استعمال کرنی چاہیے، یہاں لفظ آ کر اپنی اہمیت کھو دیتے ہیں۔ فیس بک خود نمائی کا سب سے بڑا اڈا ہے جو خود نما نہیں بھی بننا چاہتا وہ بن جائے گا، جیسے سٹیج کلاکار کہ خود نمائی کے بغیر وہ کامیاب کلاکار نہیں بن سکتا۔ پہلے تنہائی خود نمائی کا ازالہ ہوتی تھی مگر اب تنہائی بھی خود نمائی ہو گئی ہے۔

فیس بک استعمال کرنا چھوڑ دیں!

بہت سے دوست مجھے یہ مشورہ دیتے رہتے ہیں کہ میں فیس بک چھوڑ دوں؛ وہ بھی جو فیس بک پر ہیں، اور وہ بھی جو فیس بک پر نہیں ہیں۔ بعض دوستوں کا خیال ہے کہ فیس بک پر آنے کی وجہ سے میرے ایٹی چیوڈز تبدیل ہو گئے ہیں یا آسان الفاظ میں، میں خراب ہو گیا ہوں یا ہو رہا ہوں۔ کچھ کا خیال یہ بھی ہے کہ فیس بک کا استعمال گناہ کا کام ہے۔ کچھ اسے دجالی فتنہ کہتے ہیں تو کچھ کی رائے ہے کہ اس کا نقصان، اس کے فائدے سے بڑھ کر ہے وغیرہ وغیرہ۔

میں ان سب تبصروں کی جزوی حقیقت کا قائل ہوں کہ فیس بک کے نقصانات ہیں اور بہت ہیں اور میں خود بھی اس پر پوسٹیں لگاتا رہتا ہوں لیکن اسے دجالی فتنہ قرار دینا یا گناہ کا کام کہنا تو ایسے فتوے کچھ عرصہ بعد لطیفے بن جاتے ہیں۔ لاؤڈ اسپیکر کی مخالفت سے لے کر ڈیجیٹل تصویر کی حرمت اور ٹیلی ویژن توڑنے کی مہم جوئی تک کے سارے فتوے آج علمی حلقوں میں بھی بطور مذاق نقل کیے جاتے ہیں۔ بس دس بارہ سال کی دیر ہے تو تقوی کے یہ نقوش کہ فیس بک کا استعمال گناہ ہے یا دجالی فتنہ ہے، بھی دھندلا جائیں گے۔ ہم ہندوستان میں رہتے ہوئے یہ فتوی دینا چاہتے ہیں کہ گاندھی جی کی تصویر والے نوٹ کا استعمال مسلمانوں کے لیے حرام ہے!

باقی میں اپنے دوستوں کی نصیحت پر غور کرتا رہتا ہوں اور شاید کسی وقت فیس بک چھوڑ بھی دوں لیکن اس لیے نہیں کہ اس کا استعمال شرعی طور ناجائز ہے بلکہ اس لیے کہ مجھے اس کا استعمال اب پسند نہیں رہا ہے یا کسی ایسے شخص نے مجھے اس کے استعمال سے منع کر دیا کہ جس کی بات ٹالنا میرے لیے ممکن نہیں ہے مثلاً اہلیہ محترمہ۔ بہر حال انباکس میں ایک دوست کی نصیحت ملاحظہ فرمائیں، اللہ تعالی عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔

"فیس بک استعمال کرنا چھوڑ دیں۔ آپ کو میری بات بہت بری لگے گی۔ مگر میں نے آپ کو پڑھا ہے۔ آپ ہمارے معاشرے میں علماء کے کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس فیس بک کی وجہ سے آپ کے رویوں میں تبدیلی آگئی

ہے۔ یہ فیس بک کوئی کام کی شئے نہیں ہے۔ میں 15 سال کا تھا جب سے علمی، فکری اور تحریکی لٹریچر پڑھ رہا ہوں۔ گزشتہ 4 سال سے فلسفہ پڑھ رہا ہوں۔ یہ میڈیا کسی طرح اسلام کی خدمت کرنیکا اہل نہیں ہے۔ جب میں کسی کو دیکھتا ہوں کہ ہمارہ معاشرہ کا اچھا داعی اسلام اس دلدل کی بھینٹ چڑھ گیا ہے تو جو افسوس مجھے ہوتا ہے میں وہ لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ آج پہلی میں نے فیس بک پہلی بار جوائن کی ہے اور آپ کے بارہ میں آپکا نیا موٴقف جان کر مجھے دلی صدمہ ہوا۔"

جواب: جزاکم اللہ، اللہ آپ کو خوش رکھے، آپ کے فیس بک چھوڑنے کے مشورے پر غور کروں گا، اگرچہ اس سے پہلے دس بار سوچ چکا ہوں، لیکن ایک بار مزید غور کروں گا۔ لیکن اس حیثیت سے کہ یہ ایک دوست کی نصیحت ہے نہ کہ اس اعتبار سے کہ اس میں کوئی شرعی وزن ہے۔

فیس بک چھوڑنے کے لیے شرعی دلیلیں بھی ان کی ایسی ہی ہیں کہ پہلے خود سے ہی یہ مقدمہ قائم کر لیا کہ فیس بک ایک دجالی فتنہ ہے اور پھر حدیث سے استدلال کر لیا کہ دجال کا سامنا کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ فیا للعجب! پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ مقدمہ ہی قابل اعتبار نہیں ہے کہ فیس بک ایک دجالی فتنہ ہے۔ فیس بک ایک فتنہ ہے، بس اتنا بیان کافی ہے۔ اگر فیس بک دجالی فتنہ ہے تو کیا اسمارٹ فون دجالی فتنہ نہیں ہے؟ یعنی جس جدید ایجاد کا طوق آپ اپنی گردن سے اتار نہ سکیں تو وہ تو دجالی فتنہ نہیں ہے لہذا اس کی مذمت پر وعظ کہنے اور لیکچر دینے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اور جس ایجاد کا استعمال دوسروں نے آپ سے بہتر سیکھ لیا ہے، وہ دجالی فتنہ بن گئی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں کچھ لوگوں کو دجال کے نکالنے کی جتنی فکر ہے، اتنی شاید خود دجال کو اپنے نکلنے کی نہ ہو۔ دجالی فتنہ، دجالی فتنہ ایسی باتیں اسی مزاج کا شاخسانہ ہیں جو پچھلی نصف صدی سے دجال کو نکالنے کے لیے فکر مند ہے لیکن ان کی انتہائی کوششوں کے باوجود وہ نکل نہیں پا رہا۔ اللہ، ان لوگوں کو ہدایت دے، یہی کہا جا سکتا ہے کہ امت مسلمہ کی جو گھڑی خیریت سے گزر جائے، اس پر اللہ کا شکر ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ صحیح مسلم کی

روایت میں رسول اللہ ﷺ نے اس بندہ مومن کے ایمان کی تعریف بیان کی ہے جو دجال کا سامنا کرے گا اور اس کے فتنے کا شکار ہوگا بھی اور نہیں بھی ہوگا۔

فیس بک پر میں کیوں ہوں، ہر شخص کا جواب مختلف ہو سکتا ہے۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ جو اس کا جواب ہو، وہی اس کا عمل بھی ہو۔ کچھ لوگ فیس بک پر اس لیے ہیں کہ انہیں اپنا تعارف چاہیے، لائکس چاہییں، فالورز چاہییں۔ کچھ اس لیے ہیں کہ وہ دین کی تبلیغ کرنا چاہتے ہیں۔ کچھ اسے انٹرٹیمنٹ کی جگہ قرار دیتے ہیں کہ جہاں لوگ ہلکا پھلکا ہونے آتے ہیں۔ کچھ اسے اپنا فارغ وقت گزارنے کا ایک اچھا پلیٹ فارم سمجھتے ہیں۔ کچھ لوگ دوسروں سے سیکھنا چاہتے ہیں اور کچھ کو دوسروں کو سکھانے کا شوق ہے وغیرہ

۞۞۞۞۞۞۞

باب سیزدہم

امن اور جنگ

اس باب میں امن اور جنگ [**peace and violence**]کے بارے بنیادی سوالات پر بحث کی گئی ہے۔

جذبہ شہادت

رات ایک نمازی کو بے قراری میں روتے دیکھا تو پوچھا کیا ہوا؟ کہنے لگا اللہ کی رضا کے لیے، دین اسلام کے غلبہ کے لیے اور اس امت کے دفاع کے لیے جان قربان کرنے کو دل تڑپتا ہے۔ میں نے کہا تو جہاد پر کیوں نہیں جاتے؟ کہنے لگا کہ کہاں جائیں، بیس سال ہو گئے مجھے اس کے لیے روتے ہوئے، اور بیس سال ہی ہو گئے یہ دیکھتے ہوئے کہ جہاد کا آغاز کافروں کے ظلم کے خلاف اٹھنے کے نعرہ سے ہوتا ہے اور اختتام مسلمانوں کی باہمی لڑائی پر۔ میں یہی سوچ کر خاموش ہو گیا کہ اس امت میں ضرور جہاد کی کوئی ایسی اجتماعی صورت پیدا ہو گی کہ ایسا جذبہ ضائع نہ ہو۔

شکوہ اور جواب شکوہ

شکوہ: عید کا دوسرا دن تھا، ایک دوست شہر سے باہر جا رہے تھے، پہاڑوں کی طرف کا رخ تھا۔ میں نے پوچھا: کہاں کا ارادہ ہے؟ کہا کہ سامنے کے پہاڑ کی چوٹی کا۔ میں نے کہا کہ خیریت ہے؟ کہا کہ شہر کے لوگ "روہنگیا" کے خدا کو دُہائیاں دے رہے ہیں کہ آکر ان کی مدد فرما لیکن کوئی جواب نہیں آ رہا۔ میں نے سوچا کہ ذرا اس کے قریب ہو کر پکار کر دیکھتے ہیں، شاید کوئی آواز پہنچ جائے۔

جواب شکوہ: عید کا تیسرا دن تھا، وہی دوست شہر کی طرف تشریف لا رہے تھے۔ میں نے پوچھا کہ خدا نے کوئی جواب دیا پھر؟ اس نے کہا: ہاں۔ میں نے جوش میں کہا: کیا؟ اس نے کہا کہ خدا یہ کہہ رہا ہے کہ اب تم بڑے ہو گئے ہو، کچھ اپنے آپ کو خود سے بھی سنبھالو۔ میں نے کہا کہ تم اس جواب سے مطمئن ہو؟ اس نے کہا کہ مجھے یہ تو معلوم نہیں لیکن میری ماں بھی مجھے یہی کہتی تھی۔ میں نے کہا کہ مجھے شاعری نہیں آتی، ورنہ تمہارے جذبات کو شعر میں ضرور ڈھال دیتا۔

حلب کی بربادی

حلب کی بربادی، امت کے لیے عذاب ہے یا آزمائش، مجھے کیا معلوم۔ آؤ مل کر

ایک نئے حلب کی بنیاد رکھیں اور اپنے خدا سے یہ عہد کریں کہ اس شہر میں تیرے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کریں گے، آپس میں محبت کے ساتھ، مل جل کر رہیں گے۔

حلب جل رہا ہے!

آؤ حلب پر بھی مل کر رو لیتے ہیں کہ رونے کے بعد نیند اچھی آتی ہے۔[احمد جاوید صاحب]

حلب پر پوسٹیں لگانے کا فائدہ کیا ہے؟

دوست نے سوال کیا ہے کہ حلب پر پوسٹیں لگانے کا فائدہ کیا ہے جبکہ آپ اس کے لیے کچھ کر نہیں سکتے؟ جواب: اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے کہ اہل ایمان کی باہمی محبت، مودت اور الفت کی مثال ایک جسم کی سی ہے کہ اگر جسم کے ایک عضو میں درد ہو تو سارا جسم تکلیف اور اذیت سے بے چین رہتا ہے۔ یہ روایت صحیح بخاری میں ہے۔

کانٹا ہاتھ میں چبھے تو آہ زبان سے نکلتی ہے، درد دل میں ہو تو سوج آنکھیں جاتی ہے، اور تکلیف پاؤں میں ہو تو آنسو آنکھ بہاتی ہے لیکن کوئی آنکھ سے نہیں پوچھتا کہ پگلی تو کیوں روتی ہے؟ یہ تو فطرت ہے کہ ایسا ہوتا ہے۔ اگر درد سر میں ہو گا تو پورا جسم اذیت محسوس کرے گا۔ کیا تم نے کسی کو یہ کہتے سنا ہے کہ درد پیٹ کو ہے اور آہیں زبان بھر رہی ہیں، آنسو آنکھیں گرا رہی ہیں؟

حلب پر پوسٹیں تو اس بات کی علامت ہیں کہ مسلمان ایک امت بننے جا رہے ہیں، یہ ایک جسم بن رہے ہیں کہ جس کے ایک حصے کی تکلیف ان سب کو بے چین کر دیتی ہے۔ آنکھ اور زبان، پاؤں میں لگے کانٹے کو نکال تو نہیں سکتے لیکن آنسو بہا کر اور آہ بھر کر پاؤں کو یہ پیغام ضرور دیتے ہیں کہ ہم تمہاری تکلیف اور اذیت کو برابر محسوس کر رہے ہیں۔

اور پاؤں کی تکلیف پر اگر زبان آہ نہ بھرے، آنکھ آنسو نہ بہائے تو یہ ایک جسم نہیں ہے، واللہ! یہ ایک جسم نہیں ہے۔ یہ امت نہیں ہے، واللہ! یہ امت نہیں ہے۔ اور اگر یہ ایک جسم اور امت ہے تو تمہارا یہ سوال لغو ہے، تمہارا یہ اعتراض بے کار ہے۔ تم آنکھ کو یہ سمجھانے کی لغو کوشش کر رہے ہو کہ کانٹا تو پاؤں میں چبھا ہے، تیرے رونے سے کیا

اس کی تکلیف دور ہو جائے گی؟ جذبات اپنے اظہار کے لیے کسی عقلی و منطقی دلیل کا انتظار نہیں کیا کرتے۔

جہاد کے معانی کی تجدید

جہاد ایک ایسی اصطلاح ہے کہ جس کے اصل معانی کی تجدید وقت کی ایک اہم ضرورت ہے، ورنہ تو جہاد اور فساد میں کچھ فرق نہ رہ جائے گا۔ اور وہ وقت بھی آ گیا ہے کہ جہاد کا نام لینا ہمارے لیے شرم کا باعث بن جائے گا کہ جہاد کی اصطلاح میں اس قدر ابہام پیدا ہو جائے گا کہ اس کے معانی فسادی سرگرمیوں کے جنگل میں گم ہو جائیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جو کچھ جہاد کے نام پر ہو رہا ہے، وہ سب جہاد نہیں ہے۔ تو جہاد کیا ہے؟

اس بارے اب علماء کو کسی کانفرنس میں ایک متفقہ اعلامیہ جاری کرنا ہو گا کہ جس میں کم از کم اس نکتے پر اتفاق کر لیا جائے کہ کلمہ گو کی باہمی لڑائی ہر گز جہاد نہیں ہے۔ مسلمان کی جگہ کلمہ گو اس لیے کہا کہ عجب تماشا ہے کہ جب دوسرے مسلمان کو مارتے ہیں تو مرتد اور کافر بنا کر ہی مارتے ہیں یعنی دوہرا ظلم کرتے ہیں۔ تو جو کلمہ گو ہے، کلمہ پڑھنے والا ہے، اس کا قتل جہاد نہیں ہے، چاہے پاکستان میں ہو یا افغانستان میں، شام میں یا عراق میں، لیبیا میں یا افریقہ میں، کہ قرآن مجید نے مسلمانوں کی باہمی لڑائی کو جہاد نہیں قتال کہا ہے۔ بس، اس کو طے کر لیں،۔ پھر دیکھیں، کہ جہاد کے بارے امت میں اعتماد بڑھتا ہے یا کم ہوتا ہے؟

جب تک ہم جہاد کی تعریف میں اس بات کو ایک بنیادی حیثیت نہیں دے پاتے، اس وقت تک جہاد کی اصطلاح کا خود مسلمان معاشروں میں دفاع کرنا بھی ناممکن رہے گا۔ کوئی بھی جہادی تحریک مسلمانوں میں جہاد کے عمل کو نیکی کا عمل بھی باور نہیں کروا سکتی، چہ جائیکہ کہ مسلمانوں کی نجات کا رستہ قرار دے سکے جب تک کہ وہ یہ طے نہیں کر لیتی کہ اس کے پلیٹ فارم سے جہاد کے نام پر کسی کلمہ گو کا خون جائز نہیں کیا جائے گا۔ امت کی تاریخ میں مسلمانوں کی باہمی لڑائی کو کس نے جہاد کہا ہے؟ اور آج بدقسمتی سے

جہاد کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے، وہ مسلمانوں کی باہمی لڑائی ہی ہے۔

پس ایک بات تو یہ ہوئی کہ جہاد کی اصطلاح کو ری ڈیفائن کرنے کی ضرورت ہے اور وہ علماء کی ایک جماعت ہی کر سکتی ہے۔ اور ری ڈیفائن کرنے سے ہماری مراد یہ ہے کہ افغان جہاد کے بعد سے عام طور اور نائن الیون کے بعد خاص طور جہاد کا جو غلط تصور عام کر دیا گیا ہے، اس کی نفی کر کے اس کے تاریخی تصور کو بحال کیا جائے کہ جس میں یہ بات بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے کہ مسلمانوں کی باہمی لڑائی جہاد نہیں ہے، جہاد صرف اور صرف غیر مسلم جنگجو سے ہوتا ہے۔ آپ مسلمانوں کے قتل کو جہاد قرار دے کر انہی سے یہ امید لگا سکتے ہیں کہ وہ آپ کو اسپورٹ کریں گے؟

اور دوسری اہم بات یہ ہے کہ یہ بھی طے کر لیا جائے کہ علماء ہر اس جہادی تحریک سے لاتعلقی کا اعلان کریں جو غیر مسلم شہریوں کے خون کو حلال کرتی ہو۔ جب تک ہم یہ تصور عام کرنے میں کامیاب نہیں ہو جاتے کہ مسلمان، دیگر مذہب کے ماننے والے پر امن شہریوں کے لیے اتنے ہی بے ضرر ہیں، جتنے کہ اپنی قوم کے لیے تو اس وقت تک ہم غیر مسلم دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کے بارے موجود منفی تاثر کو ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اور جب تک یہ منفی تاثر ختم نہیں ہوتا کہ مسلمان ایک خونخوار قوم ہے، اس وقت تک اسلام کی دعوت و تبلیغ میں موجود بڑے بند کو کھولا نہیں جا سکتا۔

جہاد کا معنی و مفہوم

کسی نے پوچھا ہے کہ جہاد کا معنی مفہوم کیا ہے۔ جہاد کا لفظ "جہد" سے بنا ہے جو کہ کوشش کے معنی میں ہے۔ پس جہاد عدل کے قیام کے لیے، ظلم کے خلاف جدوجہد کرنے کا نام ہے۔ قرآن مجید اس مسئلے میں بالکل واضح ہے کہ جہاد کی علت اور وجہ ظلم کا خاتمہ ہے جیسا کہ ارشادی باری تعالی ہے: ﴿أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا﴾ الحج: 39] ترجمہ: ان لوگوں کو جہاد کی اجازت دی گئی ہے کہ جن سے لڑائی کی گئی، اس وجہ سے کہ ان پر ظلم ہوا۔

اس آیت میں باء، تعلیل کے لیے ہے یعنی جہاد کی علت (cause) بیان کر رہی

ہے۔ اللہ عزوجل کفر کو برداشت کر لیتے ہیں لیکن ظلم کو برداشت نہیں کرتے۔ مستدرک حاکم کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ شخص سید الشہداء ہے یعنی شہیدوں کا سردار کہ جو ظالم اور جابر حکمران کے سامنے کلمہ حق کہے۔

اس مسئلے میں دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ عدل اور ظلم کوئی اضافی (relative) اصطلاحات نہیں ہیں کہ اشخاص اور افراد کے اعتبار سے ان کا مفہوم بدلتا رہے۔ عدل وہ ہے کہ جس کا اللہ عزوجل نے حکم دیا ہے اور ظلم وہ ہے کہ جس سے اللہ عزوجل نے منع فرمایا ہے۔ جہاں کفر ہے، وہاں ظلم ہے۔ کفر کا اجتماعی نظام دراصل ظالمانہ نظام ہی ہے، لیکن جہاد کی علت کفر نہیں ظلم ہے کیونکہ علت "معقول المعنی" (reasonable) ہونی چاہیے اور حکم سے عقلی مناسبت رکھتی ہو۔ بعض اوقات ظلم لازم ہوتا ہے یعنی اس کا اثر انسان کی اپنی ذات تک محدود ہوتا ہے جیسا کہ شراب پینا اور خودکشی کرنا وغیرہ۔ اور بعض اوقات ظلم متعدی ہوتا ہے یعنی اس سے دوسرے انسان اور معاشرہ بھی متاثر ہوتا ہے۔ اور جب ظلم متعدی ہو تو جہاد کی علت ہے۔

اور جہاد کے تین درجات ہیں۔ پہلا درجہ جو کہ کمزور ترین درجہ ہے، وہ ظلم کو دل میں برا جاننا ہے جو کہ فرض عین ہے کہ اس کے بغیر تورائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں ہے۔ اور دوسرا درجہ ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے کا ہے کہ یہ فرض کفایہ ہے۔ اور تیسرا اور اعلیٰ ترین درجہ ظلم کو بزور بازو روکنے کی کوشش کرنا ہے اور یہ استطاعت اور اہلیت کے ساتھ مشروط ہے۔

اور جہاد کی تین صورتیں ہیں؛ پہلی صورت اپنے نفس سے جہاد کرنا یعنی اسے اللہ کا مطیع اور فرمانبردار بنانے میں مجاہدہ کرنا کہ جسے "اصلاح نفس" بھی کہتے ہیں اور اس کا منہج اور طریق کار "تزکیہ نفس" کہلاتا ہے۔ دوسری صورت معاشرے میں موجود فکری و عملی بگاڑ کی اصلاح کی کوشش کرنا کہ جسے "اصلاح معاشرہ بھی کہتے ہیں اور اس کا منہج و طریق کار "دعوت و تبلیغ" کہلاتا ہے۔ اور تیسری صورت ظالم کے ظلم کو روکنے کے لیے قوت اور طاقت کا استعمال کرنا کہ جسے "اعلائے کلمۃ اللہ" بھی کہتے ہیں اور اس کا منہج

وطریق کار "جہاد بالید" کہلاتا ہے۔ یہ ہر شخص اپنے دائرہ کار میں کرنے کا پابند ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی باہمی لڑائی اور جنگ وجدال کو جہاد نہیں کہتے اور جہاد ظالم کافروں سے ہوتا ہے۔ مسلمانوں میں سے ایک گروہ اگر دوسرے پر ظلم کرے تو ظالم کو بزور بازو روکا جاسکتا ہے لیکن قرآن مجید نے اس کو قتال کا نام دیا ہے نہ کہ جہاد کا۔ جہاد کی اصطلاح صرف کافروں کے ساتھ لڑائی کے تناظر میں قرآن مجید نے استعمال کی ہے۔

اور چوتھی بات یہ ہے کہ جہاد بمعنی جنگ، ریاست کی ذمہ داری ہے۔ اور اس کے لیے عام افراد کی ذمہ داری صرف یہی ہے کہ ریاست کو اس کی ذمہ داری پر متنبہ کریں۔ اور پانچویں بات یہ ہے کہ مسلمانوں اور کافروں کے درمیان اصل حکم صلح کا ہے نہ کہ لڑائی کا، جب تک کہ کافر مسلمانوں پر ظلم نہ کریں یا دین حق کی تبلیغ سے نہ روکیں۔ اور آخری بات یہ ہے کہ کافر دو قسم کے ہیں؛ ایک وہ جو مسلمانوں پر ظلم کرتے ہیں، ان سے بغض رکھنا ایمان کی علامت ہے اور ان سے کسی قسم کا تعاون حرام ہے۔ اور دوسرا وہ جو مسلمانوں پر ظلم کرنے والے نہیں ہیں تو ان سے نیکی اور حسن سلوک جائز ہے۔

مذہبی، سیاسی اور ریاستی دہشت گردی

دہشت گردی (terrorism) کی فنی تعریفات جو مغرب میں بیان ہوئی ہیں، ایک سو سے کچھ زائد ہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ دہشت گردی ایک ایسا فعل ہے کہ جس سے افراد اور معاشروں میں خوف اور دہشت پھیلے مثلاً ڈکیتی کا عمل دہشت گردی کا عمل ہے کہ اس سے لوگوں کے دلوں میں ڈاکوؤں کا خوف اور دہشت بیٹھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے ایسے دہشتگردانہ افعال کی سزا سورۃ المائدۃ کی آیت 33 میں یہ بیان کی ہے کہ ٹکڑے ٹکڑے کر کے قتل کر دیا جائے یا مخالف سمت سے ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیے جائیں، یا سولی دے دیا جائے یا ملک بدر کر دیا جائے۔

دنیا جس دہشت گردی کو جانتی ہے، وہ مذہبی دہشت گردی ہے۔ اور بدقسمتی سے ہمارے مذہبی حلقوں کو بھی یہ یقین دلا دیا گیا ہے کہ دنیا میں دہشت گردی بس صرف

مذہبی ہی ہوتی ہے حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ دہشت گردی مذہبی، سیاسی، لسانی، اور ریاستی بھی ہوتی ہے۔ ہمیں مذہبی دہشت گردی سے انکار نہیں ہے کہ ہم نے خود سب سے پہلے اس کے خلاف لکھا اور بھرپور لکھا اور ٹی۔ٹی۔پی اور القاعدہ جیسی عسکری تنظیموں کے منہج کا خوب رد کیا۔ لیکن ہم اب یہ بات شدت سے محسوس کر رہے ہیں کہ جس قدر مذہبی دہشت گردی کے خلاف لکھا گیا ہے، اس کا دس فی صد بھی سیاسی اور ریاستی دہشت گردی کے خلاف نہیں لکھا گیا ہے۔ اور ہمارے معاشروں کا ناسور اب مذہبی دہشت گردی سے زیادہ سیاسی اور ریاستی دہشت گردی ہے کہ ضرب عضب وغیرہ سے ہم نے مذہبی دہشت گردی پر کافی حد تک قابو پالیا ہے اور اس کے لیے ہمیں پاکستانی افواج کا شکر گزار ہونا چاہیے۔

سیاسی دہشت گردی وہ ہے کہ جس کی بنیاد سیاسی اختلافات ہوں اور یہ کسی سیاسی پارٹی کی طرف سے ہو رہی ہو جیسا کہ ایم کیو ایم کی دہشت گردی۔ ہر شخص کراچی شہر میں اس سیاسی جماعت کے خوف اور دہشت کی پیدا کی ہوئی فضا کو نہ صرف محسوس بلکہ دیکھ بھی سکتا ہے۔ اور اپنے سیاسی مخالفین کے خلاف یہ فضا انہوں نے اپنے ظلم و ستم سے قائم کی ہے کہ جس میں بھتہ خوری، ناجائز قبضہ، اغواء، قتل و غارت، بوری بند لاشوں سے لے کر ڈرل مشینوں سے زندہ انسانوں کے جسموں میں کیے جانے والے سوراخ تک شامل ہیں۔

اسی طرح بلوچستان میں لسانی بنیادوں پر دہشت گردی ہو رہی ہے کہ پنجاب کا آئی۔ڈی کارڈ دیکھ کر ہی گولی مار دی جاتی ہے کہ مقتول کا جرم صرف پنجابی ہونا ہے۔ سیاسی اور لسانی دہشت گردی کے خلاف بھی اب ریاست حرکت میں آئی ہے لیکن اتنی شدت سے نہیں جتنا کہ مذہبی دہشت گردی کے خلاف ریاست نے کام کیا ہے۔ اور دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اس امتیاز کو مذہبی طبقات بہت شدت سے محسوس کرتے ہیں اور کرنا بھی چاہیے۔ پاکستان کا مطلب کیا، لا الہ الا اللہ، کے نعرے پر وجود میں آنے والی ریاست میں پارلیمنٹ، عدلیہ اور انتظامیہ میں لا الہ الا اللہ کو کیسے اجنبی بنایا جا سکتا

ہے؟ایسا کرنا خود ریاست کا اپنے وجود پر کلہاڑی چلانے کے مترادف ہوگا۔

اور سب سے خطرناک، ریاستی دہشت گردی ہے کہ جب خود ریاست اپنے شہریوں کے لیے یا ایک ریاست دوسری ریاست کے لیے خوف اور دہشت کا نشان بن جائے۔ مذہبی طبقات کا کہنا ہے کہ مذہبی دہشت گردوں کے خلاف ریاستی آپریشن قابل تحسین تھا لیکن اب اس کی آڑ میں کچھ غیر قانونی اور بلا وجہ کی پکڑ دھکڑ شروع ہو چکی ہے کہ جس سے پرامن مذہبی جماعتوں اور تحریکوں کے کارکنان خوف اور دہشت کی فضا میں رہنا شروع ہو گئے ہیں کہ معلوم نہیں کہ کب اور کس جرم میں کہاں سے اٹھا لیا جائے۔

بنگلہ دیش میں جو "جماعت اسلامی" کے ساتھ ہوا اور مصر میں "الاخوان المسلمون" کے ساتھ ہوا تو یہ ریاست کی اپنے پرامن شہریوں کے خلاف دہشت گردی ہے اور یہ دہشت گردی کی بدترین صورت ہے کہ اس کی شنوائی کہیں نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح اسرائیل نے جو کچھ فلسطین اور امریکہ نے جو کچھ افغانستان میں کیا تو یہ ایک ریاست کی دوسری ریاست کے خلاف دہشت گردی ہے اور یہ بھی دہشت گردی کی بدترین صورت ہے۔

پُرامن مذہبی جماعتیں اور اسلامی تحریکیں سوچتی ہیں کہ مذہبی دہشت گردی کے خلاف یہ آپریشن پاکستانی ریاست کو مصر اور بنگلہ دیش جیسے حالات کی طرف نہ لے جائے کہ محض مذہبی جماعتوں اور دینی اداروں کے حق میں بات کرنے سے پہلے آپ کو دس مرتبہ سوچنا پڑے کہ میری اس بات کو معلوم نہیں کتنے حکومتی ادارے مانیٹر کر رہے ہیں۔ مغرب میں بھی مذہبی دہشت گردی کے خلاف جنگ جاری ہے لیکن کم از کم انہوں نے اپنے شہریوں کو انسانی حقوق سے محروم نہیں کیا ہے۔ پس اس وقت پرامن مذہبی طبقات کو اپنے انسانی حقوق کی جنگ لڑنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے، اسلامی حقوق تو بہت بعد کی بات ہے۔

غیر مسلموں کے حقوق اور ان سے تعلقات

غیر مسلم دو طرح کے ہیں؛ ایک وہ جو مسلمان ممالک میں ہیں اور اقلیت میں ہیں اور

دوسرے وہ جو اپنے ہی ملک میں اکثریت میں ہیں۔ جو غیر مسلم اقلیت میں ہیں جیسا کہ پاکستان میں ہندو اور عیسائی تو ان کے حقوق ہیں اور اس سے انکار ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح غیر مسلم سے حسن سلوک کیا جا سکتا ہے اور کاروباری تعلق رکھا جا سکتا ہے، اس میں بھی شک نہیں ہے۔

سنن ابو داؤد کی روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے کہ جس نے کسی معاہد یعنی وہ غیر مسلم کہ جو کسی معاہدے کے تحت مسلمان ملک میں ہو، پر ظلم کیا، یا اس کے حق میں کمی کی، یا اس پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالا، یا اس کی کوئی چیز اس سے چھین لی تو قیامت کے دن میں اس معاہد کا وکیل ہوں گا۔ اسی طرح قرآن مجید میں سورۃ الممتحنہ میں ارشاد ہے: "اللہ عزوجل تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنہوں نے دین کے معاملہ میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔"

سورۃ المائدۃ میں نے یہود ونصاری کی عورتوں سے نکاح کی اجازت دی گئی ہے۔ مسلمانوں نے مدینہ کے یہودیوں کے ساتھ تجارت کی ہے اور انہیں اپنی سروسز فراہم کی ہیں۔ یہودی بچے نے آپ ﷺ کی خدمت کی، اور آپ نے اس کی عیادت فرمائی۔ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کے پاس کثرتیت (pluralism) اور کثیر الثقافتی (multicultural) سوسائٹی میں دوسرے مذاہب کے لوگوں کے ساتھ برداشت اور حسن سلوک کے ساتھ زندگی گزارنے کے حوالے سے اسلامی اصول وضوابط یا تعلیمات نہیں ہیں بلکہ مسئلہ کچھ اور ہے۔

مسئلہ مذہبی نہیں ہے بلکہ معاشرتی اور نفسیاتی ہے۔ مغرب مسلمانوں کو برداشت (tolerance) سکھانا چاہتا ہے کہ مسلمان دوسرے مذاہب کے لوگوں کے بارے میں برداشت پیدا کریں لیکن خود مغرب کا رویہ مسلمانوں کے بارے عدم برداشت کا ہے۔ اسلام دوسرے مذاہب کو برداشت تو کجا، ان سے حسن سلوک کا داعی ہے لیکن

اس عالمی منظر نامے اور سینار یو میں کہ جس میں پوری مسلم دنیا جنگ کی آگ میں جھونک دی گئی ہو، اور اس میں مغرب کا کردار بھی واضح ہے، مسلمانوں سے یہ اپیل کرنا کہ وہ برداشت کا رویہ پیدا کریں، انہیں جذباتی بنا دیتا ہے۔

لیکن میں پھر بھی اپنی قوم کے لوگوں سے یہی کہتا ہوں کہ مغرب میں اسلاموفوبیا یعنی اسلام کا بلاوجہ کا خوف اور اسلام سے نفرت بھی ہے لیکن مغرب سارا برا نہیں ہے۔ ہمیں اس دنیا میں دوسرے مذاہب کے ساتھ مل کر گزارا کرنا ہے۔ ہمیں دنیا کے سامنے اپنا امیج خود بہت بنانا ہے۔ اگرچہ دنیا یہی سمجھتی ہے کہ مسلمان صرف نفرت کرنا جانتے ہیں لیکن ہمیں بحثیت قوم یہ پیغام دوسرے مذاہب کے پیروکاروں تک پہنچانا ہوگا کہ اگر مسلمانوں سے ایک دفعہ محبت کا اظہار کروگے تو یہ تمہیں دومرتبہ پیار دیں گے جیسا کہ ہم نے یہ پیغام بہت اچھی طرح پہنچا دیا ہے کہ اگر ہم سے نفرت کروگے تو ہم تم سے اس سے بڑھ کر نفرت کا اظہار کریں گے۔ یہ پیغام مغرب میں اسلام کے بارے اس بلاوجہ کے خوف کو کم کرنے میں بہت مدد دے گا کہ جس کا یہ نتیجہ ہے کہ ان شاءاللہ! کہنے پر ایک مسلمان نوجوان جہاز سے اتار دیا جاتا ہے۔

پوپ فرانسس اور مسلمان علماء

ایک دوست نے کہا کہ چند ہفتے پہلے پوپ فرانسس نے اپنے مذہبی تہوار کے موقع پر 12 مہاجرین کے نہ صرف پاؤں دھوئے ہیں بلکہ ان کا بوسہ بھی لیا ہے۔ اور ان مہاجرین میں عیسائیوں کے علاوہ تین مسلمان اور ایک ہندو بھی شامل تھے۔ دوست کا سوال ہے کہ کیا پوپ کے جیسی عاجزی اور ہمدردی کا اظہار کبھی کسی معاصر نامور مسلمان عالم دین کی طرف سے دیگر مذاہب کے پیروکاروں کے حق میں دیکھنے کو ملتا ہے؟

جواب: میرے علم میں ہے کہ عیسائیوں میں بہت سے انتہا پسند اور مسلمان دشمن گروہ موجود ہیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ عیسائیوں نے ماضی میں مسلمانوں کا بہت دفعہ اجتماعی قتل عام کیا ہے۔ میں عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں سے بھی واقف ہو۔ ان میں سے بہت سو کا مسلمانوں سے بغض بھی میرے علم میں ہے۔ لیکن اس سب کچھ کے

ہوتے ہوئے پوپ کا اپنے اس عمل کے ذریعے اپنی قوم کے لوگوں کو واضح پیغام دینا کہ یہ سب بھی اسی خدا کے بندے ہیں کہ جس کے ہم ماننے والے ہیں۔ اور اسی طرح ہمارے لیے قابل احترام ہیں جیسا کہ ہمارے اپنے مذہب کے لوگ تو یہ واقعتاً ایک قابل تحسین اور قابل رشک امر ہے۔

اور صحیح بات تو یہ ہے کہ جس کے کہنے میں حرج نہیں ہے کہ مسلمانوں میں اس کا تصور بھی ممکن نہیں ہے کہ پوپ کے مقام اور مرتبے کا کوئی عالم دین کسی عام عیسائی کے پاؤں دھوئے گا۔ تبلیغی جماعت کے رہنما حاجی عبد الوہاب صاحب جیسے شاید تیار ہو جائیں لیکن مسلم معاشرے میں اس کے ممکنہ رد عمل کے خوف سے عملاً کبھی بھی ایسا کرنے کی جرات نہ کر پائیں۔

ہم تو ابھی عیسائیوں کے ساتھ مل بیٹھ کر کھانا کھا لینے کے جواز اور عدم جواز سے نہیں نکل رہے۔ اور یہ پوپ ہی کا حوصلہ ہے کہ وہ دیگر مذاہب کے پیروکاروں کے پاؤں دھونے اور ان کا بوسہ لینے تک جا پہنچا ہے۔ اور یہ پوپ اس قابل ہے کہ ایک مسلمان کے پاؤں دھونے کے بدلے میں اس کے پاؤں دو مرتبہ دھوئے جائیں۔

اسی لیے تو اللہ عزوجل نے عیسائیوں کے بارے سورۃ المائدۃ میں ارشاد فرمایا ہے:
"ایمان لانے والوں کے لیے دوستی میں قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جنھوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ ان میں عبادت گزار عالم اور تارک الدنیا فقیر پائے جاتے ہیں اور اُن میں غرور نفس نہیں ہے۔" بلاشبہ پوپ فرانس بھی انہی عیسائی رہنماؤں کی طرح ہیں کہ جو ہرقل روم، مقوقس مصر اور نجاشی حبشہ کی طرح اسلام کے بارے نرم گوشہ رکھتے تھے اور ان عیسائی راہبوں میں سے ہیں کہ جو عاجزی کا اظہار کرنے والے ہیں اور متکبر نہیں ہیں۔

کشمیر کا جہاد

دوست کا کہنا یہ ہے کہ کشمیر کے جہاد کے بارے آپ کی کیا رائے ہے؟ جواب: اس میں کوئی دو رائے نہیں ہیں کہ ہم پاکستانیوں کے دل کشمیریوں کے ساتھ دھڑکتے ہیں،

ہم ان کی تحریک آزادی کے حامی ہی نہیں بلکہ پرجوش مبلغ بھی ہیں۔ کشمیر تو کیا، فلسطین، افغانستان اور برما کے مسلمانوں کے لیے بھی ایک آزاد اور خود مختار ریاست کے قیام کے ہم سب حامی ہیں لیکن اختلاف صرف طریق کار اور اسٹریٹیجی کا ہو سکتا ہے۔

یہ دنیا فساد کے لیے بنی ہے لہذا اس سے بڑا بے وقوف کوئی نہیں ہے جو یہ کہے کہ اسلام میں جہاد و قتال نہیں ہے۔ فرشتوں نے تو ابتدا میں ہی کہہ دیا تھا کہ انسان تو خون ریزی کرے گا اور فساد برپا کرے گا۔ اور جہاں فساد ہو گا، وہاں قتال ہو گا۔ حضرت عیسی بن مریم علیہ السلام کا نزول جب "دمشق" میں ہو گا تو اس وقت مسلمان حالت جنگ میں ہوں گے۔ اس دنیا کی ابتداء وانتہاء جنگ وجدال ہے، اس کی تقدیر قتل وقتال ہے۔

بہت کم لوگوں کے علم میں ہے کہ فرائیڈ نے جنگ عظیم اول کے بعد اپنے نظریہ "جنس" کی جگہ نظریہ "جنگ" کو پیش کیا تھا اور اسے انسان کی تقدیر قرار دیا تھا جبکہ اس کا شاگرد ایڈلر تو نظریہ حب تفوق (urge to dominate) کے تحت پہلے ہی سے اس کا قائل تھا کہ انسان کی سب سے قوی جبلت اور خواہش جنگ وجدال ہی کی ہے۔ یہ دنیا کشمکش کے لیے بنی ہے۔ یہ میدان جنگ تھا، ہے، اور رہے گا۔ ہیگل اور کارل مارکس تک نے اپنے فلسفوں کی بنیاد جدلیات (dialectics) کو بنایا۔

لیکن اس سب کچھ کے باوجود ہمیں دو باتیں کہنی ہیں کہ ایک تو جہاد وقتال کی ذمہ داری مسلم ریاستوں کی ہے نہ کہ پرائیویٹ عسکری جماعتوں کی۔ پرائیویٹ عسکری تنظیمیں ایک تو اس کی اہلیت اور استطاعت نہیں رکھتیں لہذا نقصان زیادہ کرتی ہیں اور دوسرا فہم وفراست اور ایک نظم نہیں رکھتیں لہذا آپس میں لڑنا شروع ہو جاتی ہیں۔ افغانستان میں روس کے جانے کے بعد یہی ہوا کہ وہاں کی جہادی جماعتیں آپس میں لڑنا شروع ہو گئیں اور عظیم جہاد، عظیم فساد بن گیا۔ عراق، شام، لیبیا اور یمن میں یہی ہو رہا ہے کہ جہادی تنظیمیں آپس میں بھی لڑ رہی ہیں۔

96ء میں جبکہ میں اٹک گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج میں فرسٹ ایئر کا طالب علم تھا کہ ایک بہت ہی معروف کشمیری جہادی تحریک کے سپریم کمانڈر، میں نام نہیں

لیتا، تشریف لائے، جہاد کے لیے موٹیویٹ کیا اور یوں نقشہ کھینچا کہ جیسے اس جہاد کے نتیجے میں کل ہی کشمیر آزاد ہو جائے گا۔ سوال وجواب کے سیشن میں ایک طالب علم نے سوال کیا کہ اس کی کیا ضمانت ہے کہ کشمیر میں لڑنے والی چودہ جہادی تنظیمیں کشمیر کی آزادی کے بعد آپس میں نہیں لڑیں گی؟ جیسا کہ یہ افغانستان میں اقتدار کے لیے لڑ چکے ہیں۔ تو ان سپریم کمانڈر کا جواب تھا کہ ہم نے کشمیر کو چودہ حصوں میں بانٹ رکھا ہے۔ انا للہ وانا الیہ رجعون۔ اب آپ مجھ سے یہ امید رکھتے ہیں کہ میں ایسے "بھولوں" کے جہاد کی تائید کروں گا؟

اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ فیصلہ کہ کسی قوم نے جنگ کرنی ہے یا نہیں، یہ پوری قوم کا فیصلہ ہونا چاہیے یا ان کی اکثریت کا۔ بھئی، کشمیریوں نے یہ فیصلہ کرنا ہے کہ انھوں نے لڑنا ہے یا نہیں؟ انہیں یہ فیصلہ کرنے دیں۔ میں اور آپ چھاپہ مار کاروائیاں کر کے ان کے لیے مزید مشکلات پیدا کر دیں، تو یہ درست نہیں ہے۔ اگر وہ سب لڑنا چاہتے ہیں تو ہم ان کے ساتھ ہیں۔ اگر وہ سب پر امن جدوجہد سے آزادی چاہتے ہیں تو ہم ان کے ساتھ ہیں۔ یہ فیصلہ اس قوم کو کرنے دیں، جس کا مسئلہ ہے، آپ ان کے چاچے مامے نہ بنیں۔ ہوتا اصل میں یہ ہے کہ قوم لڑنا نہیں چاہتی اور جنگجو آنہ طبیعت کے چند مسلمان جہادی جماعتیں بنا کر ان کے نمائندہ بن کر لڑائی چھیڑ دیتے ہیں اور ان بیچاروں پر ظلم وستم اور بڑھ جاتا ہے۔

اسی لیے ابو بصیر رضی اللہ عنہ نے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ مجھے چند جوان دے دیں تو میں آپ کو مکہ فتح کر دیتا ہوں تو آپ نے جواب دیا تھا کیا یہ شخص جنگ کی آگ بھڑکانا چاہتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت جنگ سے اجتناب کیا کہ قوم کی تیاری نہیں تھی اگرچہ کچھ جوان اپنی چھاپہ مار کاروائیوں سے امید لگائے بیٹھے تھے کہ دشمن کو فتح کر لیں گے لیکن آپ نے ان پر اعتماد نہ کیا اور ان کے اس فعل کی مذمت کی۔ غزوہ بدر، احد، خندق حتیٰ کہ کون سی جنگ ہے کہ جس سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری قوم کو اعتماد میں نہ لیا ہو؟ قوم نے آزادی حاصل کرنی ہے تو فیصلہ بھی قوم ہی کرے کہ لڑائی کے ذریعے

حاصل کرنی ہے یا پر امن جدوجہد سے۔

غزوہ ہند کے بارے احادیث

ایک دوست نے غزوہ ہند کے بارے مروی احادیث کی صحت کے حوالے سے سوال کیا ہے۔اس بارے عام طور پانچ روایات بیان کی جاتی ہیں کہ جن میں غزوہ ہند کی فضیلت کا بیان ہے۔ان پانچ میں سے چار روایات محققین کے نزدیک ضعیف ہیں جبکہ ایک روایت صحیح ہے۔

غزوہ ہند کے بارے وہ روایت کے کہ جسے علامہ البانی رحمہ اللہ نے صحیح قرار دیا ہے، وہ یہ ہے کہ ثوبان رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت کے دو گروہ ہیں جن کو اللہ آگ سے بچائے گا ایک وہ جو اہل ہند سے لڑے گا اور دوسرا وہ جو عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کے ساتھ ہو گا۔ یہ سنن النسائی کی روایت ہے اور یہ بھی کوئی بہت اعلی درجے کی صحیح روایت نہیں ہے۔

جماعۃ الدعوۃ کے پلیٹ فارم سے دار الاندلس نے "غزوہ ہند" کے نام سے جو ایک کتابچہ شائع کیا ہے تو اس میں احادیث کی تحقیق میں بہت ہی غیر ذمہ دارانہ رویے کا اظہار کیا گیا ہے۔ مولف نے تین صریح ضعیف روایات کو اپنے کتابچے میں بیان تو کر دیا ہے لیکن ان تینوں روایات پر موجود جرح کو بیان نہیں کیا کہ جس سے قاری کو یہ تاثر ملتا ہے کہ یہ روایات صحیح ہے۔بقیہ دو روایات میں سے ایک روایت حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ والی تو صحیح ہے لیکن دوسری حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ والی ضعیف ہے۔

اب اس میں دوسری حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ کی روایت کو بھی شیخ احمد شاکر رحمہ اللہ نے تو صحیح کہا ہے لیکن بقیہ محققین نے اسے ضعیف کہا ہے۔ لیکن "غزوہ ہند" نامی کتابچے کے مولف نے شیخ احمد شاکر رحمہ اللہ کا حکم تو بیان کر دیا لیکن دیگر محققین نے اسی روایت پر جو جرح کی ہے اور اس کی بنیاد پر اس روایت کو ضعیف کہا ہے تو نہ تو ان محققین کا اجمالی حکم نقل کیا ہے اور نہ ہی ان کی تفصیلی جرح کا جواب دیا ہے کہ جس سے قاری کو دوبارہ یہ تاثر ملتا ہے کہ اس روایت کی صحت پر کوئی سوال نہیں ہے۔

اسی طرح غزوہ ہند کے حوالے سے مسند اسحاق بن راہویہ کی ایک روایت جو کہ بہت معروف ہوئی، یہ ہے کہ مسلمان ہندوستان سے جہاد کریں گے اور سندھ کے بادشاہوں کو زنجیروں میں جکڑ کر لائیں گے اور جب وہ واپس آئیں گے تو عیسی ابن مریم علیہ السلام کو شام میں پائیں گے۔ یہ روایت بھی ضعیف ہے۔ پس غزوہ ہند کی روایات کو بنیاد بنا کر کوئی قطعی بات کرنا ممکن نہیں ہے کہ اسناد بھی ضعیف ہیں اور متون بھی واضح نہیں ہیں جیسا کہ اسی روایت میں ہے کہ جہاد تو ہندوستان سے ہو گا لیکن قیدی سندھ کے بادشاہ بنائے جائیں گے۔

البتہ غزوہ ہند کی تمام روایات کے متون کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے کہ قیامت سے پہلے حضرت عیسی علیہ السلام کے نزول کے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت ہندوستان سے جہاد کرے اور اس کے نتیجے میں ہندوستان کے بادشاہوں کو قید کرے۔ لیکن یہ قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہو گی، اس سے پہلے ان احادیث کا ہندوستان سے مسلمانوں کی کسی جنگ پر اطلاق کرنا قطعی طور غلط ہے اور جماعتی سیاست کے زمرے میں داخل ہے۔

مسلمانوں کے مسائل کا حل: دعوت و تبلیغ یا جنگ وجدال

اس تحریر کی حیثیت اس نکتے پر مکالمے کا آغاز کرنے کی سی ہے کہ مسلمانوں کے لیے حالیہ پستی وذلت اور ظلم و ستم سے نکلنے کا رستہ جنگ وجدال ہے یا تحمل و برداشت۔ اس میں اصولی طور دونوں رایوں کی گنجائش ہے کہ شریعت میں دونوں مناہج موجود ہیں۔ پس یہ کہنا درست نہیں ہے کہ اب قیامت تک جہاد وقتال کا منہج ہی باقی ہے اور صبر ومصابرت یا دعوت و تبلیغ یا تعلیم وتزکیہ کوئی منہج نہیں ہے۔

مکی اور مدنی منہج میں واضح فرق موجود ہے کہ مکہ کا ماڈل صبر اور دعوت کا ہے اور مدینہ کا جہاد اور قتال کا۔ اور یہ دونوں ماڈل قیامت تک کے لیے امت کے لیے اسوہ حسنہ ہیں۔ ان میں کسی ایک کو منسوخ کرنے کا اختیار کسی کو بھی حاصل نہیں ہے البتہ کوئی شخص امت مسلمہ کے مجموعی حالات کے تناظر میں کسی ایک ماڈل کو امت کے مسائل

کے حل کے لیے فی الوقت بہترین ماڈل کے طور تجویز کر سکتا ہے۔

مجھے اس وقت اپنے دوستوں پر اپنی رائے کو تھوپنا نہیں ہے بلکہ صرف یہ بیان کرنا ہے کہ اس امت میں دونوں مزاج موجود ہیں۔ دعوت و تبلیغ کا بھی اور جہاد و قتال کا بھی۔ دونوں قسم کے مزاج اپنی جماعتوں اور تحریکوں کی صورت میں کام کر رہے ہیں۔ بہت سے لوگ اس بات سے اتفاق کریں گے کہ امت کے مسائل کا حل جنگ وجدال میں ہے۔ اور کچھ میری طرح بھی سوچ رہے ہوں گے کہ نہیں اس وقت دعوت تبلیغ ہماری اصل ضرورت ہے کہ ہمارے حالات مکی دور سے زیادہ ملتے ہیں۔ آپ ہم پر تنقید کریں، ہم آپ پر کریں لیکن مہذب انداز میں، لٹھ نہ ماریں۔

دوسری اور اہم تر بات یہ ہے کہ جو لوگوں کو سمجھ نہیں آتی کہ جنگ صرف ہتھیار اٹھانے کا نام نہیں ہے مثلاً سرد جنگ (cold war) کو ہی دیکھ لیں۔ بڑی طاقتیں اب اس طرح جنگ لڑتی ہیں جبکہ ہم ابھی تک جنگ کے پرانے طریقوں کو سینوں سے لگائے بیٹھے ہیں۔ دعوت تبلیغ والوں نے کم از کم دعوت تبلیغ کے طریقے سیکھ لیے ہیں لیکن جنگ وجدال والے ابھی جنگ وجدال کے طریقے سیکھ نہیں پائے لہذا امت کا نقصان زیادہ ہو رہا ہے۔ یہ متبادل آپشنز پر غور ہی نہیں کرتے۔ کیا پاکستان کسی جہاد و قتال کے نتیجے میں ملا ہے؟ جہاد و قتال تو 1857ء کی جنگ آزادی میں ناکام ہو گیا تھا۔ ان میں جذباتیت زیادہ ہے اور حقائق سے بہت دوری ہے۔ ہر حادثے پر شکوہ یہ ہے کہ یہودی سازش ہے، لہذا مسلمان ذلیل وخوار ہیں۔ بھائی، تم بھی سازشیں کر لو، تمہیں کسی نے منع کیا ہے؟ یہودی دنیا کی آبادی کا ایک فی صد بھی نہیں ہیں لیکن امریکہ پر حکومت کر رہے ہیں۔ یہ جنگ ہوتی ہے اور اسے فتح کہتے ہیں۔

دعوی یہ ہے کہ افغان جنگ ہم نے جیت لی ہے حالانکہ اس جنگ میں امریکہ کے اڑھائی ہزار بھی مردار نہیں ہوئے۔ امریکہ آج بھی سپر پاور ہے جبکہ افغانستان کھنڈر بن چکا ہے، آج بھی لوگ اس کے ویزے کو ترستے ہیں، آج بھی وہ سائنسی علوم کا مرکز ہے۔ ہم نے تو یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ شاید روس ختم ہو گیا ہے لیکن اس خطے کی نئی صف بندی اور

وہ بھی روس کی سرپرستی میں یہ ظاہر کر رہی ہے کہ ہماری وہ سوچ بھی غلط تھی۔ ہمارا حال یہ ہے کہ کوئی ہمارے گھر کو بلڈوزر چڑھا کر ملیا میٹ کر دے اور ہم اسے پتھر ماریں کہ جن میں دو چار اس کے بلڈوزر کو لگیں اور دو چار اسے لگیں اور وہ وہاں سے نکل جائے تو ہم کہتے ہیں کہ ہم جیت گئے ہیں۔ ہاں، مظلوم قوموں کے ہاں جیت اور فتح کے الفاظ کے معانی بھی کتنے محدود ہوتے ہیں!

جنگجو مسلمانوں کی خدمت میں

بھائی! جنگیں لڑنے سے خدا اور اس کے رسول نے منع نہیں کیا لیکن جیسے تم لڑتے ہو تو اس طرح لڑنے سے ضرور منع کیا ہے۔ امریکہ اور روس پچھلے سو سال سے جنگ لڑ رہے ہیں، میچور قومیں اس طرح جنگیں لڑتی ہیں، جیسے وہ لڑ رہے ہیں۔ پہلے ویت نام میں لڑے، پھر افغانستان میں اور آجکل شام میں لڑ رہے ہیں۔

انہوں نے سو سالہ جنگ میں اپنی زمین کو میدان جنگ نہیں بننے دیا اور تم نے بیس سالوں میں سارا عالم اسلام میدان جنگ بنا دیا ہے۔ ایسے میں تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ جنگیں نہ لڑو، پہلے لڑنے والوں سے لڑنا سیکھ لو۔ جب آ جائے تو پھر یہ شوق بھی پورا کر لینا۔ میرے بچے کو لڑنا نہ آتا ہو اور میں اسے موٹیویٹ کر کے گلی میں بھیج دوں کہ محلے کے ان لڑکوں سے جا کر زور آزمائی کرو جو تمہیں تنگ کرتے ہیں تو وہ مار کھا کر ہی واپس آئے گا، یہ بات ہمیں کیوں سمجھ نہیں آ رہی۔

بے وقوفوں کی طرح "جہاد قیامت تک جاری رہے گا" کے نعرے لگاتے رہو گے تو دنیا میں مزید مار کھاؤ گے۔[1] تمہارا ہر ملک حالت جنگ میں ہے اور ان کا ہر شہر حالت امن میں ہے۔ اور نتیجہ کیا ہے، سب کے سامنے ہے کہ تم ہی قاتل بھی ہو اور مقتول بھی اور وہ اسلحہ بیچنے والے۔ تم پناہ گزین ہوں اور وہ پناہ دینے والے۔ تم زخمی ہو اور وہ تمہیں اٹھانے والے۔ ہمیں یہ نعرہ لگانا ہے لیکن ان کے کہنے پر نہیں بلکہ اس وقت جبکہ ہماری تیاری مکمل ہو۔

---

[1] واضح رہے کہ ان الفاظ کے ساتھ منقول روایت ضعیف ہے۔

ایسے حالات میں دوسروں سے یہ شکوہ رکھنا کہ انہوں نے ہم پر جنگ مسلط کی ہے، اور بھی بڑی بے وقوفی ہے۔ لیبیا، یمن اور شام کی جنگیں ہماری اپنی جنگیں ہیں۔ سعودی عرب، ایران، ترکی اور پاکستان سب اِن ایکشن ہیں۔ جنگیں تو ہم لڑ ہی رہے ہیں، لیکن ہم جنگوں سے امت کے مسائل حل نہیں کر پائے بلکہ بڑھا چکے ہیں۔

ہمیں آپریشن جبرالٹر، کارگل اور نائن الیون ایسی شرارتوں سے باز آنا ہو گا کہ جن کے نتیجے میں جنگ کی آگ بھڑک اٹھتی ہے اور بعد میں ہم بھولپن سے یہ دعوی کر رہے ہوتے ہیں کہ فلاں نے ہم پر جنگ مسلط کر دی ہے۔ ہمیں فی الحال جنگوں کے علاوہ رستوں سے مسلمانوں کے مسائل کا حل تلاش کرنا ہے۔ دعوت تبلیغ کا رستہ، خدمت خلق اور اخوت کا رستہ، تعلیم و تحقیق کا رستہ، معاشی خوشحالی کا رستہ، خطے میں نئی صف بندی کا رستہ، ڈپلومیسی کا رستہ وغیرہ وغیرہ۔

روہنگیا مسلمانوں کے مسائل کا حل کیا محض عسکری گروپ بنا کر چھاپہ مار کاروائیاں کرنے میں ہی ہے؟ ایسی کاروائیوں کا نتیجہ ہم کشمیر میں بھی دیکھ لیا ہے کہ مسلمانوں پر ظلم اور بڑھ گیا۔ کیا تم سب مل کر روہنگیا مسلمانوں کے لیے سمندر میں ایک جزیرۃ یا افریقہ میں ایک صحراء نہیں خرید سکتے کہ جہاں ان کی الگ ریاست قائم کر سکو۔ تم یقیناً ایسا کر سکتے ہوں لیکن تمہارا امزاج ایسا بنا دیا گیا ہے کہ ہر شخص پھٹنے کو تیار بیٹھا ہے تو ایسے میں جنگ ہی تمہاری تقدیر ہے۔ اس سے انکار نہیں ہے لیکن تم پھٹو یا مرو، ہو ہمارے ہی۔ ہم تمہارے ساتھ تمہارے لیے روتے رہیں گے۔

تم نے سیرت کو ہمیشہ جنگجو آنہ نظر سے دیکھا ہے اور اسی نظر سے پڑھا بھی ہے اور اسی نظر سے کتابیں مرتب کر دی ہیں اور یہ سیرت کا ایک اہم پہلو ہے لیکن کبھی اس نظر سے بھی سیرت کا مطالعہ کر لو کہ صلح حدیبیہ بھی ہوئی ہے اور میثاق مدینہ بھی ہے۔ بس آپ ﷺ حکیم تھے لہذا یہودیوں اور مشرکین مکہ سے بھی وقت پڑنے پر صلح کر لیتے تھے لیکن آج وہ حکمت اور دانائی کہاں؟ اس سے بڑا کوئی فتنہ نہیں ہے کہ جہاد و قتال کے بارے قرآنی آیات کو سیرت نبوی کی عینک لگائے بغیر پڑھا اور بیان کیا جائے۔ اور یہ

امت اس فتنے میں پڑ چکی ہے۔

مستقبل کی سپر پاور

مستقبل میں عالمی قیادت اور سپر پاور بننے کے لیے اہل ترین قوم وہی ہو گی جو آج اپنے آپ کو جنگ سے بچا پائے گی۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو سب بڑی طاقتوں کو سمجھ آچکی ہے اور خوشی کی بات ہے کہ مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے کو بھی سمجھ آرہی ہے۔

وہ ظالم اسے عرب بہار (Arab Spring) کہتا رہا لیکن یہ امت کے حق میں ایک ایسی خزاں ثابت ہوئی کہ سارا مڈل ایسٹ کھنڈر بن چکا یا بننے کے دھانے پر کھڑا ہے۔ لیبیا میں تین اور یمن میں دو حکوتیں قائم ہو گئیں۔ عراق میں تین اور شام میں چار حکومتیں بن گئیں۔ اور سب آپس میں لڑ رہے ہیں۔ یہ عرب میں بہار آئی ہوئی ہے۔ ظلم کے خلاف جدوجہد نے اور ظلم پیدا کر دیا ہے۔

ہمیں مسلم معاشروں میں ہونے والا ظلم ضرور ختم کرنا ہے اور اس کے خلاف آواز بھی بلند کرنی ہے لیکن اس طرح نہیں جیسے وہ ظالم چاہتے ہیں کہ ان کا مقصد یہ ہے کہ ظلم کو اس طرح ختم کیا جائے کہ مزید ظلم پیدا ہو۔اس وقت نکتہ ایک ہی ہے کہ مسلمانوں کو اگر عالمی قیادت چاہیے تو اس وقت ہر قسم کے جنگ وجدال سے بچنا ہو گا، آپس میں بھی اور دوسروں سے بھی۔ باقی خطے میں نئی صف بندی کریں، سیاسی چالیں چلیں، معاشی اور عسکری طور مضبوط ہوں، خارجہ پالیسی پر نظر ثانی کریں، خطے میں نئی صف بندی کریں اور دعوت و تبلیغ میں تیزی لائیں تو یہ سب تو کرنے کے کام ہیں ہی۔

دہشت گردی اور انتہا پسندی کے خلاف جنگ کے نتائج

دہشت گردی اور انتہا پسندی کے خلاف جنگ ہونی چاہیے، اس میں تو کوئی دو رائے نہیں ہیں لیکن ہمارے ہاں اس جنگ کے نتائج بڑے دلچسپ نکل رہے ہیں۔ایک نتیجہ تو یہ ہے کہ اب ماحول کچھ ایسا بنتا چلا جا رہا ہے کہ جہاد، خلافت، کتاب وسنت کے نفاذ، غلبہ دین، اتحاد امت کے تصورات اجنبی بنتے چلے جا رہے ہیں یعنی آپ کے لیے ان اصطلاحات اور اس حوالے سے کسی پر امن جدوجہد (soft revolution) کی بات

کرنا بھی انتہا پسندی میں شامل ہوتا چلا جارہا ہے۔ اور دہشت گردی کے خلاف جنگ کا مطلب سیکولرازم کا فروغ بنتا چلا جارہا ہے نہ کہ اسلام کے صحیح تصور کی تبلیغ۔

امر واقعہ یہی ہے کہ داعش کی خلافت اور ٹی ٹی پی کا جہاد دیکھنے کے بعد کسے خلافت اور جہاد کے تصورات میں رغبت محسوس ہو گی؟ عام آدمی کے سامنے خلافت اور جہاد کے یہ جو دو نئے ورژن آئے ہیں، وہ اس سے وحشت میں مبتلا ہو گیا ہے اور اسے ہونا بھی چاہیے کہ خلافت راشدہ میں نہ تو ایسی خلافت تھی اور نہ ہی ایسا جہاد۔ اور رہی حکومتیں تو انہیں تو پہلے ہی کوئی بہانا چاہیے تھا کہ یہ تصورات عام نہ ہو سکیں کہ ان تصورات کے عام ہونے سے ان کی بادشاہتوں اور سلطنتوں کو خطرہ لاحق ہوتا ہے۔

حل اس کا یہی ہے کہ خلافت اور جہاد کے غلط تصورات کی نفی کی جائے، ان سے اعلان براءت کیا جائے اور یہ مان لیا جائے کہ یہ فتنے خلافت اور جہاد کے تصورات کو مسخ کرنے کے لیے وقت کی سپر پاورز نے پیدا کیے ہیں۔ اور اس کے بعد خلافت اور جہاد کے مثبت تصورات کو واضح کیا جائے۔ آج لوگ خلافت کا مطلب ڈنڈے کی شریعت کا نفاذ سمجھتے ہیں، انہیں بتلائیں کہ خلافت تو ایک ویلفیئر اسٹیٹ کا نام ہے کہ جس میں ہر شخص کے معیار زندگی کو بلند اور بنیادی ضروریات مثلاً رہائش، کھانا، تعلیم، صحت، سیکورٹی وغیرہ کو پورا کرنا ریاست کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

کیا یہ سب خلافت راشدہ میں نہیں تھا؟ کیا خلافت راشدہ صرف چند حدود کے نفاذ کا نام تھا؟ کیا خلافت راشدہ میں اتنی معاشی خوشحالی نہ تھی کہ زکوۃ وصول کرنے والے نہ ملتے تھے؟ کیا خلافت راشدہ میں بے روزگاروں کو الاؤنس نہیں ملتا تھا؟ کیا خلافت راشدہ میں اتنا امن نہیں تھا کہ ایک عورت زیورات سے لدی پھندی یمن سے سفر کرتی اور مکہ پہنچتی اور کوئی اس کی طرف میلی آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرات نہ کرتا؟ یہ سب اگر خلافت راشدہ میں موجود تھا۔ اور ہم ایسی ہی خلافت کے قیام کے داعی ہیں تو ہم خلافت کا نعرہ لگاتے وقت لوگوں کو یہ تاثر کیوں دیتے ہیں کہ جیسے خلافت چار پانچ حدود کے لاگو کرنے کا ہی نام ہے! خلافت تو دراصل لوگوں کی دنیاوی فلاح و بہبود کا نام ہے، ان کی دنیا

بہتر بنانے کا نام ہے۔ حدود کا نفاذ بھی جرائم کو کم کرنے اور سیکورٹی اور امن وامان کو بہتر بنانے کے لیے ہی ہے۔

دوسری طرف ریاستی اداروں کا معاملہ یہ ہے کہ جہاں خلافت، جہاد، نفاذ شریعت کا لفظ دیکھا تو کتاب بین کر دی، یہ دیکھے سمجھے بغیر کہ اس میں کیا پیش کیا گیا ہے۔ وہ کتاب کے ٹائیٹل میں صرف داعش اور طالبان کا لفظ دیکھتے ہیں تو آپ کا پیچھا شروع کر دیتے ہیں لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ آپ نے پوری کتاب داعش اور طالبان کے خلاف لکھی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مذہبی طبقے میں معتدل مزاج علماء نے انتہا پسندوں کے خلاف لکھنا اور بولنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ اب مارکیٹ میں خلافت اور جہاد کا تصور بتلانے والے صرف انتہا پسند رہ گئے ہیں۔ بس، ایک عجیب ہی صورت حال سے ہم گزر رہے ہیں۔

مسلمان اور یہودی

ٹرمپ کے سات مسلمان ممالک کے شہریوں کے امریکہ میں داخلے پر پابندی کے اعلان کا سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات نے خیر مقدم فرمادیا ہے۔ امریکہ نے غیر سرکاری طور پاکستانی ریاست کو دھمکی لگائی کہ اگر جماعت الدعوۃ اور فلاح انسانیت فاؤنڈیشن کو بین نہ کیا گیا تو پاکستان بھی ان ممالک کی فہرست میں شامل ہو جائے گا، لہذا پاکستان نے پابندی لگا دی ہے۔

امریکہ میں مسجد کے جلائے جانے پر یہودیوں نے مسلمانوں کو پیش کش کی ہے کہ وہ ان کے سینیگاگ میں عبادت کر لیں۔ واضح رہے کہ یہ بھی دعوی کیا گیا ہے کہ مسجد جلانے والا ایک شرابی نو مسلم تھا۔ سٹار بکس کے مالک، کٹر یہودی اور اسرائیل نواز بزنس مین، ہاورڈ شلٹز نے ٹرمپ کے فیصلے کے بعد دس ہزار مسلمان مہاجرین کو اپنی فرم میں نوکری دینے کا اعلان کر دیا۔

پروردگار! یہ ہو کیا رہا ہے؟ دوسری قسم کی خبروں کو یہودی سازش کہہ دیں لیکن پہلی والی خبروں کی کیا توجیہ ہے؟ نیو یارک، نیو جرسی، ورجینیا، لاس اینجلس، شکاگو، سانس فرانسسکو میں مسلمانوں کا ایئر پورٹس پر استقبال ہو رہا ہے۔ اور لندن، مانچسٹر اور

گلاسگو مسلمانوں کے حق میں باہر نکل آئے ہیں۔ اور سعودی وزیر یہ فرمارہے ہیں کہ امریکی قوم نے مسلمانوں پر پابندی لگا کر اپنا حق استعمال کیا ہے!

تحریک آزادی اور روہنگیا

روہنگیا کے مسئلے کے جتنے حل پیش کیے گئے ہیں، ان میں سے اب تک کا بہترین اور قابل عمل حل یہی ہے کہ ہر ملک میں "میانمار" کے سفارت خانے کے باہر احتجاج کیا جائے۔ ملحق امیج میں جرمنی کے مسلمان "میانمار" کے سفارت خانے کے باہر احتجاج کرتے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔

پرائیوٹ عسکری تنظیموں کا جہاد اس مسئلے کا حل نہیں ہے۔ اس جہاد کے نتیجے میں آپ دو دن خوشی منائیں گے کہ مجاہدین نے ستر کافر پھڑکا دیے اور پھر دو ہفتے روئیں گے کہ مسلمانوں کی ستر بستیاں جلادی گئیں، ستر ہزار مسلمان بے گھر ہو گئے، دس ہزار شہید ہو گئے وغیرہ جیسا کہ اب کی بار بھی پچھلے چار ہفتوں کی فیس بک ہسٹری کھنگال لیں۔ بات جہاد کے جواز اور عدم جواز کی نہیں ہے، بات کسی قابل عمل حل کی ہے۔

رہی مسلمان حکومتیں تو وہ اس مسئلے کو حل تو کر سکتی ہیں لیکن ان سے کوئی امید رکھنا بے کار ہے سوائے اس کے آپ پاکستانی اپنے ووٹ کا اعلان اس سیاسی جماعت کے حق میں کر دیں جو روہنگیا کے مسئلے کو اپنی فارن پالیسی کی ترجیحات میں شامل کرنے کا اعلان کرے۔ اور بڑی طاقتوں سے تو اس سے بھی زیادہ ناامیدی ہے سوائے اس کے کہ چین کی برما میں بھاری سرمایہ کاری کے خلاف امریکہ کا کارڈ استعمال کر لیا جائے اور وہ اسی بنیاد پر استعمال ہو بھی رہا ہے۔

مسئلے کا فوری حل تو یہی ہے کہ "میانمار" کے سفارت خانوں کے باہر احتجاج کیے جائیں اور یہ احتجاج "آپ" نے کرنا ہے، یہ ذہن میں رہے۔ مذہبی جماعتوں سے اس کی امید نہ لگائیں۔ وہ صرف اپنا فائل ورک مکمل کرنے کے لیے احتجاج کرتی ہیں کہ ریکارڈ پر آجائے کہ ہماری جماعت نے بھی مسلمانوں کے حق میں کچھ کہا ہے یا یہ کام کیا ہے۔ آپ کے اس احتجاج سے اس مسئلے کو کم از کم اس دجالی میڈیا میں کوئی کوریج تو مل جائے

گی۔

اور مستقل حل یہ ہے کہ اگر کر سکتے ہوں تو روہنگیا کے مسلمانوں میں وہ سیاسی شعور بیدار کریں کہ جو برصغیر کے مسلمانوں کو حاصل رہا تا کہ وہ ایک آزاد ریاست کے قیام کے لیے پر امن اور احتجاجی سیاسی جدوجہد کا آغاز کر سکیں اور پھر اس کے لیے قربانیاں دیں کہ پاکستان بھی قربانیوں کے بغیر وجود میں نہیں آیا۔ اس مسئلے کے حل کا رستہ وہی ہے کہ جس سے پاکستان حاصل ہوا ہے یعنی "تحریک آزادی"۔ ذہن میں رہے کہ ان حالات میں ہمیں "عطاء اللہ" کے جہادی جذبے کی نہیں بلکہ "محمد علی جناح" کی سیاسی بصیرت کی ضرورت ہے۔

❁❁❁❁❁❁❁

باب چہاردہم

اعلام اور شخصیات

اس باب میں اعلام اور شخصیات سے متعلق بنیادی سوالات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

والدہ محترمہ

والدہ محترمہ کا تعلق مقبوضہ جموں و کشمیر سے ہے۔ وہ بتلاتی ہیں کہ قیام پاکستان سے پہلے ہی ان کا خاندان، جو کہ مسلکاً اہل تشیع ہیں، ہجرت کر کے پاکستان آگیا تھا اور قیام پاکستان کے وقت ان کی عمر کوئی سات آٹھ برس تھی۔ کچھ رشتہ دار "بٹنگیاں" آزاد کشمیر میں آباد ہوئے اور کچھ نے پنجاب میں واہ فیکٹری، تلہ گنگ اور پنڈی گھیب کو مسکن بنایا۔ ہماری والدہ بالکل بھی پڑھی لکھی نہیں ہیں؛ نہ اسکول کا اور نہ ہی مدرسے کا۔ اپنا نام لکھنا تو دور کی بات، اتنی بھی صلاحیت نہیں ہے کہ اپنا لکھا ہوا نام پڑھ سکیں لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنی اولاد کی پڑھائی پر بہت محنت کی ہے اور ان کی پرورش اور تربیت میں جان ماری ہے۔

میں نے چھٹی سے دسویں کلاس کے دوران اسکول کے ساتھ حفظ کیا اور روٹین یہ تھی کہ فجر سے اشراق، ظہر سے عصر اور مغرب سے عشاء تک کا وقت مدرسہ میں گزرتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ مجھے کتوں سے بہت ڈر لگتا تھا اور کئی مرتبہ والدہ محترمہ عشاء کے وقت مدرسہ لینے آجاتی تھیں اور فجر کو وقت پر اٹھانا اور مدرسہ بھیجنا ان کے معمولات میں سے تھا۔ ہمارے اسکول بیگ کی خریداری سے لے کر پیپرز کی تیاری کے لیے بٹھانے تک کے تمام معاملات وہ اپنی نگرانی میں کرتی تھیں۔

وہ اگرچہ پڑھی لکھی نہیں ہیں لیکن کتاب اور ڈائجسٹ میں فرق کر لیتی تھیں۔ مجھے بچپن میں جاسوسی اور سسپنس ڈائجسٹ پڑھنے کی بہت عادت تھی لیکن چھپ چھپ کے پڑھا کرتا تھا کہ اگر والدہ کو پتہ چل جاتا تو پھر خیر نہ ہوتی تھی۔ ابھی تک یاد ہے کہ ایک مرتبہ جاسوسی ڈائجسٹ پڑھ رہا تھا، کمرے میں اور بھی بہن بھائی موجود تھے کہ اچانک والدہ داخل ہوئیں، میں نے فوراً ڈائجسٹ تکیے کے نیچے رکھا اور مستعدی سے کھڑا ہو گیا اور کہا کہ "میں رسالہ تو نہیں پڑھ رہا تھا"۔ انہیں تو خیر بات سمجھ نہ آئی کہ ان کی نظر نہیں پڑی تھی لیکن بہن بھائیوں کا قہقہہ ضرور بلند ہوا۔

قرآن مجید ناظرہ بچپن میں نہ پڑھ سکیں، بڑے ہو کر پڑھنے کی بہت کوشش کی لیکن

کامیابی نہ ہوئی۔ پھر مجھے کہنے لگیں کہ کیا میں ہر لائن پر بسم اللہ پڑھ لیا کروں؟ میں نے کہا کہ پڑھ لیا کریں۔ ایک مرتبہ میں نے جنت کے بارے کچھ حدیثیں سنائیں کہ یہ یہ جنت میں ہو گا تو فرمانے لگیں کہ یہ بتاؤ کہ جنت میں "تنور" بھی ہوں گے۔ میں نے کہا کہ بالکل ہوں گے۔ اچھا پھر روٹیاں بھی پکیں گی؟ میں نے کہا کہ جی ہاں، وہ بھی پکیں گے۔ تو انہیں اس سے کافی اطمینان ہوا۔

برسوں سے ان کی عادت ہے کہ تہجد پڑھتی ہیں اور فجر کی نماز کے بعد ٹیلی ویژن پر ایک پارہ قرآن مجید اردو ترجمہ کے ساتھ سنتی ہیں۔ مجھے بھی اور دوسرے بچوں کو بھی بتلاتی رہتی ہیں کہ قرآن مجید میں یہ لکھا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ انہیں اردو نہیں آتی اور ویسے بھی ترجمہ قرآن کی اردو ثقیل بھی ہوتی ہے لیکن وہ پھر بھی کچھ نہ کچھ سمجھنے کی کوشش کرتی ہیں اور سمجھ ہی لیتی ہیں۔ اس سے کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ وہ لوگ اللہ کے ہاں قرآن مجید کو سمجھ کر نہ پڑھنے کے حوالے سے کیا عذر پیش کریں گے کہ جن کے پاس دنیا کی اعلی تعلیم موجود ہے!

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ

بلاشبہ امام ابن تیمیہ (661-728ھ) تاریخ اسلام کے عظیم ترین مجدد تھے۔ فلسفہ، کلام، منطق، لغت، بلاغت، تفسیر، حدیث، اصول فقہ، اصول حدیث، اصول تفسیر، عقیدہ بلکہ کون سا علم ایسا ہے کہ جس میں انہوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا لوہا نہ منوایا ہو۔ ان کی تعریف میں اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ ان کے بعد جس نے بھی کسی بھی فن میں قلم اٹھایا، تو یا تو ان کے حق میں لکھا ہے، یا پھر ان کے خلاف لکھا ہے۔ ان کے افکار کی وسعت اور گہرائی اور ان کی قوت استدلال نے بعد میں آنے والی امت کو صدیوں اپنے ساتھ مشغول رکھا۔

دینی علوم میں اس قدر رسوخ تھا کہ سترہ سال کی عمر میں فتوی دینا شروع کر دیا۔ ان کے شاگردوں میں جلیل القدر ائمہ دین شامل ہیں جیسا کہ امام ابن قیم، امام ابن کثیر، امام ذہبی، امام ابن عبد الہادی المقدسی رحمہم اللہ وغیرہ۔ فقہ میں حنبلی مسلک کی نسبت رکھتے

تھے۔ ائمہ اربعہ کی رائے کو اپنے فتاوی میں اہتمام سے بیان کرتے تھے لیکن وہ مقلد محض نہ تھے۔ انہوں نے تقریباً چالیس مسائل میں ائمہ اربعہ کے فتاوی سے اختلاف کیا۔ اور اس شان سے کیا ہے کہ آج امت مسلمہ کے اکثر ممالک میں ائمہ اربعہ کے اجتہادات کی بجائے ان کے اجتہادی آراء کو بطور قانون نافذ کیا جارہا ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے بیسیوں کارنامے ہیں۔ انہوں نے ائمہ اربعہ کے عقیدے کو سلفیت کے نام سے اجاگر کیا۔ ان کے نزدیک صحابہ، تابعین، تبع تابعین، فقہاء اور محدثین، خاص طور ائمہ اربعہ یعنی امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ کا عقیدہ ایک ہی عقیدہ تھا اگرچہ ان میں فقہی مسائل میں باہمی اختلافات موجود تھے۔ انہوں نے عقیدے میں سلف صالحین کی اتباع کی دعوت دی۔ ان کا کہنا تھا کہ فقہاء کے مقلدین نے فقہ میں تو ان کی تقلید کی لیکن عقیدے میں ان کی تقلید کو چھوڑ کر ماتریدیت اور اشعریت کی طرف چلے گئے جو کہ غلط تھا۔

ان کا دوسرا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے فقہی جمود کو توڑا۔ انہوں نے عوام کے لیے تقلید کو لازم اور علماء کے لیے اجتہاد کو واجب قرار دیا۔ انہوں نے ائمہ دین کی علمی روایت سے تمسک بھی رکھا اور ان سے اختلاف بھی کیا۔ انہوں نے اجتہاد کے بند کیے جانے والے دروازے کو اپنی اجتہادی کاوشوں کے ذریعے علماء کے لیے کھول دیا۔ انہوں نے ائمہ دین کے مکمل احترام اور ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کے اقوال کو کتاب وسنت پر پیش کرنے کی فکر پوری شد ومد کے ساتھ پیش کی۔ انہوں نے فقہاء سے طعن کو دور کرنے کے لیے "رفع الملام عن الأئمة الأعلام " کے نام سے کتاب بھی لکھی۔

انہوں نے فلسفیوں کے رد میں "درء تعارض العقل والنقل" لکھی تو یونانی منطق کی اساسات کی دھجیاں "الرد علی المنطقیین" میں بکھیر دیں۔[1] عیسائیوں کے طعن کے

---

[1] مولانا حنیف ندوی رحمہ اللہ کا یہ اعتراض سطحی ہے کہ "الرد علی المنطقیین" میں مضامین کا تکرار تحصیل حاصل ہے۔ قرآن مجید میں بھی مضامین کا تکرار ہے اور اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ کسی۔ مصنف کا جذبہ یہ ہوتا ہے کہ ریڈر اس کی بات پر عمل کر کے فلاح سے ہمکنار ہو جائے کہ مقصود عمل ہوتا ہے اور کسی مصنف کا مقصد محض معلومات منتقل کر دینا ہوتا ہے۔

جواب میں "الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح" لکھی تو ناموس رسالت کے حق میں "الصارم المسلول علی شاتم الرسول" مرتب کی۔ متکلمین کے رد میں "بیان تلبیس الجهمیة في تأسیس بدعهم الکلامیة" مرتب کی تو روافض کے رد میں "منهاج السنة النبویة في نقض الکلام الشیعة القدریة" لکھی۔ انہوں نے فکری جہاد کے علاوہ تاتاریوں کے خلاف تلوار کا جہاد بھی کیا۔

انہوں نے دمشق اور حلب کے دفاع کے لیے باقاعدہ مسلمان لشکروں کی قیادت بھی کی۔ ان کی علمی آراء کو برداشت نہ کرنے والے فرقہ پرست علماء کی وجہ سے کئی مرتبہ انہیں جیل جانا پڑا اور جیل میں ہی ان کی وفات ہوئی۔ امام ذہبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اپنے آخری ایام میں فرمایا کرتے تھے کہ میں کسی امتی کو کافر نہیں کہتا۔ کسی آیت کی تفسیر کے لیے ایک صد کتب تک کا مطالعہ کر لیتے اور اگر پھر بھی اس کی تفسیر نہ کھلتی تو دمشق کی ویران مسجد میں جا کر اس کے صحن میں اپنے گال مٹی میں رگڑتے اور اللہ کے سامنے گڑگڑاتے ہوئے دعا کرتے: «يَا مُعَلِّمَ اِبْرَاهِيْمَ عَلِّمْنِي وَ يَا مُفَهِّمَ سُلَيْمَانَ فَهِّمْنِي»۔ ترجمہ: اے ابراہیم علیہ السلام کے معلم! مجھے علم سکھا دے اور اسے سلیمان علیہ السلام کو سمجھ دینے والے! مجھے سمجھداری عطا فرما دے۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "الحي القیوم" کہتے تو ایسا لگتا کہ جیسے وجد کی کیفیت طاری ہو گئی ہو۔ فجر کے بعد سے لے کر طلوع آفتاب تک سورہ فاتحہ کی تلاوت فرماتے اور کہتے کہ یہ ذکر بھی ہے اور قرآن مجید بھی۔

اور دوران قید کہا کرتے تھے کہ میرے دشمن مجھ سے کیا چھین سکتے ہیں! میری جنت کہ جسے میں اپنے سینے میں لیے پھرتا ہوں۔ اور جب کسی ایسے شخص کی وفات کی اطلاع ملتی کہ جس نے ان کو بہت اذیت پہنچائی ہوتی تو اس کے اہل خانہ کے پاس جا کر افسوس کرتے اور کہتے کہ کوئی ضرورت ہو تو پوری کر دوں۔

ان کے حالات زندگی پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں کہ جن میں سے شیخ ابو زہرہ مصری رحمہ اللہ کی کتاب کافی معروف ہے۔ جناب رئیس احمد جعفری ندوی رحمہ اللہ نے اس کا

ترجمہ "حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ" کے عنوان سے کیا ہے۔

سید ابوالاعلی مودودی رحمہ اللہ

بلاشبہ فکر اسلامی کی تجدید اور احیائے دین میں مولانا مودودی رحمہ اللہ کے حصے میں جو ملی خدمات آئی ہیں، وہ دوسروں کے حصے میں کم ہی آئی ہیں۔ ہمارا کون سا عالم دین ایسا ہے، جسے برصغیر پاک وہند سے باہر دنیا ویسے ہی جانتی ہو جیسے سید مودودی علیہ الرحمۃ کو آج دنیا جانتی ہے۔ اور برصغیر پاک وہند میں بھی جن لوگوں نے فکری، علمی، دعوتی اور تحریکی کام کیے ہیں، ان پر مولانا مودودی کے واضح اثرات موجود ہیں۔

مولانا علی میاں، مولانا اصلاحی، ڈاکٹر اسرار احمد رحمہم اللہ وغیرہ، ان سب کی "فکری تربیت" میں مولانا مودودی رحمہ اللہ کا بنیادی کردار رہا ہے۔ مولانا نے صرف برصغیر پاک وہند کو نہیں کیا بلکہ عالم اسلام کو متاثر کیا ہے۔ الاخوان المسلمون نے ان سے استفادہ کیا اور پھر اخوان نے حزب التحریر وغیرہ کی صورت میں اپنے بچے پیدا کیے۔ اور یہ بات سچ ہے کہ اگر سید مودودی رحمہ اللہ نہ ہوتے تو ہم فکری طور یتیم ہوتے۔ سید مودودی رحمہ اللہ نے ہمیں یہ اعتماد دیا کہ آج ہم مغرب پر کچھ تنقید کرنے کے اہل ہیں۔ اور دین پر عمل تو پہلے بھی ہو رہا تھا لیکن سید مودودی رحمہ اللہ نے ہمیں یہ بھروسا دیا کہ آج کے اس الحادی دور میں بھی ہم پورے اعتماد کے ساتھ دین پر عمل کر سکتے ہیں۔ بلاشبہ آج جماعت کی ایک خاتون جس اعتماد کے ساتھ یونیورسٹی میں پردہ کرتی ہے، وہ اعتماد روایتی پردہ کرنے والوں کو حاصل نہیں ہے، یہ اعتماد سید مودودی رحمہ اللہ نے مسلم سوسائٹی کو دیا۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی رحمہ اللہ کا کہنا یہ ہے کہ برصغیر پاک وہند میں تجدید واحیائے دین کے کام میں جن دو بڑی شخصیات پر ابن تیمیہ کے اثرات ہیں، وہ شاہ ولی اللہ دہلوی اور سید مودودی رحمہما اللہ ہیں۔ وہ ماہنامہ ترجمان القرآن، مئی 2004ء کے شمارے میں لکھتے ہیں:

> "ابن تیمیہ سے مولانا مودودی کی عقیدت بہت قدیم بھی ہے اور ابتداء میں بڑی شدید بھی تھی۔ مولانا کی جن کتابوں کو ان کے نظام فکر میں کلیدی حیثیت حاصل ہے، ان میں تجدید واحیائے دین ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔

اس مقالے کے لکھے جانے سے کچھ ہی قبل، 1937ء اور 1938ء کے سالوں میں، مولانا نے ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد رشید ابن القیم کی تصنیفات سے بہت استفادہ کیا۔"

ایک اور جگہ ڈاکٹر محمود احمد غازی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"ابن تیمیہ کے اثرات مولانا پر ایک دوسرے راستے سے بھی پہنچے۔ یہ راستہ شاہ محدث دہلوی کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ کے بارے میں بعض ارباب نظر کا کہنا ہے کہ اس کے بعض حصے ابن تیمیہ کی کتابوں کے براہ راست اثرات کے تحت لکھے گئے۔ اگر ایسا نہ بھی ہو تو بھی حجۃ اللہ البالغہ کے بعض ابواب اور ابن تیمیہ کے خیالات میں حیرت انگیز مماثلت پائی جاتی ہے۔ یہ بات بھی بڑی اہم ہے کہ مولانا نے 1938-1939ء میں حجۃ اللہ البالغۃ کے بعض حصوں کا ترجمہ کیا۔ یہ وہ حصے تھے جہاں شاہ ولی اللہ کے افکار اور ابن تیمیہ کے خیالات میں گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔"

ایک اور جگہ ڈاکٹر محمود احمد غازی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"دونوں حضرات کی علمی اور دینی کاوشوں کا اہم ترین میدان تجدید و اصلاح دین ہے۔ مسلمانوں میں رائج دینی تصورات کی قرآن وسنت کی روشنی میں تنقید اور کمزور پہلوؤں کی اصلاح ان دونوں شخصیتوں کے کام اور دل چسپی کا اصل میدان ہے۔ دونوں کو اپنے معاصر علما اور دینی اکابر کی شدید تنقیدوں کا سامنا کرنا پڑا۔۔۔ یوں تو مولانا مودودی اور ابن تیمیہ دونوں کے ہاں عقل و نقل کا امتزاج یکساں طور پر پایا جاتا ہے لیکن اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ابن تیمیہ کا زیادہ زور نقل پر اور مولانا کا عقل پر ہے۔"

مولانا تقی عثمانی صاحب کا تبصرہ کتاب

عرصہ ہوا کہ عصر حاضر میں تکفیر، خروج، جہاد اور نفاذ شریعت کے موضوع پر راقم نے ایک کتاب تصنیف کی تھی کہ جس کی بعض اہل علم نے بہت زیادہ تحسین فرمائی۔ ابھی حال ہی میں ہمارے ایک فاضل دوست نے اسی حوالہ سے ایک پوسٹ لگائی کہ

جس سے یہ احساس پیدا ہوا کہ اس موضوع پر ابھی تک لوگ الجھن میں مبتلا ہیں۔

ذیل میں اپنی کتاب اور اس پر جسٹس ریٹائرڈ مولانا تقی عثمانی صاحب کا تبصرہ کا فوٹو بھی شیئر کر رہا ہوں۔ مولانا تقی عثمانی صاحب کا یہ تبصرہ شیئر کرنے کا صرف مقصد یہ ہے کہ انہوں نے طالبانائزیشن، تکفیر، جہاد، نفاذ شریعت وغیرہ جیسے مسائل میں اس رائے کو معتدل قرار دیا ہے جو کہ میں نے اپنی اس کتاب میں پیش کی ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے اس کتاب کی اشاعت پر ٹیلی فون کے ذریعے بھی مبارک باد پیش کی ہے اور اسے وقت کی ایک اہم ضرورت قرار دیا۔

اس کے علاوہ جناب شیخ الحدیث ارشاد الحق اثری صاحب نے بھی بعض طلبۃ العلم کو ان مسائل میں راقم کی کتاب پڑھنے کی تجویز دی، وغیر ذلک کثیر۔ اس وقت مقصود یہ نہیں ہے کہ میں اپنی اس کتاب کی تعریف میں رطب اللسان رہوں کہ اس بات کے ذکر کرنے سے مجھے دلی طور شرمندگی ہوتی ہے کہ جس میں میری تعریف کا کوئی پہلو نکل رہا ہو لہذا کافی عرصے بعد ایک ضرورت کے تحت یہ بات کر دی ہے۔ ان علماء کی آراء ذکر کرنے کا مقصد صرف یہی ہے کہ جن لوگوں کو ان علماء پر اعتماد ہے، وہ اس کتاب کا مطالعہ کریں اور جو لوگ ان مسائل میں غلط منہج اور رستے کو اختیار کر بیٹھے ہیں تو انہیں یہ کتاب پڑھنے کی تجویز دیں۔

دنیا میں شاید کسی کو کسی سے صد فی صد اتفاق نہ ہو لیکن اس کتاب میں کبار اہل علم کی نسبت سے جو رائے پیش کی گئی ہے، اس کے غالب حصہ سے اتفاق کیے بغیر چارہ نہیں ہے۔ خلاصہ یہی ہے کہ حکمرانوں کو کافر قرار دینے اور ان کے خلاف خروج کے رستے کسی مسلم ریاست کے اسٹرکچر کو گرانے کی کوشش کرنا پرلے درجے کی بے وقوفی ہے کہ اس قسم کے قائم اسٹرکچر کے بغیر دین کا عالمی غلبہ خواب وخیال سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے۔

تین بڑے آدمی

میں اپنی زندگی میں جتنے لوگوں سے ملا ہوں تو ان میں سے تین کو بڑا آدمی پایا ہے؛

مولانا عبد الرحمن مدنی صاحب، ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اور احمد جاوید صاحب۔ تینوں کی صحبت میں رہنے اور ان سے براہ راست استفادہ کا موقع ملا اور ان تینوں کا میری شخصیت پر بہت گہرا اثر ہے اور میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میری شخصیت کی تعمیر اور تکمیل میں ان تینوں کا بہت حصہ ہے۔

ان تینوں اساتذہ اور شیوخ میں قدر مشترک یہ ہے کہ یہ فکری ذوق رکھنے والے ہیں جبکہ ان میں امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ مولانا عبد الرحمن مدنی صاحب تعلیم و تعلم، ڈاکٹر اسرار احمد صاحب دعوت و تحریک اور احمد جاوید صاحب تزکیہ و تربیت کے میدان کے آدمی ہیں۔

مجھے کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کہ میری شخصیت میں تین پہلو نمایاں ہیں؛ علمی، تحریکی اور اخلاقی۔ اور ان تینوں حضرات میں یہ تینوں پہلو موجود تھے لیکن علمی شعور کی تکمیل مولانا عبد الرحمن مدنی صاحب کے مرہون منت ہے، تحریکی شعور ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ سے حاصل ہوا اور اخلاقی شعور کی بنیاد احمد جاوید صاحب کی صحبت سے پڑی۔ کبھی علمی شعور غالب آجاتا ہے تو کبھی تحریکی اور کبھی اخلاقی۔

تحریکی شعور غالب آجائے تو مصلح بن جاتا ہوں اور اخلاقی شعور غالب آنے لگے تو صالح بننے کی کوشش کرتا ہوں۔ اور علمی شعور غالب آجائے تو پریشان ہو جاتا ہوں کہ صالح بننا ہے یا مصلح؛ یعنی اپنی اصلاح کو اہمیت دینی ہے یا دوسروں کی تربیت کو۔ اور عجب یہ ہے کہ اسی شعور کی روشنی میں اس الجھن میں وقتی طور اعتدال حاصل ہو جاتا ہے۔

پچھلے دنوں قاری حنیف ڈار صاحب نے احمد جاوید صاحب کی شخصیت پر اپنی وال سے کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی تو قلبی اذیت ہوئی۔ اور اب مبشر حسین لاہوری صاحب نے مولانا عبد الرحمن مدنی صاحب کی شخصیت کو بدنام کرنا چاہا تو ذہنی کوفت ہوئی حالانکہ لاہوری صاحب بھی مدنی صاحب کے شاگردوں میں سے ہیں۔ اللہ عزوجل ان دونوں حضرات کو ہدایت دے کہ وہ کوئی مثبت کام کر سکیں ورنہ کیچڑ تو پیغمبروں پر بھی بہت اچھالا گیا جبکہ وہ معصوم بھی تھے۔

چند دن پہلے استاذ محترم مولانا عبد الرحمن مدنی صاحب کی خدمت میں حاضری ہوئی تو سیر پر لے کر نکل پڑے۔ اور اکثر جب بھی حاضری ہوتی ہے تو سیر پر لے کر نکل جاتے ہیں اور خوب علمی بحثیں کرتے ہیں۔ جس پارک میں سیر کر رہے تھے تو اس کا چکر کوئی ایک کلو میٹر کا ہو گا تو چار چکر مکمل ہونے کے بعد مجھ سے کہنے لگے کہ ہم نے ایک چکر لگا لیا ہے؟ میں نے کہا نہیں، یہ چوتھا ہے۔ میرا تھکاوٹ سے برا حال تھا اور وہ پچھتر سال سے اوپر ہونے کے باوجود علمی بحث کے دوران اپنے آپ کو یوں محسوس کر رہے تھے جیسے بیس سال کا جوان ہو۔

برادر محترم طاہر الاسلام عسکری صاحب کا شکر گزار ہوں کہ جنہوں نے بروقت استاذ محترم کے دفاع میں مبشر حسین لاہوری صاحب کو ریسپانس کیا۔ جزاکم اللہ خیرا! رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ وہ شخص ہم میں سے نہیں جو ہمارے بڑوں کی تعظیم اور ادب نہ کرے۔ یہ دین ہم میں ایک نظام درجات قائم کرتا ہوں کہ جس میں کوئی چھوٹا ہے اور کوئی بڑا۔ اور اسی نظام درجات کا تقاضا ہے کہ شاگرد اپنے استاذ کا احترام کرے اور اس پر یوں تنقید نہ کرے کہ جسے استاذ اپنے لیے گالی سمجھے۔

احمد جاوید صاحب

بہت سے دوست اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ اپنی اصلاح کرنا چاہتے ہیں لیکن ہوتی نہیں ہے۔ گناہ کی عادت ترک کرنا چاہتے ہیں لیکن گناہ چھوٹتا نہیں ہے۔ تو جن دوستوں کو اپنے تزکیہ نفس کی خواہش اور شوق ہو لیکن اس کے باوجود کچھ کرنے کی ہمت نہ ہوتی ہو تو کیا کریں؟

ان دوستوں کے لیے تجویز ہے کہ وہ احمد جاوید صاحب کے جمعہ کے اصلاحی درس میں شریک ہوا کریں جو کہ ان کے گھر ہی پر مغرب کے بعد منعقد ہوتا ہے۔ ان شاء اللہ! امید ہے کہ چھ ماہ اور سال کی مسلسل شرکت سے نیکی کرنا آسان لگے گا اور گناہ کرنا مشکل ہو جائے گا۔

البتہ میں نے تزکیہ نفس میں ایک اصول کو بنیاد کی حیثیت سے جانا ہے اور یہ تزکیہ

نفس کے باب کا خلاصہ ہے کہ اگر خود سے تزکیہ کی طلب اور کوشش نہ ہوگی تو نبی کی صحبت سے بھی فائدہ نہ ہوگا۔ بس اس کو جان کر کسی صاحب حال کی صحبت میں کچھ عرصہ گزاریں تو آپ کی زندگی تبدیل ہو جائے گی۔ ابو جہل کو نبی کی صحبت کا فائدہ نہ ہوا اور نہ ہی منافقین کو کہ اندر طلب موجود نہ تھی۔ تو تزکیہ نفس میں شیخ کا بھی کمال ہوتا ہے لیکن آپ کا کمال شیخ کے کمال سے زیادہ ہوتا ہے۔

ادریس آزاد

ادریس آزاد صاحب کا موضوع "فلاسفی آف سائنس" ہے۔ مختلف یونیورسٹیز میں اس حوالے سے ورکشاپس کرواتے رہتے ہیں۔ الحاد (Atheism) کے خلاف ان کی تحریریں بہت ہی جاندار، دلچسپ اور سنجیدہ ہوتی ہیں۔ مشکل مباحث کو بہت ہی آسان انداز میں بیان کرنے کا ملکہ انہیں حاصل ہیں۔

جو دوست بھی سائنس یا فزکس کے طالب ہوں یا جنہیں "فلاسفی آف سائنس" یا نظریاتی فزکس سے دلچسپی ہو تو وہ ان کو ضرور پڑھیں بلکہ ایک دن ان کی ویب سائیٹ پر گزاریں۔ ان کی ویب سائیٹ کا ایڈریس شیئر کر رہا ہوں۔[1]

استاذ نعمان علی خان

استاذ نعمان علی خان ایک پاکستانی امریکی ہیں جو پچھلے بیس سال سے امریکہ میں قرآن مجید اور عربی زبان کی جدید انداز اور اسلوب میں تعلیم کے لیے بے پناہ محنت کر رہے ہیں۔ "بينة" (Bayyinah) کے نام سے ایک انسٹی ٹیوٹ چلاتے ہیں، ان کے شاگرد ہزاروں میں جبکہ فالوورز لاکھوں میں ہیں۔ میں نے ان کی کچھ ویڈیو دیکھی ہیں، قرآن مجید کی تفہیم کا ایسا خوبصورت اور نادر انداز کہ جس سے اللہ کی کتاب سے مردہ تعلق میں جان پڑ جائے۔

ڈیلی پاکستان کی ایک خبر فیس بک پر گردش کر رہی ہے کہ نعمان علی خان پر ان کے

---

[1] http://www.idrisazad.com

بعض دوستوں کی طرف سے الزام لگایا گیا ہے کہ وہ اپنی فالوور خواتین کے ساتھ "غیر مناسب" تعلق رکھتے ہیں اور اس الزام میں "غیر مناسب" کی وضاحت نہیں ہے۔ نعمان علی خان نے اس کے جواب میں یہ کہا ہے کہ دو سال پہلے ان کی طلاق ہو چکی لہذا انہوں نے بعض خواتین سے نکاح کے سلسلہ میں رابطہ کیا تھا۔ بس بات اتنی تھی کہ جسے اچھال دیا گیا۔

جو شخص بھی دین کا کوئی بڑا کام کرے گا، اسے ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مولانا شبلی نعمانی رحمہ اللہ پر اردو زبان کے ایک بہت بڑے محقق صاحب نے کتاب لکھ دی کہ انہوں نے ادھیڑ عمر عطیہ بیگم سے عشق میں گزار دی۔ بھائی، اب مولانا شبلی شاعر تھے، انہوں نے عشقیہ شعر وشاعری بھی کی ہے۔ چلیں، نہیں کرنی چاہی تھی، اتنی بات تو ہو سکتی ہے لیکن محقق صاحب یہ دعوی کریں کہ شبلی یہ شعر عطیہ بیگم کے لیے کہتے تھے، تو یہ الزام لگانا مناسب نہیں ہے۔ چاہے وہ کرتے بھی ہوں کیونکہ اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ ایک مرتبہ تقریر کے لیے کھڑے ہوئے۔ سیاسی مخالفین نے ایک لڑکے کو تیار کیا ہوا تھا کہ مولانا کی تقریر ختم ہونے کے بعد جلسے میں کھڑے ہو کر یہ کہنا کہ مولانا کے میرے ساتھ ناجائز تعلقات ہیں۔ آزاد تقریر کر کے سٹیج پر بیٹھے ہی تھے کہ شور ہو گیا۔ سٹیج پر موجود کسی شخص نے آزاد سے کہا کہ سپیکر پر جا کر وضاحت کیجیے تو وہ کہنے لگے کہ اس لڑکے کی بات کچھ لوگوں نے سنی ہو گی اور کچھ نے نہیں۔ اور جنہوں نے سنی وہ بھی جلسے کے بعد بھول جائیں گے۔ اگر آزاد نے اسپیکر پر آ کر وضاحت شروع کر دی تو ایک تو سارا مجمع سنے گا اور دوسرا یہ بھی سوچیں گے کہ کوئی بات ہے تو وضاحت ہو رہی ہے۔

کچھ مخالفین نے مولانا مودودی رحمہ اللہ کے بارے بھی لکھ دیا کہ وہ مریم جمیلہ میں انٹرسٹڈ تھے۔ اول تو ہمارے پاس اس کے کوئی شواہد نہیں ہیں اور اگر تھے بھی تو کیا ہوا؟ شادی ہی کے لیے انٹرسٹڈ ہوں گے ناں، تو اس میں گناہ ہی کیا ہے؟ اللہ عزوجل نے تو نبی

کریم ﷺ کے بارے سورۃ الاحزاب میں فرما دیا کہ اب آپ کے لیے کسی اور عورت سے نکاح کرنا جائز نہیں ہے چاہے آپ کو اس کا حسن کتنا ہی کیوں نہ بھائے۔ ایک دیندار آدمی کسی دیندار خاتون سے شادی میں انٹرسٹڈ ہو اور اس کی کوئی صورت نکل آئے تو بہت اچھا، اور نہ نکلے تو اللہ اللہ خیر سلا!

اصل میں ہوتا کیا ہے کہ جن لوگوں نے دین میں کوئی بڑا کام کیا ہے تو ان کے فالوورز میں مرد بھی ہوتے ہیں اور خواتین بھی۔ اور لوگوں کو ان کی دینی خدمات کی وجہ سے ان سے ایک محبت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح شاگرد اپنے استاذ سے بہت جلد اور زیادہ متاثر ہو جاتا ہے اور اگر مخالف جنس سے ہو تو تعلقات میں پیچیدگی بڑھ جاتی ہے جیسا کہ عموماً پی۔ ایچ۔ ڈی کروانے والے میل سپروائزر اور فی میل اسٹوڈنٹ کے تعلقات میں پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ بھئی، اسلامیات والے کا کیا ہے، وہ دوسری شادی ہی کرے گا ناں، مسئلہ تو لبرلز کا ہے، جو گند ماریں گے۔

ڈاکٹر بلال فلپ نے چار شادیاں کر لیں، چلیں شادیاں ہی کی ہیں ناں۔ عطاء الرحمن ثاقب صاحب نے اپنی شاگردہ سے شادی کر لی، چلیں شادی ہی کی تھی ناں۔ لہذا ایسی باتوں کو سکینڈل بنا کر پیش نہ کریں۔ وہ بھی انسان ہی ہیں، فرشتے نہیں ہیں۔ کیا آپ کے لیے اتنا کافی نہیں ہے کہ ان کا کوئی فزیکل ریلیشن شپ نہیں تھا، وہ کہیں ڈیٹ پر نہیں جاتے تھے، انہوں نے فحش گفتگو نہیں کی۔ تو بھئی یہ تو ان کا تقوی ہے کہ ایسے مواقع اگر آپ کو میسر آ جاتے تو آپ یہ سب کر گزرتے۔ اور ان کے بارے صرف اتنی بات کہ وہ کسی میں شادی کے لیے انٹرسٹڈ تھے، بس بات کا بتنگڑ بنا دیا اور اگلے کی پوری شخصیت ہی مسخ کر دی۔

باقی داعیان دین کو محتاط ہونے کی ضرورت ہے، اس میں شک نہیں ہے، خاص طور اپنی فی میل فالوورز سے کہ مخالف جنس کی کشش فطری ہے۔ اب اگر عورت پر اس کا دل نہیں آئے گا تو کیا گدھے گھوڑے پر آئے گا؟ بی۔ بی۔ سی کے مطابق کیمسٹری کی ایک انٹرنیشنل کانفرنس میں ایک بہت بڑے پروفیسر کے اس جملے پر میڈیا میں بڑی لے دے

ہوئی کہ انہوں نے کہا کہ ہمیں یعنی پروفیسرز کو اب اس بات کا اقرار کر لینا چاہیے کہ جب فی میل اسٹوڈنٹ لیب میں ہمارے ساتھ کام کرتی ہے اور اس سے کام نہیں ہو پاتا تو اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ہم اس کے ساتھ ایک پیچیدہ تعلق میں بندھ جاتے ہیں اور تعلق آگے آجاتا ہے اور تحقیق پیچھے رہ جاتی ہے۔

تو تعلق کی اس پیچیدگی کا سامنا ہمیں ہر اس جگہ ہو رہا ہے جہاں مخالف جنس کے ساتھ انٹر ایکشن بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اس پر ڈسکشن ہونی چاہیے۔ کوئی بھی طبقہ اس پر ڈسکشن کے لیے تیار نہیں ہے؛ نہ دنیادار اور نہ ہی دین دار۔ ایک پیر صاحب سے ان کے مریدوں کو جذباتی وابستگی ہو جاتی ہے، اور مریدوں میں عورتیں بھی ہوتی ہیں۔ مولانا ذوالفقار نقشبندی صاحب کے بارے بھی کچھ ایسی باتیں ہوئیں تھیں۔ مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کو مخالفین نے طعنہ دیا کہ اپنی مرید سے دوسری شادی کر لی ہے۔ تو شادی ہی کی ہے نا بھائی، کوئی بھگا کر تو نہیں لے گئے تھے۔ تو میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ میلان، رجحان اور جذباتی وابستگی نیچرل ہے اور قانون فطرت کے عین مطابق ہے۔

اصل یہ ہے کہ آپ نے اس کو ہینڈل کیسے کیا ہے، دیندار آدمی اگر اس میں الجھ گیا تو اسے شادی کی طرف لے جائے گا یا حکمت سے معاملہ ختم کر دے گا لیکن دنیادار گناہ اور فسق وفجور اور ظلم وزیادتی کی طرف لے جائے گا۔ اب تو یونیورسٹی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے میل اسٹوڈنٹس میں یہ معروف ہے کہ فی میلز کے لیے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لینا کون سا مشکل کام ہے؟ تعلقات کی اس پیچیدگی سے بچنا چاہتے ہیں تو اس میں اصل نکتہ یہی ہے کہ حجاب قائم رکھیں اور حجاب کا مطلب ہچکچاہٹ (hesitation) کہ تعلقات میں اتنا تکلف ہو کہ اگلا آپ سے کھل کر بات نہ کر سکے۔ یہ کیا حجاب ہے کہ نقاب بھی اوڑھا ہوا ہے اور بے تکلفی ایسی جیسے بہن بھائیوں میں ہوتی ہے۔ تو استاذ نعمان علی خان، آئی لو یو برادر۔ اللہ آپ کو اس آزمائش پر صبر جمیل عطا فرمائے۔

اور دوست نے کہا کہ آپ نے نعمان علی خان کے لیے ہمارے اکابر کی بے عزتی فرما دی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جتنی باتیں میں نے کی ہے، یہ امر واقعہ ہیں۔ ان میں سے کوئی

بات خلاف واقعہ نہیں ہے۔دوسری بات یہ ہے کہ آپ کے اکابر آپ کے نزدیک کوئی فوق الفطرت ٹائپ مخلوق ہوں گے جیسا کہ مغرب میں سپر مین وغیرہ کے تصورات ہیں جبکہ میری نظر میں وہ عام انسان ہی تھے۔انسانوں سے ایسے رویوں کی ہی امید کی جا سکتی ہے اور کی جانی چاہیے۔کسی کے اچھا ہونے کا بس اتنا مطلب ہے کہ اس میں اچھائی غالب ہے، یہ مطلب ہر گز نہیں ہے کہ وہ فرشتہ ہے۔

اعلی حضرت کی فقہی بصیرت

مجھے اعلی حضرت کے فقیہ ہونے میں ہر گز شک نہیں ہے لیکن ان کے فتاوی کا مطالعہ کرتے ہوئے کبھی کبھار ان کی فقہی بصیرت پر سوال پیدا ہو جائے تو اسے ہر گز گستاخی پر محمول نہ کیا جائے۔اور اس سوال کے پیدا کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ کوئی بریلوی صاحب علم اس اشکال کو دور کر دیں تو اعلی حضرت کے مقام و مرتبے پر اعتماد میں اضافہ ہو گا۔

اعلی حضرت نے غیر مقلد سے نکاح کے بارے سوال کے جواب میں کہا ہے کہ وہابی مرد اور عورت مرتد ہیں اور ان کا نکاح کسی سے نہیں ہو سکتا، نہ کافر سے، نہ مرتد سے، نہ مسلمان سے، نہ انسان سے، نہ حیوان سے، اور اگر کسی سے کیا بھی تو زنا خالص ہو گا۔ [فتاوی رضویہ:511-510/11]

وہابی مرد اور عورت کا نکاح، سنی مرد اور عورت سے نہیں ہو سکتا، یہ نکتہ تو سمجھ میں آتا ہے لیکن وہابی مرد اور عورت کا نکاح آپس میں بھی نہیں ہوتا اور اگر وہ نکاح کر بھی لیں تو زنا کر رہے ہیں، یہ نکتہ سمجھ نہیں آیا۔اور اگر کوئی سنی عالم دین یہ بھی بتلا دیں کہ وہابی مرد اور عورت اگر نکاح کرنے کے بعد رہ رہے ہوں تو ان پر زنا کی حد نافذ ہو گی یا نہیں؟ تو ممنون ہوں گا۔اللہ ہماری امت کو ایسے شدت پسند مولویوں سے بچائے کہ انہوں نے ہی اس امت کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ان کے دلوں میں بغض اور نفرت کے بیج بو دیے۔

فاضل بریلوی اعلی حضرت کو رحمہ اللہ کہنا

ایک دوست نے پوچھا کہ اعلی حضرت مولانا احمد رضا خان صاحب کے نام کے

ساتھ رحمہ اللہ کیوں نہیں لکھ سکتے؟ میں نے جواب دیا کہ لکھیں، ضرور لکھیں لیکن اعتدال ملحوظ رہے۔ انہوں نے کہا کہ اعتدال کیا ہے؟ میں نے کہا کہ بس مظلوم کی دل آزاری نہ ہو۔ انہوں نے کہا کہ بات سمجھ نہیں آ رہی۔ میں نے کہا کہ سمجھاتا ہوں۔

اس وقت مولانا احمد رضا خان بریلوی صاحب کی چھ سات کتابیں یا رسائل میرے سامنے کھلے ہے کہ جن میں حسام الحرمین، فتاوی افریقہ، الکوکبة الشهابية في كفريات آبي الوهابية، سل السيوف الهندية على كفريات بابا النجدية، ازالة العار بحجر الكرائم عن كلاب النار، الدلائل القاهرة على الكفرة النياشرة وغیرہ شامل ہیں۔ جبکہ ان کتابوں کے رد میں لکھی گئی علامہ احسان الہی ظہیر صاحب کی ایک کتاب "بریلویت: تاریخ و عقائد" بھی اس وقت سامنے ہے۔

فاضل بریلوی اعلی حضرت احمد رضا خان صاحب کا اپنی کتابوں اور رسائل میں کہنا ہے کہ دیوبندی علماء مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا خلیل احمد سہارنپوری اور مولانا اشرف علی تھانوی کے کفر میں کوئی شک نہیں ہے اور جو انہیں کافر کہنے میں توقف کرے تو اس کے کفر میں بھی کوئی شک نہیں۔ اعلی حضرت کا یہ بھی کہنا ہے کہ اہل حدیث علماء مولانا ثناء اللہ امرتسری اور علامہ نذیر حسین دہلوی کافر، مرتد اور اسلام سے خارج ہیں۔

اعلی حضرت کا کہنا ہے کہ دیوبندی اور نجدی [یعنی سعودی] دونوں کافر ہیں اور جو ان کو کافر نہ کہے تو وہ بھی انہی کی طرح کافر ہے اور قیامت میں یہ ایک ہی رسی سے باندھے جائیں گے۔ اعلی حضرت کا کہنا ہے کہ دیوبندیوں کا نماز جنازہ پڑھنا اور مسلمانوں کے قبرستان میں ان کو دفن کرنا حرام ہے اور علمائے اہل حدیث اور ان کی پیروی کرنے والے کافر ہیں۔ وہابیوں اور ان کے پیشوا شاہ اسماعیل صاحب کا کفر ایسا یقینی، قطعی اور ثابت ہے کہ ان کے کلمہ پڑھنے کا بھی انہیں کوئی فائدہ نہیں ہے۔

اعلی حضرت کا کہنا ہے کہ غیر مقلدین، پکے بے دین، شیاطین اور ملاعین ہیں۔ غیر مقلدین، جہنم کے کتے ہیں۔ وہابیہ، ہندوؤں سے بدتر ہیں۔ جس نے کسی وہابی کی نماز جنازہ پڑھی، وہ دوبارہ اسلام قبول کرے اور دوبارہ نکاح پڑھوائے۔ دیوبندی عالم دین

مولانا رشید احمد گنگوہی کو جہنم میں پھینک کر کہا جائے گا: ذق الأشرف الرشید یعنی اے رشید جہنم کا عذاب چکھ۔ اعلی حضرت نے اس کے علاوہ بہت کچھ اپنی کتابوں، رسائل اور فتاوی میں اپنے مخالفین کو کہا ہے کہ جو پڑھنے کے لائق ہے۔

ہاں تو اب جناب فاضل بریلوی اور اعلی حضرت کو رحمہ اللہ کہہ لیں، بلکہ رضی اللہ عنہ کہہ لیں یا علیہ السلام کہہ لیں، تو ان شاءاللہ! مظلوم کی دل آزاری نہیں ہو گی۔ توازن اور اعتدال اسی کا نام ہے۔

اور بعض بریلوی علماء مثلاً مولانا محمد طیب ہمدانی اور مولانا حشمت علی صاحب کا "تجانب أهل السنة" میں یہ بھی کہنا ہے کہ علامہ اقبال نے اپنی نظموں کے ذریعے دہریت، الحاد اور زندیقیت پھیلائی ہے تو وہ مسلمان کیسے ہو سکتے ہیں؟ اور مسٹر محمد علی جناح تو قطعی طور مرتد اور خارج اسلام ہے اور جو محمد علی جناح کے کافر ہونے میں شک کرے تو وہ بھی کافر اور مرتد ہے۔ مولانا طیب ہمدانی تو مولانا حشمت علی کے داماد ہیں اور مولانا حشمت علی خان صاحب، مولانا احمد رضا خان صاحب کے خلیفہ مجاز ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ علامہ اقبال اور قائد اعظم پر اعلی حضرت نے کفر کے فتوے نہیں لگائے لیکن دیوبندیوں، اہل حدیثوں وغیرہ پر کفر کے فتوے لگا لگا کر اعلی حضرت صاحب اپنے پیروکاروں کی جو تربیت فرما گئے تھے، اس کا نتیجہ یہی نکلنا تھا کہ ان کے خلفاء علامہ اقبال اور قائد اعظم تک کو کافر بنا گئے۔

اور اب تو بریلوی علماء کی شدت پسندی کا جو عالم ہے، الامان والحفیظ کہ ایک دوسرے کو کافر کہہ رہے ہیں۔ مفتی محمد حسین قادری رضوی سمیت بریلی شریف کے چھ علماء نے جسٹس ریٹائرڈ پیر محمد کرم شاہ ازہری صاحب کو کافر قرار دیا اور اس بارے صرف فتوی دینے پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ انہیں کافر ثابت کرنے کے لیے ایک کتاب "جسٹس محمد کرم شاہ صاحب کے اہل سنت وجماعت سے مختلف اعتزالی نظریات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ مع اہم فتاوی" بھی شائع کی۔ علامہ مفتی محمد فضل رسول سیالوی صاحب نے پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری صاحب کو کافر ثابت کرنے کے لیے "طاہر القادری کے خلاف قرآن کی

فریاد اپنے ماننے والوں سے" کے نام سے کتاب لکھی ہے۔ بریلوی علماء کے اسی طرح کے فتوے دعوت اسلامی اور ان کے امیر مولانا محمد الیاس قادری صاحب کے بارے میں بھی مل جائیں گے۔

البتہ بریلوی علماء میں پیر مہر علی شاہ صاحب اور پیر کرم شاہ ازہری صاحب دونوں علماء ایسے ہو گزرے ہیں کہ جو معتدل تھے اور انہوں نے دوسروں کو کافر نہیں کہا۔ ہماری رائے میں جب تک بریلوی مسلک کا امام اعلی حضرت کی جگہ پیر مہر علی شاہ صاحب کو نہیں بنایا جاتا، اس وقت تک اس مسلک سے شدت پسندی کو علیحدہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ ظاہری بات ہے کہ جسے آپ امام بنائیں گے، اس کی زبان، اس کا لب ولہجہ، اس کی سوچ، اس کی فکر، اس کا نظریہ، اس کی شدت پسندی، اس کی انتہا پسندی، اس کا مزاج وغیرہ تو مسلک کے لوگوں کی نفسیات کا حصہ بنے گا۔

ڈاکٹر خضر یاسین صاحب کی تکفیری مہم

کئی ایک دوستوں نے سوال کیا کہ ڈاکٹر خضر یاسین صاحب کی فکر کے بارے کیا رائے ہے۔ میں نے عرض کیا کہ ایک نئی تکفیری مہم ہے کہ جس میں ختم نبوت کے نام پر ساری امت کو کافر بنانے کا مذہبی فرض سرانجام دیا جا رہا ہے۔ اس فکر کا کہنا ہے کہ احادیث، تفاسیر اور فقہ کی کتب، سب کی سب، ختم نبوت میں نقب زنی ہے۔ اور محدثین، مفسرین اور فقہاء، سب کے سب، ختم نبوت کے منکر ہیں۔ بریلوی، دیوبندی اور اہل حدیث مفسرین اور علماء ان کے نزدیک نئے قادیانی ہیں۔ معاذ اللہ! ثم معاذ اللہ!

اچھی بات تو یہ ہے کہ اس فکر میں فصاحت نہیں ہے اور ان کے کلام میں گرہیں بہت ہوتی ہیں لہذا بہت کم لوگوں کو بات سمجھ آتی ہے لیکن اب آکر کچھ ایسی بے ہودہ باتیں سامنے آنا شروع ہو گئی ہیں کہ جس سے لوگوں کو اس فکر کے مخبوط الحواس ہونے کا یقین ہونے لگا ہے۔ مثلاً اس فکر کا کہنا ہے کہ قرآن مجید نے جانوروں میں سے صرف خنزیر کو حرام کیا ہے لہذا خنزیر کے علاوہ کسی جانور کو حرام کہنا ختم نبوت کا انکار ہے۔ فیا للعجب!

اب مجھے دوست کہتے ہیں کہ میں اس فکر کا رد کروں۔ بھئی! مجھے تو سمجھ ہی نہیں آ رہی کہ رد کس چیز کا کریں۔ رد تو کسی ایسی چیز کا ہوتا ہے کہ جس کی کوئی بنیاد ہو۔ رد تو اس کا ہوتا ہے کہ جس کی کوئی دلیل ہو۔ یہاں دلیل تو ہے کوئی نہیں، بس صرف جذبات کا بخار ہے۔ اور اس بخار کی کرامات ہیں کہ مفکر صاحب صبح شام ایمان، کفر اور نفاق کے سرٹیفکیٹ بانٹنے میں لگے ہیں۔

اور جہاں آپ دلیل دیں گے تو مفکر صاحب استغفار کی تسبیح شروع کر دیں گے۔ ویسے جیسی ان کی فکر ہے، اس حساب سے تو ان کے لیے استغفار نہیں، بلکہ سید الاستغفار بنتا ہے۔ باقی ختم نبوت کا یہ خود ساختہ تصور جس جہالت پر کھڑا ہے، اس پر اجتہاد کے نام سے ایک علیحدہ تحریر میں روشنی ڈالوں گا۔

آپ کو ایمان کی سند چاہیے تو ان بے ہودہ افکار پر ایمان لے آیئے۔ اور اگر کافر اور منافق ہونے کا سرٹیفکیٹ چاہیے تو ان سے اختلاف کر لیں۔ ویسے اختلاف ہی کر لیں تو بہتر ہے کہ امت کی چودہ سو سالہ تاریخ میں ایسی مخبوط الحواس فکر پہلی مرتبہ ہی پیش ہوئی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ علمی فتنے ہر گز نہیں ہے کہ علم کا تو نام و نشان نہیں ہے، یہ فکر معاشرے کی اخلاقی گراوٹ کا نتیجہ ہے، امت کے گناہوں کی سزا ہے۔

بھئی خلاصہ یہی ہے، اس قسم کی فکر دراصل امت کے اجتماعی گناہوں کی سزا ہیں۔ امت آج توبہ کر لے تو مسلمان معاشروں میں ایسے بے ہودہ افکار پیدا ہونا بند ہو جائیں گے۔ اور اب تو اسلام کے نام پر نت نئے افکار کا ایک ایسا جنگل آباد ہو رہا ہے کہ ہم اور کسی شے میں نہ سہی لیکن مفکرین کی ایکسپورٹ میں ضرور خود کفیل ہو سکتے ہیں۔ ان چار پانچ ہزار معاصر فقیہان حرم سے وہ اگلے وقتوں کے چار پانچ ہی بھلے۔ یہ انفرادیت (individualism) کے فلسفے کا نتیجہ ہے کہ اب ہر فرد اپنی جگہ ایک سند کی حیثیت رکھتا ہے، نہیں بلکہ سند بننا چاہتا ہے۔

قرآن مجید کا ترجمہ، خلاصہ اور تفسیر حرام ہے؟

ڈاکٹر خضر یاسین صاحب کا کہنا ہے کہ قرآن مجید کا ترجمہ، خلاصہ اور تفسیر حرام ہے

کہ ان کے بقول ترجمہ، خلاصہ اور تفسیر اللہ کے کلام میں اضافہ کرنے کے مترادف ہے۔اور تماشا یہ ہے کہ خود اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کے لیے ڈاکٹر صاحب قرآن مجید کا ترجمے پر ترجمہ اور تفسیر پر تفسیر کیے جارہے ہیں۔ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

”اللہ تعالیٰ نے خنزیر کے سوا کسی جانور کا گوشت حرام نہیں فرمایا،الایہ کہ مردہ کا گوشت کھانا حرام، زندہ جانور کا گوشت کھانا حرام ہے اور اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیے جانے والے جانور کا گوشت کھانا حرام ہے۔ مردہ جانور کا گوشت حرام ہے چاہے وہ گلا گھٹنے، چوٹ لگنے، گرنے اور سینگ لگنے سے مر جائے۔“

کوئی ڈاکٹر صاحب سے پوچھے کہ مردہ جانور کا لفظ قرآن مجید میں کہاں ہے؟قرآن مجید میں تو"میتۃ"کا لفظ ہے۔اللہ عزوجل نے "میتۃ"کو حرام کہا ہے،اور یہ کہہ رہے ہیں کہ مردہ جانور حرام ہے۔یہ تو ترجمہ کررہے ہیں، حرام کام کررہے ہیں، کیااللہ پر بہتان لگا رہے ہیں؟مردہ جانور کو حرام کہہ رہے ہیں؟مردہ جانور تو ان کے ترجمے سے حرام ہوا ہے نہ کہ قرآن مجید سے۔

اسی طرح قرآن مجید نے تو﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ﴾ [المائدة: 3] کہا ہے اور ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ مردہ کا گوشت کھانا حرام ہے۔ یہ گوشت اور کھانا دو الفاظ کا انہوں نے قرآن مجید میں اضافہ کردیا ہے۔قرآن مجید میں اپنی تفسیر سے اضافہ کررہے ہیں۔اچھا!اب یہ شارع بھی بن گئے ہیں۔استغفر اللہ!استغفر اللہ!یہ وہ منطق ہے جو ڈاکٹر صاحب ختم نبوت کے نام پر دوسروں کے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

”سنو پرانے اور نئے قادیانیو!میرے سامنے، خنزیر کے سوا کسی جانور کو اللہ کا نام لے کر ذبح کرو میں اس کا گوشت نہ کھاؤں تو مسلمان نہیں۔خدا کی قسم حدود نبوت میں تمہیں قدم رکھنے دوں گا اور نہ حدود نبوت کو تمہیں دھندلانے دوں گا۔“

ڈاکٹر صاحب کہہ رہے ہیں کہ خنزیر کے علاوہ ہر جانور ان کے لیے حلال ہے اور

پرانے اور نئے قادیانیوں کا ذبیحہ بھی ان کے لیے حلال ہے۔ یہ ڈاکٹر صاحب قرآن مجید کی تفسیر نہیں کر رہے تو اور کیا کر رہے ہیں کہ حلال تو ان کے نزدیک قرآن مجید ہی سے ثابت ہوتا ہے۔ اور قرآن مجید میں تو واضح طور خنزیر کے علاوہ جانوروں کو نہ تو حلال کہا گیا ہے اور نہ ہی نئے اور پرانے قادیانیوں کے ذبیحے کا ذکر ہے۔

پس کسی باطنی تفسیر سے ہی ڈاکٹر صاحب ثابت کر سکتے ہیں کہ پرانے اور نئے قادیانی خنزیر کے علاوہ کتا بلا بھی اللہ کے نام پر ذبح کر دیں تو اس کا کھانا ڈاکٹر صاحب کے لیے حلال ہو گا۔ عجیب بات تو یہ ہے کہ ان کا ختم نبوت پر ایمان اتنا پکا ہے کہ قادیانیوں سے ذبح کروانے اور اس ذبیحہ کے کھانے سے بھی اس ایمان پر کوئی اثر نہیں پڑ رہا۔

مولانا امجد عباس صاحب

ہر مذہب اور مسلک میں جہاں آپ کو خوارجی اور غالی فکر کے علماء ملیں گے کہ جو اپنے علاوہ کسی کو مسلمان نہ سمجھتے ہوں گے، اسی طرح ہر مذہب اور مسلک میں کچھ ایسے علماء بھی ہوتے ہیں جو دوسرے مذاہب اور مسالک سے زیادہ اپنے مذہب اور مسلک کی اصلاح کے لیے فکر مند رہتے ہیں۔ شیعہ مذہب میں در آنے والی خرافات کی اصلاح اور مذہبی انتہا پسندی کے خاتمہ کے لیے جن شیعہ علماء نے بہت سی قربانیاں دیں، ان میں معروف ایرانی عالم الامام الاکبر سید ابو الحسن الموسوی الاصفہانی اور اُن کے پوتے ڈاکٹر موسیٰ الموسوی کی کوششیں خاص طور پر قابل تعریف ہیں۔

علاوہ ازیں علامہ آیت اللہ شریعت سنغلجلی، سید ابو الفضل آیت اللہ العظمی البرقعی، الاستاذ علی الاکبر حکمی زادہ، علامہ ڈاکٹر علی شریعتی، علامہ نعمت اللہ صالحہ نجف آبادی، الاستاذ حیدر علی بن اسماعیل قلمداران، السید مصطفی طبطبائی، علامہ احمد کسروی، سید حسن الموسوی کربلائی نجفی رحمہم اللہ اور ہمارے فیس بک کے دوست امجد عباس جیسے شیعہ علما کی کوششیں خراجِ تحسین کے لائق ہیں۔ یہ حضرات نہ صرف اپنے مذہب کے مصلحین ہیں بلکہ شیعہ سنی اتحاد اور مفاہمت میں بھی ان کا کام قابل تعریف ہے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ اس قسم کی کاوشوں کے نتیجے میں شیعہ سنی اختلافات ختم تو نہ ہوں گے

لیکن قابل برداشت ضرور ہو جائیں گے۔

ان شیعہ علماء میں سے بعض وہ بھی ہیں کہ جن پر اہل تشیع کی طرف سے یہ طعن بھی کیا گیا کہ وہ شیعیت ترک کر چکے ہیں لیکن ہماری رائے میں یہ طعن درست نہیں ہے۔ ہر مکتب فکر میں جب کچھ علماء نے اس مکتب فکر کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا تو انہیں سب سے پہلے اپنے مکتب فکر کے لوگوں کی طرف سے یہی طعن سننے کو ملا کہ وہ مکتب فکر کو چھوڑ چکے ہیں۔ بلاشبہ ہر مذہب اور مسلک میں مذہبی دوکانداروں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے جو دوسرے مذہب اور مسلک کے خلاف اپنے لوگوں کے جذبات کو بھڑکا کر خوب اپنی دنیا بناتے ہیں اور ایسے لوگوں کو پہچاننے کی ضرورت ہے۔

سید ابوالحسن الموسوی بہت بڑے ایرانی شیعہ عالم اور فقیہ ہیں۔ ان کے علم کے بارے میں یہ قول شیعہ میں بڑا معروف ہے: أنسی من قبله وأتعب من بعده۔ یعنی اپنے سے پہلے لوگوں کو بھلوا دیا اور اپنے بعد والوں کو عاجز کر دیا۔ ان کے پوتے ڈاکٹر موسیٰ الموسوی نے طہران یونیورسٹی سے اسلامی قانون میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ پیرس یونیورسٹی سے فلسفہ میں پی ایچ ڈی کی۔ عراق، جرمنی، لیبیا اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں تدریس کی۔ شیعہ کے عقائد اور رسومات کی تصحیح پر کئی کتب لکھیں جن میں سے معروف کتاب "الشیعة والتصحیح" ہے جس کا اُردو ترجمہ "اصلاحِ شیعہ" کے نام سے شائع ہوا ہے۔

علامہ آیت اللہ شریعت سنغلجلی نے شیعہ مذہب کی اصلاح کے لیے "الإسلام والرجعة"، سید ابوالفضل آیت اللہ العظمی البرقعی نے "کسر الصنم"، الاستاذ علی الاکبر حکمی زادہ نے "اسرار ہزار سالہ"، علامہ ڈاکٹر علی شریعتی نے "التشیع العلو والتشیع الصفو"، علامہ نعمت اللہ صالحہ نجف آبادی نے "شہید جاوید"، الاستاذ حیدر علی بن اسماعیل قلمداران نے "طریق النجاة من شر الغلاة"، علامہ احمد کسروی نے "التشیع والشیعة" اور سید حسن الموسوی کربلائی نجفی نے "ثم للتاریخ" مرتب کیں۔ کاش کہ پاکستان میں بھی یونیوسٹیوں سے پڑھے لکھے شیعہ نوجوان اپنے مذہب کے ان

مصلحین کی تحریک کو آگے بڑھا کر امت میں اتحاد کی راہ ہموار کریں۔ میری فرینڈز لسٹ میں جتنے شیعہ دوست ہیں، ان سے گزارش ہے کہ وہ شیعہ عالم دین امجد عباس کی وال ضرور وزٹ کیا کریں۔[1]

ڈاکٹر اثر الاسلام سید

حضرت کا نام اثر الاسلام ہے، اپنے آپ کو مفکر قرآن کہلواتے ہیں، جنت پارٹی کے نام سے ایک پارٹی کے سربراہ ہیں، اب معلوم نہیں اس پارٹی کے کارکنوں کی تعداد پرویز مشرف کی پارٹی کے کارکنان سے تھوڑی زیادہ ہے یا کم لیکن حضرت کا دعوی یہ ہے کہ فیس بک کی برکت سے دو کروڑ پاکستانی عوام ان سے واقف ہیں۔

حضرت کے بہت سے سیاسی، معاشی اور مذہبی ایجنڈے ہیں۔ سیاسی ایجنڈوں میں سے اہم تر یہ ہے کہ موجودہ آرمی کو ختم کر کے ایک نئ آرمی تشکیل دیں کہ جس کے کمانڈر ان چیف وہ خود ہوں گے، اور اس آرمی میں ہر پاکستانی مرد اور عورت کو ایک کمشنڈ آفیسر کی حیثیت حاصل ہو گی۔ ان کے دور خلافت میں کمیونزم کا راج ہو گا اور ہر پاکستانی صاحب ملازمت ہو گا۔

ہمیں اس وقت حضرت کی سیاسی پرواز پر نہیں بلکہ ان کے مذہبی شعور پر کچھ گفتگو کرنی ہے۔ مفکر قرآن آیت مبارکہ ﴿لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ﴾ کی تشریح میں بیان فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں لفظ "دین" سے مراد گورنمنٹ ہے کہ ایک گورنمنٹ نبی کریم ﷺ نے قائم کی تھی اور دوسری مسیلمہ کذاب کی تھی۔ مفکر قرآن کا کہنا یہ بھی ہے کہ قرآن مجید کے لفظ "الحج البیت" یعنی بیت اللہ کے حج سے مراد ڈیفنس منسٹری ہے اور "عمرہ" سے مراد امیگریشن کے قوانین ہیں۔

مفکر قرآن کا کہنا ہے کہ نماز روزہ زمانہ ملوکیت کی ایجاد ہے، مولویوں نے عبادات کے نام پر عوام کو مذہبی افیون پلا رکھی ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کے زمانے میں رمضان کا مہینہ تک موجود نہ تھا۔ بلاشبہ ان صاحب کا سارا فکر قرآنی پرویز

[1] https://www.facebook.com/AmjadAbbasMufti?fref=ts

سے مستعار ہے اور علماء پرویز کو کافی وشافی جواب دے چکے ہیں جیسا کہ ڈاکٹر محمد دین قاسمی صاحب کی کتابیں تو اس بارے لاجواب ہیں۔

لیکن ایک بات تشویش ناک ضرور ہے کہ اس قسم کے مسخرے اب اپنا پیغام پھیلانے کے لیے ویڈیو کو بطور میڈیم استعمال کر رہے ہیں اور اس سے بہت فساد پھیل رہا ہے۔ مثلاً انہی صاحب کے آفیشل پیج پر ان کی یہ ویڈیو کہ جس میں رمضان، نماز، روزے کو افیون قرار دیا گیا ہے، کو چار لاکھ سے زائد لوگوں نے دیکھا اور چھ ہزار سے زائد نے شیئر بھی کیا حالانکہ انتہائی سطحی اور بچگانہ باتیں ہیں کہ جن کا جواب مدرسے کی پہلی کلاس کے طالب علم کو بھی سوجھ سکتا ہے۔

قاری حنیف ڈار صاحب اور انجینئر محمد علی مرزا صاحب کے پاس بھی عموماً یہی دلیل ہوتی ہے کہ ہمیں اتنے لوگ پسند کرتے ہیں یا سنتے ہیں تو یہ صاحب تو پسندیدگی میں اور سامعین کی تعداد کے اعتبار سے ان سے بہت آگے ہیں۔ بعض نوجوان علماء کو اس طرف توجہ دینی چاہیے کہ وہ ویڈیو ریکارڈنگ کے ذریعے فتنوں کا مقابلہ کریں کہ اب کے پڑھنے لکھنے کا رجحان ختم ہو چکا ہے۔ یہ جہالت کا زمانہ ہے، اور زمانہ جاہلیت میں زیادہ سننے دیکھنے والے لوگ ہوتے ہیں نہ کہ پڑھنے لکھنے والے۔

اب علماء اپنی ویڈیو ریکارڈنگ میں قرآن مجید کی تفسیر بیان کرنے کی بجائے ان نام نہاد مفکرین قرآن کو ریسپانس کریں، یہ زیادہ اہم ہے۔ آپ کی تفسیر کی دو سو گھنٹے کی ریکارڈنگ کوئی نہیں دیکھنے والا جبکہ دس منٹ کے ریسپانس کو پچاس ہزار دیکھیں گے، یہ حقیقت ہے کہ یہی معاشرے کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر شبیر احمد اور انکار حدیث

منکرین حدیث اپنی چرب زبانی کے ذریعے حدیث کے بارے ویسے ہی غلط فہمیاں گھڑتے ہیں جیسا کہ ملحدین قرآن مجید کے بارے۔ دونوں کے ذہنی پیٹرن اس معاملے میں ایک ہی طرح کام کرتے ہیں اور دونوں ماشاءاللہ سے غیر جانبدار تحقیق کے دعویدار ہیں۔ مثال کے طور ڈاکٹر شبیر احمد کا کیس لے لیں۔

ڈاکٹر شبیر احمد نے انکار حدیث پر ایک کتاب لکھی کہ جس کا عنوان "اسلام کے مجرم" تھا کہ جس میں محدثین، فقہاء اور علماء کو اسلام کا مجرم قرار دیا گیا کہ انہوں نے ایسی روایتیں بیان کی ہیں کہ جن میں بے حیائی اور فحاشی ہے۔ اس کے جواب میں محمد حسین میمن صاحب نے "اسلام کے مجرم کون؟" کے نام سے کتاب لکھی کہ جس میں منکرین حدیث کی جدلیات اور دجلیات پر خوب روشنی ڈالی ہے کہ حدیث پر تنقید کرتے ہوئے ظالموں نے عربی عبارات کو اپنے معانی پہنائے ہیں۔

امر واقعہ یہ ہے کہ منکرین حدیث کی ایک جماعت احادیث سے عوام الناس کو متنفر کرنے کے لیے باقاعدہ حدیثوں کو وہ معانی پہنانے کی کوشش کرتی ہے کہ جو ان کے گھٹیا ذہن میں موجود ہوتے ہیں۔ ذیل میں ہم نمونے کے طور اس کی ایک مثال پیش کیے دیتے ہیں۔ ڈاکٹر شبیر احمد نے اپنی کتاب "اسلام کے مجرم" ص 26 پر لکھا ہے:

"عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور میں ایک ٹب میں نہاتے تھے۔"

حالانکہ صحیح بخاری میں ایسی کوئی حدیث موجود نہیں ہے جس میں یہ منقول ہو کہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور میں ایک ٹب میں نہاتے تھے۔" صحیح بخاری کی روایت کے جو الفاظ ہیں، وہ درج ذیل ہیں:

«كُنْتُ أَغْتَسِلُ أَنَا وَالنَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ إِنَاءٍ وَاحِدٍ، تَخْتَلِفُ أَيْدِينَا فِيهِ»

"میں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی برتن سے پانی لے کر غسل کرتے تھے جبکہ ہمارے ہاتھ آپ میں ایک دوسرے کو مس بھی کرتے تھے۔"

جبکہ صحیح مسلم کی ایک روایت کے الفاظ ہیں: «من إناء - بيني وبينه - واحد»۔ یعنی میرے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ایک برتن ہوتا تھا۔

اس حدیث سے جو بات معلوم ہوتی ہے، وہ صرف اتنی ہے کہ شوہر اپنی بیوی کے ساتھ غسل کر سکتا ہے۔ اس میں اعتراض کی بھلا کیا بات ہے؟ اگر اعتراض یہ ہے کہ اس طرح پردہ پوشی نہیں ہو رہی تھی تو صحیح بخاری اور صحیح مسلم ہی کی روایت کے الفاظ ہیں کہ ازواج کے گھروں میں چراغ نہیں ہوتے تھے۔ پس اندھیرے میں میاں بیوی کا ایک

ہی برتن سے پانی لے کر اکٹھے نہانا، کس قرآنی دلیل کے خلاف ہے؟ اور تو اور جب یہ منکرین احادیث ایسی روایات کے بارے یہ کہتے ہیں کہ یہ فحش روایات ہیں تو سمجھ نہیں آتی کہ ان کے نزدیک فحش کہتے کسے ہیں؟ اگر تمہارا فحش کا یہی معیار ہے تو ملحدین نے تو قرآن مجید میں موجود حضرت یوسف علیہ السلام اور عزیز مصر کی بیوی کے واقعے کو بھی داستان عشق قرار دیا ہے۔ پس جس طرح ملحدین قرآن مجید سے فحش نکالنے میں دجل سے کام لے رہے ہیں، اسی طرح منکرین حدیث احادیث سے بے حیائی ثابت کرنے میں فریب سے کام لے رہے ہیں۔

قاری حنیف ڈار صاحب کے انکشافات

محترم قاری حنیف ڈار صاحب نے انکشاف ٹی وی کی ویب سائیٹ پر "آج کل درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے" میں کچھ انکشافات کیے ہیں کہ جن میں سے بعض کو ہم نیچے قوسین میں بیان کر کے اس پر اپنا تبصرہ بھی نقل کر رہے ہیں کہ بعض دوستوں نے اس پر تبصرہ کی خواہش ظاہر کی تھی۔ قاری صاحب اپنی تعریف میں رطب اللسان ہوتے ہوئے فرماتے ہیں:

> "میرے خطبات کی آڈیوز پورے برصغیر پاک وہند اور بنگلہ دیش میں پھیل چکی تھیں۔ ہندوستان کی ویگنوں میں میرے آڈیو کیسیٹ چلتے تھے تو دبئی کی ہر دوسری ٹیکسی میں میرے کیسٹس موجود تھے۔ پرائیویٹ گاڑیوں میں بھی سنے جاتے تھے، گھروں میں بھی سنے جاتے تھے۔ جاپان، برطانیہ، کنیڈا آرڈر پر منگوائے جاتے تھے۔"

جناب قاری صاحب! کیسٹس تو عطاء اللہ خان عیسی خیلوی کے آپ سے زیادہ بکتے اور سنے جاتے ہیں۔ اور ہاں! آپ کے جتنے کیسٹس پورے یورپ میں بکتے ہوں گے، اس سے دوگنا تو جناب عیسی خیلوی صاحب کے صرف میانوالی ڈسٹرکٹ میں بک جاتے ہوں گے۔ کسی کے سامعین کا زیادہ ہونا اگر اس کے دینی فکر کے صحیح ہونے کی دلیل ہے تو مبارک ہو کہ ڈاکٹر عامر لیاقت صاحب آپ سے کہیں زیادہ سلامتی فکر کے حامل ہیں۔

جناب قاری صاحب لکھتے ہیں:

"یوٹیوب پر میرے خطبے ہر موضوع پر موجود ہیں جن میں، میں نے وہی سب کچھ کہا ہوا ہے جو اسلاف کہتے چلے آئے ہیں اور جن کا مربہ مدارس میں ڈالا جارہا ہے، اور جو کچھ ہم اپنے علماء سے سنتے چلے آئے تھے۔ اس میں جمع قرآن کی روایات اور قصے، عیسی علیہ السلام کی واپسی، دجال کے خروج، امام مہدی کے ظہور سمیت سب مصالحہ موجود ہے۔ احادیث کی وہ تمام روایتیں جن پر آج مجھے اعتراض ہے اور جن کے خلاف میں لکھتا ہوں وہ سب خود میرے اپنے بیانات میں موجود ہے۔"

جناب قاری صاحب! مربہ اور مسالہ مدارس اور کتب احادیث میں نہیں بلکہ آپ کے افکار اور بیان میں ہے۔ افکار آپ کے ہڑہڑ کا مربہ ہیں تو بیان آپ کا سرخ اور ہری مرچوں کا مسالہ۔ آپ ہی سے سوال ہے کہ کیا اللہ تعالی کسی کو ہدایت دینے کے بعد اس کو گمراہ نہیں کرتا۔ اگر نہیں تو اللہ نے ہمیں یہ دعا کیوں سکھائی ہے کہ "اے ہمارے رب! ہمارے دلوں کو ہدایت دینے کے بعد ٹیڑھا نہ کر دینا۔"

امر واقعہ یہ ہے کہ لوگوں کو آپ سے شکایت یہ نہیں ہے کہ آپ ان کی بات نہیں مانتے یا آپ حدیثوں کی تحقیق کیوں کرنا چاہتے ہیں۔ لوگوں کو آپ سے شکایت یہ ہے کہ آپ بازاری زبان استعمال کرتے ہیں اور اس بارے اللہ کے رسول ﷺ کے صحابہ تک کو معاف نہیں کرتے۔ آپ سلطان راہی کے لب و لہجے میں ائمہ دین کو مخاطب کرتے ہیں۔ آپ کی زبان و بیان گواہ ہے کہ درد آپ کے دل میں نہیں، آپ کے پیٹ میں ہے۔ جناب قاری صاحب لکھتے ہیں:

"میری معلومات کا اصلی ذریعہ عالم عرب اور عربی لٹریچر ہے جہاں الحاد کا ایک طوفان کھڑا ہو چکا ہے۔ میری تو نیند اڑ چکی ہے، عرب نوجوان جس کی مادری زبان عربی ہے وہ باغی اور ملحد ہو چکا۔ زیادہ نہیں بس 8 یا 10 سال کے اندر آپ اس کو موسلا دھار بارش کی طرح برستا دیکھیں گے۔ عرض کرتا رہتا ہوں کہ عام عرب نہیں وہ اساتذہ جن کی زندگیاں پڑھتے پڑھاتے گزر گئی ہیں، جو ایک

کرتے میں جامعہ ازھر میں بٹھائے گئے تھے اور جن کو پڑھاتے ہوئے 18 سال ہو گئے ہیں، وہی صحاح ستہ کو الحاد کی فیکٹریاں کہتے ہیں۔"

جناب قاری صاحب! یا تو جس عرب دنیا کی آپ بات کر رہے ہیں وہ کہیں گوجر خان کے نواح میں آباد ہے یا پھر آپ کا دعوی ایسا ہے جیسا کہ میں کہوں کہ سارا یورپ مسلمان ہو رہا ہے، مغرب کا نوجوان الحاد سے باغی ہو چکا ہے۔ ارے، جانیں دیں قاری صاحب! شاید کوئی فلمی سین آپ نے دیکھ لیا ہے۔ اب کی بار حج یا عمرے پر جانے کا اتفاق ہو تو وہاں عرب نوجوانوں کی تعداد گنیے گا۔

اور آپ کا یہ انکشاف تو سردار جی کے کسی لطیفے سے کم نہیں ہے کہ عالم عرب میں علماء صحاح ستہ کو الحاد کی فیکٹریاں قرار دے رہے ہیں۔ آپ کو عالم عرب کا کیا پتا؟ عالم عرب میں پچھلی تین دہائیوں میں جو دین کا کام ہوا ہے، وہ پوری تین صدیوں میں نہیں ہوا ہے۔ علمی سطح پر، اصلاحی سطح پر اور تحریکی سطح پر۔ کبھی ملتقى أهل الحديث، ألوكة، ابتسامة جیسے نیٹ فورمز پر بیٹھیے گا تو معلوم ہو گا کہ علم کی کسی اور ہی دنیا میں آ گئے ہیں، اور وہاں سارا عرب نوجوان بیٹھا ہے۔

اور کبھی بیروت سے پبلش ہونے والی دینی کتب کی فہرست ایک نظر دیکھ لیں۔ اور نہ سہی تو کم از کم سلطان ڈاٹ آرگ نامی ویب سائیٹ پر ہی ایک نظر ڈال لیں تو کافی افاقہ ہو گا یہ جان کر کہ عالم عرب میں دین کی کتنی خدمت کیسے کیسے اور کہاں کہاں ہو رہی ہے۔ لکھنے کو تو بہت کچھ لکھ سکتا ہوں لیکن سمجھنے والے کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔ لیکن مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ اب تو آپ کے لیے اشارہ بھی کافی نہیں رہا کہ آپ کو مفتی زاہد صاحب، رعایت اللہ فاروقی صاحب اور سید متین احمد صاحب وغیرہ بہت اشارے کر چکے ہیں۔

مذہبی دکان

ایڈیٹر "مکالمہ" جناب ایڈوکیٹ انعام رانا صاحب، اپنے ممدوح قاری حنیف ڈار صاحب کی تعریف میں کچھ یوں رطب اللسان ہیں:

"قاری صاحب کو میں اب اتنا جانتا ہوں کہ یہ کہہ سکوں کہ ہم خوش نصیب ہیں کہ قاری صاحب نصیب ہیں۔ بدلتے دور میں تبلیغ کے انداز بھی بدلے ہیں اور مرشد نے وہ انداز استعمال کیے ہیں کہ آپ ملحد ہیں یا جھلمل مسلمان، آپ وہابی ہیں یا شیعہ، بریلوی ہیں یا دیوبندی، عورت ہیں یا مرد (یا مکس)، مدرسے والے ہیں یا یونیورسٹی والے؛ آپ کو دوکان سے خالی ہاتھ نہیں لوٹایا جائے گا۔"

کسی دوست نے اس پوسٹ پر کمنٹ کرنے کو کہا، مجھے تو ابھی تک یہ سمجھ نہیں آرہی کہ یہ تعریف ہے یا تنقیص؟ عجب دکان ہے کہ ملحد اور مومن دونوں فیض پاتے ہیں۔ اللہ بخشے، ہمارے ایک دوست کہا کرتے تھے کہ اللہ میاں نے ہر لیڈر کے حق میں کچھ "جھلے" لکھ دیے ہیں، جو اسے مل کر رہنے والے ہیں لہذا زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ تقدیر کا معاملہ ہے اور ہم تقدیر پر ایمان رکھتے ہیں۔ بعض اوقات کسی فیس بکوی امام کی وال پر والہانہ کمنٹس کی بھرمار دیکھ کر یہ قول زریں یاد آجاتا ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ اور پروفیسر طفیل ہاشمی صاحب

پروفیسر طفیل ہاشمی صاحب نے ایک عرصے سے اپنی فیس بک وال کو حدیثوں اور صحیح بخاری کے لیے طعن اور تشنیع سے مزین تحریروں کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ اب کی بار کہتے ہیں کہ مجھے معلوم نہیں کہ حدیث کی کتاب مرتب کی ہے یا حنفیہ کے خلاف چارج شیٹ تیار کی ہے۔ وہ پروفیسر صاحب جو یہ دعوی کرتے نہیں تھکتے کہ میرا کسی فرقے سے تعلق نہیں ہے، صحیح بخاری کو حنفیہ کے خلاف چارٹ شیٹ قرار دے کر حنفیوں کو اہل حدیث کے خلاف بھڑکانے کا مذہبی فرض سرانجام نہیں دے رہے؟ ہم اس پر لکھ چکے ہیں کہ "فرقہ واریت"، علمی روایتوں کے حاملین کو آپس میں بھڑکانے اور آگ لگانے کا مزاج ہے وہ پروفیسر صاحب میں ماشاءاللہ! مولویوں سے زیادہ موجود ہے۔

پروفیسر صاحب! آپ کا تعلق کسی فرقے سے ہو یا نہ ہو لیکن یہ ضرور ہے کہ اہل حدیثوں کا کہنا ہے کہ آپ کی بہت سی پوسٹوں میں اہل الحدیث اور محدثین عظام سے بغض ایسے ہی چھلک کر باہر آرہا ہوتا ہے جیسا کہ کسی پیالے سے شراب۔ ان کا کہنا ہے کہ

جن مولویوں کو فرقہ واریت کے نام پر لعن طعن کرتے آپ نہیں تھکتے، انہی کے اسٹائل میں تو آپ مذہبی منافرت پھیلا رہے ہیں۔

آپ کو امام بخاری رحمہ اللہ سے اختلاف کا حق ہے، ٹھیک ہے ہو گا۔ آپ کو بخاری، محدثین اور اہل حدیث سے بغض رکھنے کا حق ہے، ٹھیک ہے ہو گا۔ آپ نے بخاری کے خلاف پوسٹیں لگا دی تھیں، حدیثوں کا مذاق اڑا لیا تھا، لوگوں نے بھی تبصرہ کر دیا تھا، اور آپ ہیں کہ امام بخاری رحمہ اللہ اور حدیثوں کی جان چھوڑنے پر ہی نہیں آ رہے، حدیثوں کے خلاف مہم جوئی ہی شروع کر دی ہے، کچھ آپ ہی اپنی اداؤں پر غور کریں۔

ایک طرف وہ اہل حدیث علماء ہیں کہ جو یہ ثابت کر رہے ہیں کہ امام بخاری رحمہ اللہ کی "قال بعض الناس" سے مراد، حنفیہ نہیں ہے۔ اور امام بخاری رحمہ اللہ، اہل الرائے سے اپنی صحیح بخاری میں کیسے استفادہ کرتے نظر آتے ہیں۔ اور وہ سلفی علماء بھی ہیں جو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے مناقب اور فضائل پر کتابیں مرتب کر رہے ہیں۔ اور دوسری طرف آپ جیسے پروفیسر صاحب ہیں، جو ان کے دبے ہوئے تعصب کو پھونکیں مار کر ہوا دے رہے ہیں۔

باقی، اہل الحدیث اور اہل الرائے کا اختلاف شروع سے ہی ہے اور چلتا رہے گا۔ دونوں طرف کے سنجیدہ علماء نے علمی انداز میں ایک دوسرے پر نقد کیا ہے اور کرتے رہیں گے لیکن کبار محدثین کے بارے آپ کی زبان ہرگز مہذب زبان کہلانے کی حقدار نہیں ہے، بھلے آپ اصول تحقیق کا کورس پچھلے تیس سال سے پڑھا رہے ہوں۔ لوگوں کے بھی دل ہیں، ان کے بھی جذبات ہیں، جب آپ ان کو اذیت دیں گے تو آپ جواب میں ان سے کیا توقع رکھتے ہیں؟

امام بخاری رحمہ اللہ کے خلاف آپ ہی کی زبان اور اسلوب کلام کی برکات ہیں کہ آپ کے داڑھی والے تبلیغی فالورز، بخاری کی حدیثوں کے خلاف ہر پوسٹ پر کمنٹس میں ڈھول لے کر مراثیوں کی طرح دھمال ڈالنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اور اب اس پوسٹ کو بھی حسب عادت ایک فرقہ وارانہ پوسٹ کہہ کر جان چھڑا لیں کہ چور بھی کہے چور چور

چور۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہماری زبان سخت ہے لیکن اس سختی کا آغاز آپ کی طرف سے ہوا ہے، اور وہ بھی ہمارے بڑوں کے خلاف۔

پروفیسر ڈاکٹر محی الدین ہاشمی صاحب کے ساتھ

ہاشمی صاحب سے پچھلے ہفتے "خطبات اسلام آباد" کے سلسلے میں پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی۔ بہت ہی ملنسار، نفیس الطبع، مہمان نواز، سنجیدہ، فکری ذوق رکھنے والے اور سب سے اہم کہ کچھ کر کے دنیا سے جانے کا جذبہ رکھنے والے سچے انسان اور پختہ عالم دین ہیں۔ جناب علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک تھاٹ، ہسٹری اینڈ کلچر کے چیئرمین ہیں اور تقریباً ساری زندگی اس شعبہ کی تعمیر و ترقی میں کھپا دی ہے۔

ان کی سرپرستی میں اس ڈیپارٹمنٹ کے تحت "خطبات اسلام آباد" کے نام سے سلسلہ وار خطبات کا ایک پروگرام شروع کیا گیا ہے کہ جس میں اب تک نو خطبات ہو چکے ہیں۔ ان خطبات کا مقصد امت مسلمہ کے ذہین اور فہیم عناصر میں نہ صرف غزو فکری (intellectual war) کا شعور بیدار کرنا ہے بلکہ انھیں خواب غفلت سے جگا کر اس کے لیے تیار کرنا بھی ہے۔ اگرچہ قوموں اور تہذیبوں کے عروج میں سب اہم کردار فکری کام کا ہوتا ہے لیکن امت میں نہ تو اس کا ذوق ہے اور نہ ہی اس کی طرف توجہ ہے۔ ایسے میں "خطبات اسلام آباد" جیسے مواقع اور ہاشمی صاحب جیسے اہل علم غنیمت ہیں کہ وہ نامساعد حالات کے باوجود اس کے لیے آواز بلند کر رہے ہیں۔

پچھلے ہفتے کا خطبہ دینے کا اعزاز راقم کو حاصل ہوا کہ جس کا موضوع "قرآن مجید کا نظریہ تاریخ اور معاصر نظریہ ہائے تاریخ کا تقابلی مطالعہ" تھا۔ اس موضوع کے تحت راقم نے نظریہ تاریخ، فلسفہ تاریخ اور تاریخ کی حرکیات یعنی وہ اصول کے جن کی بنیاد پر تاریخ حرکت کرتی اور آگے بڑھتی ہے، کے تصورات پر کچھ گزارشات پیش کیں کہ جنہیں بردار محترم حافظ طاہر الاسلام عسکری صاحب نے اپنی فیس بک وال سے آن لائن بھی کر دیا اور بعد میں بہت سے لوگوں نے فیس بک ہی سے دیکھ کر اس کے بارے اچھا فیڈ بیک بھی دیا تو گویا فیس بک لائیو ویڈیو کا تجربہ اچھا رہا۔

خطبے کا مقصد یہ تھا کہ امت مسلمہ بھی مغربی تاریخی بیانیوں، جدلیات، مادی جدلیات(Dialectical Materialism)،بقاءللا صلح (Survival of The Fittest)، تہذیبوں کا تصادم (Clash of Civilization) اور تاریخ کا خاتمہ (End of History) کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنا ایک تاریخی مہابیانیہ (meta narrative) تشکیل دینے کی ضرورت محسوس کرے اور اس کی طرف عملی اقدام کا آغاز کرے۔

مولانا عمار خان ناصر صاحب کی خدمت میں

آج کل عمار خان ناصر صاحب کا قلم صحابہ، فقہاء اور روایت پسندوں کے خلاف حالت استحاضہ میں ہے۔ اللہ عزوجل جلد شفائے کاملہ عاجلہ نصیب فرمائے۔ مولانا ہر دوسرے گھنٹے میں نئی پوسٹ میں روایت پسندوں کو طعنے مار کر اپنے بیانیے میں علمی وزن ڈالنا چاہتے ہیں۔ اللہ عزوجل مساعی جمیلہ قبول فرمائے۔ اس سے بدتر رویے کیا ہوں گے کہ آپ سے لڑائی میں کوئی آپ کے آباء واجداد کو ننگا کرنا شروع کر دے۔ اللہ عزوجل ہدایت نصیب فرمائے۔

محترم عمار صاحب! جھگڑا آپ کا آج کے مولویوں سے ہے اور آپ کے ساتھ اگر کسی نے زیادتی کی بھی ہے کہ جس کا آپ کو شکوہ ہے تو آج کے مولویوں نے کی ہے۔ اور آپ ہیں کہ اس کا بدلہ صحابہ کے ایسے آثار بیان کر کے لینا چاہتے ہیں کہ جنہیں پڑھ کر یہ مولوی شرمندہ ہو جائیں کہ دیکھو! تمہارے بڑے اپنی لونڈیوں کے ساتھ کیا کچھ کرتے تھے۔ پس مولویوں نے جب آپ کے استاذ جناب جاوید احمد غامدی صاحب پر نقد کی کہ وہ یونیورسٹی میں لڑکے اور لڑکی کے باہمی ہاتھ ملانے کو جائز قرار دیتے ہیں تو آپ نے جواب میں یہ کہنا شروع کر دیا کہ استاذ نے تو ہاتھ ملانے کی اجازت دی ہے جبکہ تمہارے صحابہ تو لونڈیوں کے ساتھ معلوم نہیں کیا کچھ کرتے تھے۔ اور یہی آثار آپ کی وال سے اٹھا اٹھا کر دہریوں نے اپنی تحریروں میں سجائے ہیں۔ اگرچہ آپ کا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا کہ دہریوں کو اسلام کا مذاق اڑانے کے لیے ایک دلیل مل جائے لیکن آپ کے اس عمل کا

نتیجہ تو یہی نکلا ہے۔

عمار صاحب کا کہنا یہ ہے کہ مولویوں نے بھی تو ان کے استاذ جناب غامدی صاحب کی تحقیر اور تذلیل کی ہے۔ مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ غامدی صاحب کے رد میں مذہبی حلقے ان پر زیادتی بھی کر جاتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ تو ہر گز نہیں ہے کہ کوئی اگر آپ کے استاذ کو برا کہے تو آپ اس کے استاذ کو برا کہیں۔ بھائی، استاذ کا کیا قصور ہے؟ پھر آپ نے تو مولویوں کے استاذ کو بھی برا نہیں کہا بلکہ سیدھا ہی صحابہ پر جا پہنچے کہ ان کے بارے ایسے آثار نکال لائے کہ جنہیں پڑھ کر ان مولویوں کے سر شرم سے جھک جائیں۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ اس طرح آپ انہیں چپ کروا سکتے ہیں تو چپ کروانے کا یہ طریقہ بہت ہی سطحی ہے۔ آپ انہیں لگام دیں، ضرور دیں لیکن ان کے باپ دادا کے قصے چھیڑ کر نہیں بلکہ انہیں ان کی اپنی اخلاقی حالت کا حوالہ دیتے ہوئے۔

باقی آپ اخلاق میں، تقوی میں مجھ سے بہتر ہوں گے بلکہ ہیں۔ معاصر مولویوں سے اچھے ہوں گے بلکہ ہیں۔ اور واقعتاً یہ الفاظ اسی شخص کے ہو سکتے ہیں جو اللہ سے حقیقی معنی میں ڈرنے والا ہو: "سچی بات یہی ہے کہ ریا اور عجب وغیرہ سے دل کو پاک کرنا تکلیف ما لا یطاق کے زمرے میں آتا ہے۔ خاص طور پر غزالی وغیرہ نے جو معیارات بتائے ہیں، وہ فرشتوں کی تحلیل نفسی میں تو مدد دے سکتے ہیں، ہمارے کسی کے کام کے نہیں۔" [از عمار خان ناصر]۔ لیکن آپ کے فکر اور رویوں میں جو کجی ہیں، سو وہ ہے اور اس کی نشاندہی ضروری ہے۔ واضح رہے کہ اخلاق اور رویوں میں فرق ہوتا ہے۔

محمد حسن الیاس صاحب کی خدمت میں

جناب محمد حسن الیاس صاحب اس اعتبار سے "مجمع البحرین" ہیں کہ جناب جاوید احمد غامدی صاحب کے داماد ہیں اور مولانا یوسف بنوری رحمہ اللہ کے نواسے ہیں۔ مولویوں کو ہر وقت نصیحتیں کرتے ہیں اور کرنی بھی چاہییں کہ مولوی کوئی معصوم تھوڑے ہیں۔ لیکن ہمیں شکوہ یہ ہے کہ جو نصیحتیں وہ مولویوں کو کرتے ہیں، تو کیا خود انہی نصیحتوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے وہ اپنے آپ کو مولوی ہی ثابت نہیں کر رہے

ہوتے ہیں؟ جناب محمد حسن صاحب اپنی ایک حالیہ تحریر میں لکھتے ہیں:

"اے کاش! رسول اللہ ﷺ کے سامنے، قیامت میں، یہ سب کمنٹ پڑھ کر سنائے جائیں، جو ہمارے مولوی اپنے سے اختلاف کرنے والوں کی پوسٹ پر کرتے ہیں۔ ان دین کے سپاہیوں کو تب اللہ کے رسول بتائینگے کہ تمہاری دینی حمیت نے اگر تمہیں اخلاق نہ سکھایا تو کیا سکھایا۔"

اور یہی محمد حسن الیاس صاحب امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے بارے میں ایک پوسٹ بعنوان "امام ابو حنیفہ ناشتے کی ٹیبل پر" لگاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایک منٹ کے لیے تصور کریں... امام ابو حنیفہ ابھی سو کر اٹھے ہیں۔ مائے جاری کے کنویں کے تازہ پانی سے غسل فرما کر شہد اور کھجور سے ناشتہ کیا اور نبیز تمر کا گھونٹ بھرا ہے۔ پھر رسوئی سے نکل کر دو سو رکعات نفل ادا کرنے کے بعد اچانک انہیں یاد آیا ان کے استاد حماد نے انہیں ایک اسائمنٹ دیا تھا جہاد پر، اب آپ رحمہ اللہ اس موضوع پر علمی کام کرنا چاہتے ہیں۔ تو لاؤنج سے اسٹیڈی میں تشریف لاتے ہیں۔ جب آپ نے کام کا آغاز کرنا چاہا تو سامنے جو کل ذخیرہ معلومات موجود ہے وہ درج ذیل ہے۔ قران مجید کا ایک نسخہ، سن کر یاد کی ہوئی چند روایات، استاد کے درس کی یاداشتیں، اقصی المدینہ کے لوگوں کے تاثرات۔ اور... اور بس!"

پوسٹ جاری ہے اور مکالمہ کے اخلاق سیکھنے کے لیے پڑھنے کے قابل ہے۔ جناب حسن الیاس صاحب! بھلے امام صاحب علمی مقام و مرتبے میں آپ کے چھوٹے بھائی کی جگہ ہوں، لیکن بات تو انداز تخاطب کی ہے۔ آپ حضرات مولویوں کو ایسے مخاطب کرتے ہیں جیسے ان کے تو دل ہی نہیں ہے لیکن جب خود اپنے طبقے کی باری آتی ہے تو اخلاق کے امام بن جاتے ہیں۔ اب ذرا اپنی ہی وال پر اپنی بعض پوسٹوں کے اقتباسات ملاحظہ فرمائیں اور ہمیں بتلائیں کہ قیامت والے دن اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے آپ کے یہ اقتباسات رکھے جائیں گے تو کیا کہیں گے اللہ کے رسول ﷺ؟ تمہیں اگر مولویوں سے اختلاف تھا تو اس کا یہ مطلب تھوڑا تھا کہ ان پر زبان کے تیر چلا کر ان کے

سینے زخمی کرو۔ اور آپ کی تحریر میں طنز ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ آپ نے نہیں کرنا بلکہ اس نے کرنا ہوتا ہے کہ جس کے بارے آپ کی وہ تحریر ہوتی ہے۔

باقی ہم یہ نہیں کہتے کہ آپ کی ہر پوسٹ میں طنز ہوتا ہے لیکن لوگوں کو آپ سے شکایت ہے کہ آپ کی ہر دوسری پوسٹ میں طنز نظر آتا ہے۔ جیسا کہ آپ نے لکھا ہے:

"لیفٹیننٹ جنرل عاصم باجوہ نے ٹوئٹر پر پیغام میں کہا ہے کہ حملے کی اطلاع ملتے ہی فوج کی سریع الحرکت فورس کے دستے پشاور سے جائے وقوع پر پہنچ گئے اور علاقے کو گھیرے میں لے کر آپریشن شروع کر دیا۔ یہ سریع الحرکت فورس ان مذہبی اداروں تک کیوں نہیں پہنچ پاتی جہاں اس طرح کے حملوں کے مذہبی بیانیے پڑھے اور پڑھائے جاتے ہیں! "

مانا کہ آپ اقلیت میں ہیں، اور اقلیتوں کے حقوق ہوتے ہیں اور آپ اقلیتوں کے حقوق کے لیے آواز بھی اٹھاتے رہتے ہیں جیسا کہ آپ نے لکھا ہے کہ:

"اگر روز قیامت مرزا غلام احمد قادیانی اپنے مسیح ہونے کے دعوے پر جواب دہ ہونگے۔ تو یقیناً دوسرے کٹہرے میں مسلمان ان کی جماعت پر ظلم اور زیادتیوں کے جرم میں شرمندہ کھڑے ہونگے۔"

لیکن اقلیت ہونے کا مطلب یہ تھوڑا ہے کہ اکثریت کا کوئی حق ہی نہیں ہے، جو چاہے مرضی کہتے پھرو۔ اللہ عزوجل نے ہمیں عدل کا حکم دیا ہے، چاہے امیر ہو یا غریب، اقلیت ہو یا اکثریت۔ آپ ہمارے اچھے دوست ہیں، ہم سے اچھا بننے کی توقع رکھتے ہیں، آپ کی توقعات سر آنکھوں پر، لیکن کیا ہم بھی آپ سے ایسی ہی توقع رکھ سکتے ہیں؟ یا یہ طے ہے کہ اقلیت ہمیشہ معصوم ہی ہوتی ہے!

انجینئر محمد علی مرزا صاحب کی ایک ویڈیو پر تبصرہ

ایک دوست نے انجینئر محمد علی مرزا صاحب کی ایک ویڈیو شیئر کی ہے[1] اور پوچھا ہے

[1] https://www.facebook.com/waseem.akhter/videos/vb.568723410/10153992822408411/?type=2&theater

کہ اس ویڈیو میں کی گئی باتیں کس حد تک درست ہیں؟

انجینئر محمد علی مرزا، بنیادی طور مکینیکل انجینئر ہیں۔ چالیس سال کے قریب عمر ہے، جہلم شہر کے رہائشی ہیں۔ ڈیفنس منسٹری میں انیسویں گریڈ میں سرکاری ملازم ہیں۔ جہلم میں ہی قرآن وسنت ریسرچ اکیڈمی کے نام سے ایک ادارہ چلاتے ہیں۔ انہوں نے ایک سو سے زائد اختلافی موضوعات پر ویڈیو لیکچرز دیے ہیں۔ اپنے آپ کو کسی مکتب فکر سے وابستہ نہیں سمجھتے۔ دین کا باقاعدہ علم کسی مدرسہ سے حاصل نہیں کیا ہے اور وہ اسے ضروری بھی نہیں سمجھتے ہیں۔ مولویوں کو رگڑا لگانا ان کے پسندیدہ موضوعات میں سے ہے۔ وہ ایک داعی ہیں، عالم دین نہیں ہیں۔

دیکھیں! آپ کا تعلق کسی مسلک، جماعت، گروہ یا تنظیم سے ہو یا نہ ہو، جب بھی آپ پر نقد کی جاتی ہے، وہ سو فی صد غلط نہیں ہوتی، اور نہ ہی سو فی صد درست ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ بات دس فی صد ہو اور نقاد نے اسے سو فی صد بنا دیا ہو۔ پس انجنیئر محمد علی مرزا صاحب کی ویڈیو کے بارے ایک عمومی تبصرہ تو یہی ہے کہ اس میں مرزا صاحب نے نہ صرف مبالغہ کیا ہے بلکہ لوز ٹاکنگ کی ہے کہ ایک خرابی اگر پانچ فی صد میں تھی تو سو فی صد کو خراب بتلایا ہے اور اس طرح سے بتلایا ہے کہ اس پر حد قذف بھی واجب ہو جاتی ہے، اگر مرزا صاحب چار عینی شاہدین نہ لا سکیں تو۔ دوست نے کہا کہ کیا آپ مرزا صاحب کی لوز ٹاکنگ کی مثالیں دے سکتے ہیں۔ میں کہا کہ جیسے یہ بات کہ

"مولویوں کا علاج میرے پاس ہی ہے... ان کو جواب وہ دے گا جو دنیاوی طور پر بھی میرے جیسا پڑھا لکھا شخص ہو گا اور مولوی چوں وڑ کے نکلیا ہووے گا... کس مدرسے میں یہ کام [homosexuality] نہیں ہوتا... ایک مدرسے کو کلین چٹ دیں... اس سے اسکول ہزاروں درجہ بہتر ہیں... کیونکہ اسکولز میں ہاسٹلز نہیں ہوتے... ان میں یہاں بچوں کے ساتھ ٹیچرز یہ کام نہیں کر سکتے... لیکن مولویوں کے پاس رات کے وقت بھی بچے ایوے لیبل ہوتے ہیں اور دن کے وقت بھی، پردے میں بھی، اور یہ بچوں کے ساتھ منہ کالا کرتے ہیں... جو آپ غلط الزام لگائیں گے تو لا کے تہاڈے ہتھ وچ پھڑا دیں

گے... پانچ چھ سال میری عمر تھی، اس وقت سے میں نے مدرسوں میں جانا شروع کیا... تمام مکاتب فکر کے مدرسے بچیوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں، بچوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں، سب مجھے پتا ہے... جس فارغ التحصیل بچے نے مدرسہ سے پڑھا تو اسے کہیں کہ جو باتیں میں کر رہا ہوں، قرآن پر ہاتھ رکھ کر میری بات کا انکار کر دے..."

اگر آپ عالم دین ہیں یا علماء سے نسبت رکھتے ہیں تو آپ کی ذمہ داری یہ ہے کہ آپ مرزا صاحب کی باتوں پر غور کریں اور ان میں جو نقد درست ہے، اس کی بنیاد پر اپنی اصلاح کریں اور جو غلط ہے، اس کا رد کر دیں۔ مرزا صاحب کی یہ بات درست ہے کہ ایدھی پر نقد میں علماء افراط و تفریط کا شکار ہوئے ہیں۔ مرزا صاحب کی یہ بات بھی درست ہے کہ علماء کے طبقے میں علمائے سوء بھی موجود ہیں کہ ہر طبقے میں کالی بھیڑیں موجود ہوتی ہیں۔

لیکن مرزا صاحب کی جو نقد غلط ہے، وہ یہ ہے کہ وہ علماء پر نقد میں متوازن نہیں ہیں۔ وہ سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے ہیں۔ وہ یہ تو کہہ دیتے ہیں کہ علمائے حق بھی ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ مجھ سے نہ پوچھنا کہ وہ کون ہیں، میں نہیں جانتا لیکن دوسری طرف غیر علماء میں سے وہ کئی ایک ایسے نام گنوا دیتے ہیں کہ جوان کے نزدیک دین کی خدمت کا بہت کام کر رہے ہیں یا انہوں نے کیا ہے۔

مرزا صاحب کی ان ساری باتوں پر تبصرہ کیا جائے تو بات بہت لمبی ہو جائے گی۔ اگر صرف آخری بات کو ہی لے لیں کہ مرزا صاحب! اگر مولوی آپ سے یہ سوال پوچھ لے کہ آپ قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر بتلائیں کہ پانچ چھ سال کی عمر سے آپ کے بقول آپ مدرسہ جا رہے ہیں تو آپ کو کتنے استاذوں نے چھیڑا ہے؟ اور کتنے مدرسوں میں چھیڑا گیا ہے؟ کیا آپ کو اس طرح کا انداز گفتگو پسند آئے گا؟ ہرگز نہیں! تو آپ دوسروں کی بھی اصلاح اس طرح کے سلطان راہی کے انداز میں کرنا چاہیں گے کہ "لاہ کے ہتھ وچ پھڑا دیواں گا" تو آپ انہیں اور بگاڑ دیں گے۔ جب آپ کو پسند نہیں ہے

کہ کوئی آپ سے اس طرح سے گفتگو کرے تو آپ کیوں دوسروں سے اس انداز میں گفتگو کرتے ہیں؟

کیا آپ غور نہیں کرتے کہ اس طرح کی اصلاح سے دراصل آپ اصلاح نہیں فساد کا کام کر رہے ہیں؟ ٹھیک ہے، آپ کی اس ویڈیو کو ڈیڑھ ہزار لوگوں نے شیئر کیا ہے، پچیس ہزار لوگوں نے دیکھا ہے لیکن نیچے کمنٹس سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ شیئر کرنے والے لوگ کون ہیں، یہ وہ ہیں جو آپ کے بھی دوست نہیں ہیں۔ آپ نے اس ویڈیو کے ذریعے دراصل لبرلز کے ہاتھ میں، مولویوں نہیں بلکہ اسلام کے خلاف، ایک اور دلیل پکڑا دی ہے۔ ہم نے بھی مدرسہ میں پڑھا پڑھایا ہے لیکن آپ کے اس مبالغہ آمیز دعوی کے جواب میں "کہ ایک مدرسہ کو کلین چٹ دیں" یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ محض جھوٹ نہیں، بلکہ بہتان ہے۔

مدرسہ سے ہارورڈ تک

ملحقہ امیج ہمارے دوست مولانا مبشر حسین لاہوری صاحب کی ہے، کئی ایک کتابوں کے مصنف ہیں۔ معروف اہل حدیث عالم دین مولانا مبشر احمد ربانی صاحب کے شاگرد خاص رہے ہیں۔ مجلس تحقیق اسلامی، لاہور میں مولانا عبد الرحمن مدنی صاحب کے پاس کافی عرصہ کام کرتے رہے۔ پھر اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد چلے گئے اور آج کل ہارورڈ یونیورسٹی میں پوسٹ ڈاکٹریٹ کر رہے ہیں۔

ان کے بارے یہ امیج سوشل میڈیا اور واٹس ایپ گروپس میں کافی دنوں سے گردش کر رہی تھی اور مختلف قسم کے تبصرے بھی سننے کو مل رہے تھے۔ میں نے پہلی مرتبہ جب تصویر دیکھی تو یقین نہیں آیا کہ یہ مولانا مبشر حسین لاہوری صاحب ہیں جو کئی ایک دینی کتب کے مصنف ہیں کہ انہوں نے ہارورڈ جانے کے بعد نہ صرف اپنی داڑھی منڈوا دی بلکہ اب داڑھی منڈوانے کے حق میں دلائل بھی دے رہے ہیں۔ مجھے لگا یہ سب جھوٹ ہے، لیکن بعض دوستوں نے تصدیق کی کہ یہ سچ ہے، پھر ان کی وال سے بھی اس کی تصدیق ہو گئی کہ یہ سچ ہے۔

ڈاڑھی منڈوانے کے حق میں ان کی دلیل انہی کی زبانی سنیے:

"عالم عرب کے جو اہل علم داڑھی سے متعلقہ روایات کی "سنن العاداۃ" کے پس منظر میں تشریح کرتے ہیں، ان کی رائے اور دلایل کا اظہار میں نے 2005ء میں اپنی ایک کتاب "لباس کے اسلامی احکام" میں تفصیل سے کیا تھا۔ جس کا اندراج اس وقت اپنی کتابوں کی فہرست میں شامل اشاعت بھی کر دیا تھا مگر کچھ دوستوں کے مشورہ پر یہ کتاب آج ج تک شایع نہیں کر سکا۔ امریکہ میں اسلامی سنٹروں اور کانفرنسوں/سیمیناروں وغیرہ میں دنیا بھر سے آنے والے اہل علم سے تبادلہ خیال کے بعد اس رائے کی معقولیت میں مزید وزن محسوس ہوا اور یہ بھی اندازہ ہوا کہ برصغیر کا اسلام باقی عالم اسلام سے کتنا مختلف اور اپنے اندر کتنا "مقامی پن" رکھتا ہے۔ جب یہی بات ڈاکٹر محمود احمد غازی اور ظفر اسحاق انصاری جیسے اہل علم سے سنتے تھے تو کسی قدر "عجیب" لگتی تھی! امریکہ میں حالیہ قیام کے دوران حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے عرف و عادت سے متعلق جملہ مباحث کو پڑھنے سے بھی اس رائے کے بارے میں "لچک" پیدا کرنے کی طرف رجحان پیدا ہوتا ہے اور خاص طور پر اس لیے بھی کہ یہ کوئی ایسی سنت بہر حال نہیں ہے جس کے تارک پر "حد شرعی" شریعت نے عاید کی ہو یا جہنم کی وعید سنائی ہو۔ مزید تفصیل کے ساتھ دوطرفہ دلایل کا محاکمہ آیندہ کسی وقت پیش کروں گا۔"

یہ اب لوکل سے انٹرنیشنل اسکالر بن گئے ہیں، بہر حال وہ جو بھی بن جائیں، ہمیں اس سے کیا غرض۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگ مولوی بننے سے پہلے ہی سب کچھ بن چکے ہوتے ہیں لیکن انھیں اس کے اظہار کے مواقع بعد میں ملتے ہیں لہذا موقع ملنے پر جو وہ ہوتے ہیں، ظاہر ہو جاتے ہیں۔ البتہ اس بات کا افسوس ضرور ہوا کہ مبشر بھائی نے بطور ایک عالم دین کے اپنا سارا کیریئر تباہ کر کے رکھ دیا ہے، البتہ ان کا دنیاوی کیریئر اس عمل سے شاندار ضرور ہو جائے گا کہ اداروں میں انتظامی عہدوں سے عموماً ایسے ہی عالمی موقف کے حامل اسکالرز کو نوازا جاتا رہا ہے۔ بھائی، اگر ڈاڑھی رکھنا واجب نہیں ہے تو

گناہ بھی تو نہیں ہے لہذا رکھ لیتے تو کیا گناہ ہو جاتا۔ مولانا وحید الدین خان صاحب اتنے لبرل ہونے کے باوجود داڑھی رکھے ہوئے ہیں۔ داڑھی تو پچھلی صدی تک پوری دنیا میں مردانگی کی علامت سمجھی جاتی رہی ہے کہ یہی وجہ ہے کہ فرائیڈ، کارل مارکس، ڈارون وغیرہ تک کی داڑھی تھی۔

باقی جنہیں آپ مقامی پن کا طعنہ دے رہے ہیں، اور اب آپ ماشاءاللہ انٹر نیشنل اسکالر بن چکے ہیں، ان میں سے بہت سو جبکہ آپ پیدا بھی نہیں ہوئے تھے تو اس وقت یورپ اور امریکہ کے چکر لگا چکے تھے لیکن وہ داڑھی کے وجوب کے آج بھی قائل ہیں۔ کیا مفتی تقی عثمانی صاحب اور مولانا عبد الرحمن مدنی صاحب اور اس طرح کے بیسیوں علماء نے یورپ یا امریکہ نہیں دیکھا؟ لیکن اس کے باوجود ان کے مقامی موقف میں کوئی ایسی تبدیلی نہیں آئی کہ وہ عالمی بن جاتا۔ اور شیخ یوسف القرضاوی سے بڑا عالمی یا ماڈرن اسکالر کون ہو گا لیکن انہوں نے بھی لکھا ہے کہ سلف میں کوئی بھی ڈاڑھی مونڈنے کا قائل نہیں ہے البتہ ڈاڑھی کے زائد بال لینے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔

میرے ایک کولیگ جو کہ کمپیوٹر سائنس پڑھاتے ہیں، اور انہوں نے ہارورڈ میں بھی کچھ عرصہ گزارا ہے، تو وہ مدرسہ کے بچوں کو کمپیوٹر کی تعلیم دینا چاہ رہے تھے، تو میں انھیں یہی کہہ رہا تھا کہ ایک نیکی کا کام یہ ہے کہ دینداروں کو دنیا میں آگے بڑھائیں تو انہوں نے تو دنیا دیکھی نہیں لہذا جب دیکھتے ہیں تو فوراً مرعوب ہو جاتے ہیں لہذا یہ خطرے کا کام ہے۔ دوسرا یہ کام ہے کہ دنیاداروں کو دین پڑھائیں، یہ وہ لوگ ہیں جو کہ آج کی دنیا میں کچھ بڑا کام کر سکتے ہیں، اور تحریکوں نے یہی کام کیا ہے۔ آج جماعت اسلامی، تنظیم اسلامی اور تبلیغی جماعت کا ایک کارکن امریکہ کی یونیورسٹی میں سائنس کا مضمون پڑھاتے ہوئے بھی اسلام پر جو اعتماد رکھتا ہے اور اسلام کو جس طرح پریکٹس کرتا ہے، وہ آپ کے اسلامیات کے پروفیسر اور مسجد کے مولوی کو بھی نصیب نہیں ہے۔

ایک دوست نے کمنٹ کیا کہ داڑھی مونڈنا، فکر میں تبدیلی کا آغاز بھی ہو سکتا ہے۔ یاد رکھئے شروع میں غامدی صاحب بھی سید مودودی کی فکر کے اسیر تھے اور پھر امین

احسن اصلاحی کی دی گئی رخصتوں کی بھینٹ چڑھ گئے۔اور آج ہر مسلم چیز کا انکار کرتے نظر آتے ہیں۔ کیا گارنٹی ہے کہ داڑھی کے بعد مبشر حسین صاحب کی فکر میں مزید ارتقاوارد نہیں ہو گا۔ بلاشبہ اسلام میں داڑھی ہے،داڑھی میں اسلام نہیں لیکن یہ بات یاد رکھئے کہ اسلام میں داڑھی ہے۔ جب کہ موصوف غامدی اور اب مبشر حسین صاحب بھی اسکو اسلام سے دیس نکالا دے چکے ہیں۔ کوئی صاحب کسی مجبوری یا بشری یا ایمانی کمزوری کے تحت داڑھی نہ رکھیں تو میرے نزدیک قطعی لائق ملامت بات نہیں کہ ہم میں سے کس کا تقوی ایسا ہے کہ دوسرے کے اعمال کی کوتاہیوں پر تنقید کر سکے۔ لیکن الجھن وہاں ہوتی ہے جہاں اپنی مجبوری یا تقوی کی کمی کو علمی جواز فراہم کرنے کی کوشش میں داڑھی کو دین سے دیس نکالا دینے کی کوشش کی جاتی ہے، پھر یہ عمل نہ صرف مذموم بن جاتا ہے بلکہ درشتی و تنقید کا مستحق بھی۔

ناقدین کی خدمت میں

ڈاکٹر مبشر حسین لاہوری صاحب کے بارے پوسٹ پر بعض دوستوں نے کچھ ایسے کمنٹس کیے جو کہ نازیبا تھے تو میں نے ان کمنٹس کو بھی ڈیلیٹ کر دیا اور ان دوستوں کو بھی بلاک کر دیا کہ یہ کام ایک عرصے سے کر رہا ہوں۔ عموماً اس ایکٹوٹی کا مقصد ان لوگوں کی تربیت کرنا ہوتا ہے کہ جن کے نزدیک ''تنقید'' اور ''بکواس'' میں کوئی فرق نہیں ہوتا لیکن ان لوگوں کا ریسپانس یہ ہوتا ہے کہ تمہیں اپنے پر تنقید برداشت نہیں ہوتی حالانکہ انہیں تنقید کرنی نہیں آتی۔

یہ قصائیوں کی طرف آپ کے بال کاٹتے ہیں اور ساتھ میں یہ بھی خواہش رکھتے ہیں کہ آپ ان کے بال کاٹنے کی تعریف بھی کریں۔ بھائی مبشر صاحب کے فالوورز کے کئی اس طرح کے کمنٹس اور انباکس میسیجز اور موبائل میسیجز موصول ہوئے کہ جن میں سے ایک کو شیئر کر رہا ہوں، ضرور لائک فرمائیں تا کہ انھیں بھی کچھ سکون ملے۔ انھیں لگتا ہے کہ مجھ میں برداشت نہیں ہے۔ چلیں، ان کا یہ شکوہ تو شاید اس بہانے دور ہو جائے کہ ان کی تنقید اپنی وال پر شائع کر رہا ہوں۔ بھائی، اگر میں ایسا ہی

ہوں تو مجھے ایسی تنقید کیوں بری لگے اور اگر میں ایسا نہیں ہوں تو پھر تو بالکل بھی بری نہیں لگے گی۔ بہر حال ڈاکٹر مبشر حسین لاہوری صاحب کی ایک فالوور لکھتی ہیں:

> "ہیجڑوں کی طرح ڈاکٹر مبشر حسین صاحب اور دوسروں کو بلاک کیوں کر دیا؟ اور ان کے ایس ایم ایس کیوں ڈیلیٹ کر دیے؟ اپنی بار ہمت نہیں ہوئی سچ بات سننے کی؟ آگ لگی؟ ویسے بہت عالم بنتے ہو، جہالت کی انتہا ہے تم جیسے لوگوں پر! کوئی شرم ہوتی ہے!! کوئی حیا ہوتی ہے!! ریال کھانے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے!! حرام کھانے والو!!" [عائشہ مہک]

بس اتنا عرض کرنا ہے کہ ڈاکٹر مبشر حسین صاحب میرے پاس بلاک نہیں ہیں، باقی اللہ سے ہمیشہ دعا گو رہتا ہوں کہ پروردگار میری محبت میں کسی شاگرد یا فالوور کو اتنا اندھا نہ کرنا کہ مجھ پر تنقید سن کر وہ تنقید کرنے والے پر اس قسم کی چڑھائی کرے۔ یہاں سب کے جیالے موجود ہیں، کیا بریلوی، کیا دیوبندی اور کیا اہل حدیث۔ بس اللہ عزوجل ہمیں یہ توفیق نصیب فرمادے کہ جس پر تنقید کریں، اس کے حق میں تنہائی میں دعا کرنے والے بھی بن جائے۔ آمین یارب العالمین! یہی تنقید کو سیکھنے کا پہلا قدم ہے، چاہے تکلف سے ہی ہو۔

ہر دور کا ایک عمومی طعنہ ہوتا ہے، ایک دور میں ڈالروں کا طعنہ دیا جاتا تھا یعنی جس سے اختلاف ہوا، جھٹ کہہ دیا کہ امریکہ کا ایجنٹ ہے، اسے ڈالر ملتے ہیں۔ اب ڈالروں کی دہائی گزر چکی ہے، اب امریکہ پاکستان کے تعلق خراب ہیں لیکن پاکستان سعودی عرب کے تعلقات اچھے جا رہے ہیں، اب حکومت کو بھی سعودی عرب سے ریال ملتے ہیں اور ان لوگوں کو بھی جن پر آپ نے تنقید کرنی ہو، خاص طورا گروہ شخص اہل حدیث ہو تو اسے تو لازماً ہی ملتے ہوں گے۔

اتفاق اور اختلاف

اپنے مکتب فکر، اپنی جماعت اور اپنے مسلک کے لوگوں سے تو سب سیکھتے ہیں، مزہ تو تب ہے کہ آپ دوسرے مکتبہ فکر، مسلک اور جماعت کے لوگوں سے اختلاف کرتے

ہوئے، ان سے سیکھنے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کر لیں۔ پس فیس بک پر رہتے ہوں کم از کم تین افراد تو ایسے تلاش کر لیں کہ جو آپ کے مکتب فکر، جماعت اور مسلک کے تو نہ ہوں لیکن آپ ان سے اختلاف رکھنے کے باوجود ان سے سیکھتے بھی ہوں۔

میں اگرچہ سلفی فکر سے گہری ذہنی اور قلبی مناسبت رکھتا ہوں لیکن یہاں فیس بک پر جن تین دوستوں سے جو کہ سلفی نہیں ہیں، سب سے زیادہ سیکھنے کو ملتا ہے، ان میں رعایت اللہ فاروقی، ڈاکٹر زاہد صدیق مغل اور عظیم الرحمن عثمانی صاحب ہیں۔ فاروقی صاحب کا انداز صحافیانہ، مغل صاحب کا فلسفیانہ اور عثمانی صاحب کا اصلاحی ہے۔

تینوں میں جو چیز مشترک ہے، وہ گہرائی اور ذہانت ہے اور دوسرا روایت سے تمسک، اور یہ دونوں چیزیں میرے مزاج کو بہت اپیل کرتی ہے۔ اور جن کو میں پڑھتا ہوں، ان میں سب سے زیادہ ذہانت کا استعمال فاروقی صاحب کی تحریر، سب سے زیادہ گہرائی زاہد صدیق مغل صاحب کی تحریر میں اور سب سے زیادہ ترغیب عظیم الرحمن عثمانی صاحب کی تحریر میں ملتی ہے۔

اگر آپ ان تین حضرات کو نہیں پڑھتے تو ضرور پڑھا کریں، ان سے اختلاف بھی آپ کو کچھ سکھا جائے گا کہ ذہانت کی معراج وہی ہے، جو انسانی رویوں کے گہرے تجزیات سے پیدا ہوتی ہے۔ اور یہی اچھے لکھاری کی نشانی ہے کہ وہ اپنے مخالفین کو بھی کچھ نہ کچھ دے ہی جاتا ہے۔

باب پانزدہم

مسالک اور جماعتیں

اس باب میں مسالک اور جماعتوں کے بارے بنیادی سوالات پر بحث کی گئی ہے۔

میرا کوئی مسلک نہیں ہے!

میرا کوئی مسلک نہیں ہے، یہ بیان خود ایک مسلکی بیان ہے۔

تعبیر دین کا اختلاف

"تنوع" کے اختلاف میں دین کی ایک سے زیادہ تعبیریں صحیح ہو سکتی ہیں لیکن "تضاد" کے اختلاف میں دین کی ایک تعبیر ہی "حق" ہوتی ہے، باقی سب "باطل"۔ اسے مانے بغیر چارہ نہیں ہے۔

اخوان الصفا

وہ سات دوست تھے جو کہ شہر سے باہر ایک پہاڑ کی چوٹی پر حلقہ لگائے بیٹھے تھے تا کہ اس ویرانی سے وہ، وہ باتیں کر سکیں جو وہ شہر کی آبادی سے نہیں کر سکتے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ اس بار ہم یہاں اس لیے جمع ہوئے ہیں کہ ہم آدمی کی اچھل کود کی وجہ اور مقصد کو جان سکیں۔ دوسرے نے کہا کہ وہ وجہ یا تو پیٹ ہے، یا جنس ہے، یا دوسروں پر غالب آنے کی خواہش ہے۔

تیسرے نے کہا کہ ہم مذہبی آدمی کی بات کر رہے ہیں نہ کہ عام انسان کی، لہذا وجہ کے تعین میں تھوڑا خاص (specific) ہو جاؤ۔ چوتھے نے کہا کہ مذہبی آدمی کا المیہ بھی وہی ہے جو عام انسان کا ہے کہ جس قدر مذہبی علم میں اضافہ ہوتا ہے، اس کے شکوک وشبہات بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے علمی اجمال میں جو یقین کی کیفیت تھی، وہ علم کی تفصیل میں پڑنے سے شک میں تبدیل ہو گئی۔ تیسرے نے کہا کہ اسے شک کی ابتلاء کی بجائے یقین کے زوال کا نام دینا چاہیے۔

پانچویں نے کہا کہ مذہبی آدمی کا بحران اخلاقی ہے کہ سو میں سے پچانوے دوسروں کی اصلاح اور تربیت میں لگے ہیں۔ اصلاح وتبلیغ، دعوت وتربیت اور تحریک وجہاد کے نام پر ان میں سے ہر ایک لیڈر اور امام بننا چاہتا ہے، بھلے چار لوگوں کا ہی کیوں نہ ہو۔ ہر شخص اپنا ادارہ، اپنی جماعت، اپنی تحریک چاہتا ہے تا کہ اپنا "حق" (truth) دوسروں تک پہنچا

سکے۔ سو مذہبی آدمیوں میں سے پچانوے نے حق بات کی تبلیغ کے لیے اسپیکرز کھول رکھے ہیں اور عام انسان تو کجا خود انہیں کچھ سنائی نہیں دے رہا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں! دوسروں نے کہا کہ مسئلے کا حل کیا ہے؟ اس نے کہا کہ خاص انسان سے عام آدمی بننے کی کوشش کرو۔ اپنی اصلاح پر خوب توجہ دو جبکہ دوسروں کی اصلاح کے لیے اتنی مذہبی ایکٹوٹی کافی ہے کہ ہفتے میں ایک درس ہو گیا۔ اگر دین کے لیے بھی ایک "گدھے" کی طرح کام کرتے رہو گے تو جدید انسان کی طرح بہت جلد اس زندگی سے تھک جاؤ گے۔

چھٹے نے کہا کہ جب تم بچے کو یہ کہتے ہو کہ تم میں کچھ خاص ہے، تم یہ کر سکتے ہو، دنیا میں کچھ مشکل نہیں ہے تو اس کی تخلیق اور پروڈکٹوٹی دونوں بڑھ جاتی ہیں۔ اگر انسان کی زندگی سے "تحریک" نکال دو گے تو ان دونوں صلاحیتوں کو زنگ لگ جائے گا اور مذہبی آدمی کی ان دونوں صفات کے کامل اظہار کے بغیر نہ تو اس امت کے لیے دنیا کی امامت کا خواب پورا ہو سکتا ہے اور نہ ہی یہ خلافت ارضی کی مستحق قرار پا سکتی ہے۔ اور اس سب کچھ سے گزرے بغیر نہ ہی خود انسان مکمل ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس کی شخصیت کی تعمیر کا خواب پورا ہو سکتا ہے۔ اگر بڑے بڑے خواب نہیں دیکھو گے تو اپنے زندہ رہنے کی وجہ جواز کھو بیٹھو گے اور بہت جلد زندگی سے اکتا جاؤ گے۔ پس اس امت کا اصل المیہ تحریکی شعور کی کمی ہے۔

ساتویں نے کہا کہ ہمارا اصل مسئلہ علمی شعور کا نقص ہے، اسے پورا کر لو تو وہ سکون میسر آ جائے گا کہ جس کی تلاش میں تم یہاں جمع ہوئے ہو۔ علمی شعور کے کمال نے ہماری اس طرف راہنمائی کی ہے کہ مذہبی افکار کے اس جنگل میں کھو جانے والے معاصر مذہبی آدمی کا اصل مسئلہ "دانش" ہے۔ باقیوں نے سوال کیا کہ "دانش" کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ "بکواس"۔ انہوں نے کہا کہ کہ "بکواس" کیا ہے؟ اس نے کہا کہ جو ہم کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ مسئلے کا حل کیا ہے؟ اس نے کہا کہ "بکواس" بند کر دو یا کم کر دو تو اس الجھن سے نکل آؤ گے کہ جس کے لیے یہاں جمع ہوئے ہو۔

دوسرے نے کہا کہ مجھے تو لگتا ہے کہ تم سب میرے شعور کی ہی مختلف فیکلٹیز ہو جو

مختلف احوال میں زندگی گزار رہی ہیں۔ پہلے نے کہا جو کہ معمر تھا کہ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ تم سب میرا ماضی ہو اور یہ سب باتیں، کیفیتیں اور احوال جو کہ تم بیان کر رہے ہو، مذہبی آدمی کے رستے کے سنگ ہائے میل (milestones) ہیں۔ تیسرے نے کہا کہ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ "جہالت" بہت بڑی نعمت ہے لہذا اپنے شعور کی تمام فیکلٹیز کو جگانے کی غلطی نہ کرنا کہ ان میں باہمی اختلاف کا احساس زندہ ہو جائے گا۔ چوتھے نے کہا کہ نہیں "جہالت" کو نہیں بلکہ "کم علمی" کو نعمت سمجھو کہ ایسے شخص کو آسانی سے یکسوئی حاصل ہو جاتی ہے۔ ساتویں نے کہا کہ "علم" تو کم ہی دیا گیا ہے، جو زیادہ ہے، وہ "دانش" ہے۔ پس دانش کی کمی بہت بڑی نعمت ہے۔ "علم" سب کا ایک ہے جبکہ "دانش" اپنی اپنی ہے۔

پہلے نہ کہا کہ یہ "واہ واہ" ہمیشہ ساتویں کے حصے میں ہی آتی ہے! دوسرے نے کہا کہ مجھے آج اپنے سوال کا جواب مل گیا کہ "بکواس بند کر دو"۔ تیسرے نے کہا کہ آدمی کا المیہ یہ نہیں ہے کہ اسے جواب نہیں ملتا، اس کا المیہ یہ ہے کہ ہر جواب کچھ عرصہ بعد عارضی ثابت ہوتا ہے۔ ساتویں نے کہا کہ کچھ کر سکتے ہو تو پہلی فرصت میں یہ کر لو کہ اس "دانش" کے حصول کی دوڑ اور ریس سے نکل جاؤ۔ اور اگر نہیں نکلو گے تو نہ ختم ہونے والی پستی (infinite regression) میں لڑھکتے چلے جاؤ گے۔ شروع میں نکلنا آسان ہے، کچھ آگے پہنچ گئے تو بہت مشکل ہو جائے گا۔ ایک غیر دانشمند کو اس عذاب کا احساس تک نہیں ہے کہ جس سے تمہارے دانشور گزر رہے ہیں۔

تنقید کے اصول اور آداب

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تنقید کرنا ایک بوجھ ہے کہ جو ہم قیامت کے دن تک کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ مجھے تنقید کرنے کے حوالے سے کچھ بنیادی باتیں سیکھنے میں دس سال لگ گئے۔ میں نے لوگوں کو سنائیں اور انہوں نے مجھے بہت سنائیں اور بالآخر میں نے یہ طے کر لیا کہ چاہے فریق مخالف جیسا بھی ہو، اگر کلمہ گو ہو گا تو کبھی گالی نہیں دوں گا۔ اور کبھی ذات پر تنقید کی ابتداء میری طرف سے نہیں ہو گی اور جو

جواب میں ہوگی تو وہ اس سے زیادہ نہ ہوگی جتنی اس نے کی ہے۔

میں ممکن حد تک ان دو اصولوں کی پاسداری کرتا ہوں اور جب بھی کوئی بھی ان دو باتوں کے حوالے سے مجھے متوجہ کرے تو چاہے اس سے لاکھ اختلاف ہوں، کوئی تاویل کیے بغیر اپنے الفاظ سے رجوع کر لیتا ہوں اور تنہائی میں اپنا محاسبہ کرتا ہوں۔ اسی طرح مجھے جن لوگ سے اختلاف ہے، وہ اگر اللہ کے لیے ہے تو میں نے اپنے لیے اور اپنے دوستوں کے لیے یہ طے کیا ہے کہ فریق مخالف کو گالی نہ دیں لہذا اپنی وال پر گالی والے کمنٹس پر نظر پڑتے ہی فوراً ڈیلیٹ کر دیتا ہوں۔

میری رائے ہے کہ تنقید کے اصولوں پر تو فرائض کی طرح عمل پیرا ہونا چاہیے کہ جب اللہ کے رسول ﷺ نے اللہ کے کسی ایسے دشمن کو گالی نہیں دی کہ جس کی دشمنی پر قرآن گواہ تھا تو ہم ایک ایسے شخص کو کیسے گالی دیں کہ جو زبان سے تو کم از کم کلمے کا اقرار تو کر رہا ہے۔

تنقید کے آداب وہ ہیں کہ جن کا لحاظ رکھنے سے ہم "السابقون الاولون" میں شامل ہو سکتے ہیں، ان شاء اللہ۔ ان آداب کا خلاصہ یہ ہے جو کہ میں نے جناب احمد جاوید صاحب سے سنا ہے کہ جن پر آپ تنقید کرتے ہیں؛ تنہائی میں ان کے لیے رویا کریں، اس کا فائدہ شاید ان لوگوں کو تو ہو یا نہ ہو لیکن ہماری تنقید کی بنیاد اخلاص پر قائم ہو جائے گی۔ اور تنقید سے نفسانیت نکالنے کے لیے ایسا تکلفاً کر لینا بھی عبادت کہلائے گا۔ واللہ اعلم

بغض اور تکفیر

جب ماضی پر غور کرتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ میں بنیادی طور ایک محقق اور نقاد ہوں، اور پچھلے بارہ سال کے عرصے سے لکھ رہا ہوں۔ بہت مکالمے، مباحثے، مجادلے اور مناظرے کرنے کے بعد یہ طے کر لیا کہ نہ تو کسی مسلمان سے بغض رکھوں گا اور نہ ہی کسی مسلمان کو کافر یا فاسق قرار دوں گا۔ البتہ جنہیں کبار علماء نے کافر یا فاسق قرار دیا ہو تو ان کی رائے پر میں غور کروں گا۔

ہم میں سے ہر شخص کی یہ حالت ہونی چاہیے کہ وہ کہہ سکے کہ واللہ! میرے دل میں

کسی مسلمان کے لیے بغض نہیں ہے، بھلے ہزاروں اختلافات ہوں۔ جہاں تک غصے کا معاملہ ہے تو غصہ تو آہی جاتا ہے، جو ایک آدھ دن تک باقی بھی رہتا ہے۔اور اگر پھر بھی نہ اترے تو اس کے حق میں دعا کا اہتمام کرے کہ جس پر غصہ ہو۔اور اس تدبیر سے وہ بھی جاتا رہے گا کہ غصے میں اپنا خون جلانا کوئی نیکی کا کام نہیں ہے۔

دوسروں پر نقد کے بعد ہمیشہ استغفار کرنا چاہیے، بعض اوقات نقد کرنے کو دل نہیں کرتا کہ دوستوں کی دل آزاری ہو گی، لیکن رہا نہیں جاتا، عادت یا مزاج ایسا ہو تو پھر انسان کر ہی لیتا ہوں، لیکن بعد میں اس کا کفارہ توبہ کے نوافل کی صورت میں ادا کر دے کہ اگر اس میں کوئی شر کا پہلو ہے تو جاتا رہے۔ یہ سمجھ مجھے دس سال بعد آئی، اور جسے اس عرصے سے پہلے آ جائے، تو واقعتاً میرے لیے بہت ہی قابل رشک ہے۔

کسی مسلمان کو کافر اور فاسق نہ کہے اور نہ ہی دل سے سمجھتا ہو۔ جو ہے، مجھ سے بہتر ہے، لیکن علمی موقف میں جو درست ہے، وہ بیان کرتا رہے، یہ بھی کہ اس کے کلام میں کفر، شرک اور گمراہی ہے۔ کبھی میں غصے میں ہوتا ہوں، تو آپ خاموش ہو جاتے ہیں، میں اس کی قدر کرتا ہوں۔ اور کبھی آپ غصے میں ہوں گے، تو میں خاموش ہو جاؤں گا، یہی دوستی ہے۔

ہم میں سو فی صد اتفاق ممکن نہیں ہے، جس سے ستر اسی فی صد باتوں میں اتفاق ہو تو یہی دوست ہے۔ اگر دس بیس فی صد میں اختلاف ہو بھی جائے تو کوئی حرج نہیں۔ کبھی آپ بول لیں، میں سن لوں، کبھی میں بول لوں گا، آپ سن لیں، بات ختم۔ اور اگر ہمارا اختلاف ہی ستر اسی فی صد ہے تو پھر ہمیں احترام کے ساتھ ایک دوسرے سے استفادہ کرنا چاہیے، بولنے سے فائدہ نہیں ہو گا یا رستہ علیحدہ کر لینا چاہیے۔

لبرل ازم اور انتہا پسندی

لبرل ازم اور انتہا پسندی کی مثال قطب شمالی اور قطب جنوبی یعنی ساؤتھ اور نارتھ پول کی سی ہے کہ ایک کے بغیر دوسرے کو سمجھنا بلکہ اس کا تصور کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ اگر مشرق ہی نہیں ہو گا تو مغرب کیسے سمجھ میں آئے گا۔ لبرل ازم اور انتہا پسندی یہ

دونوں ایک دوسرے کی وجہ بھی ہیں اور نتیجہ بھی۔

اگر انتہا پسندی کو ختم کرنا چاہتے ہیں تو اس کی ایک بڑی وجہ کو ختم کرنا ضروری ہے، اور وہ لبرل ازم ہے۔ مسلم معاشروں میں اکثر و بیشتر انتہا پسندی، رد عمل کی انتہا پسندی ہے جو لبرل ازم کی کوکھ سے برآمد ہوئی ہے۔ انتہا پسندی کی روک تھام کے لیے اس معاشرے میں لبرسٹوں کا اٹھایا جانا بہت ضروری ہے کہ ان کا "بھینسا" جیسا ایک فیس بک پیج ایک ہزار انتہا پسندوں کو جنم دیتا ہے۔

یہ لبرل ہی ہیں، جو کہ انتہا پسند ہیں، یعنی مذہب اور مولوی کی مخالفت میں انتہا پسند۔ اور انتہا پسندی، ہمیشہ انتہا پسندی کو جنم دیتی ہے۔ پس لبرسٹوں کی یہ انتہا پسندی، ایک اور انتہا پسندی کو جنم دیتی ہے، اور وہ ہے مذہبی انتہا پسندی۔ لبرل ازم دراصل، انتہا پسندی کی سب سے بڑی نرسری بن چکی ہے۔ یہ لبرل اپنی حرکتوں اور گستاخیوں سے پر امن معاشروں میں جنگ کی آگ بھڑکانا چاہتے ہیں۔

اور رہے مذہبی انتہا پسند تو وہ تو پہلے ہی لائن حاضر ہیں اور ان کی اس حاضری کی وجہ سے بہت سوں کو سمجھ آگئی ہے کہ کام کرنے کا یہ طریقہ درست نہیں ہے لہذا وہ اچھے شہری بن رہے ہیں۔ لیکن لبرسٹوں کو اچھا شہری بننے کے لیے ابھی قربانیاں دینی پڑیں گی، مطلب جیل اور عقوبت خانوں کی ہوا کھانے کی قربانی۔ اور ایسا کرنا اس معاشرے کو زندہ رکھنے کے لیے بہت ضروری ہے ورنہ تو لڑ مر کر تباہ ہو جائے گا۔

شیعہ مجالس کی حالتِ زار

فیس بک پر ہمارے شیعہ عالم دین دوست امجد عباس صاحب جو کہ جامعہ کوثر، اسلام آباد میں مدرس بھی ہیں، اپنی وال پر لکھتے ہیں:

"کسی زمانے میں اہلِ تشیع کی مجالس کافی علمی ہوا کرتی تھیں، اِن میں بڑے بڑے صاحبانِ علم و فضل علماء تشریف لاتے تھے۔ ایک عرصے سے شیعہ مجالس کا منبر عوامی خطیبوں اور جاہل ذاکروں کے ہاتھوں یرغمال ہو چکا ہے، جہالت کو فروغ دینے کا یہ مجالس اب بدترین ذریعہ بن چکی ہیں، اب اِن مجالس

کو بے عمل، بے دین، مشرک، غالی خطیبوں نے اپنی کمائی اور فاسد عقائد پھیلانے کا ذریعہ بنالیا ہے۔ابھی ایک عوامی، مشرک، غالی، نُصیری، جاہل، بازاری خطیب "علامہ" علی باقر نقوی آف کراچی کی مجلس کا ایک کلپ سُنا ہے، موصوف کہتے ہیں کہ آیتِ تطہیر میں تحریف کی گئی ہے، یہ یوں تھی "لیُذھبَ عنکم الرجس بِ اھل البیت۔"یعنی اہلِ بیت،اپنے ماننے والوں کی تطہیر کریں گے، گویاشیعہ بھی معصوم قرار پائیں گے۔ حدیثِ کساء کے حوالے سے کہاکہ سبھی آئمہ چادر میں آگئے،اللہ تعالیٰ نے خود کو حضرت عباس کے پیکر میں ڈھالا، یہ عباس نہ تھا، در حقیقت خدا تھا(نعوذ باللہ)۔ موصوف نے اپنی طرف سے عربی بھی گھڑنے کی جسارت کی ہے۔ یہ وضاع بھی ہے، تحریفِ قرآن کا مرتکب بھی، شرک اور غلو بھی موصوف دھڑلے سے پھیلا رہا ہے۔مجھے سب سے زیادہ افسوس اُن جاہلوں پر آتا ہے جو ایسے احمقوں کو سنتے ہیں، ایسی جھوٹی مجالس میں آتے ہیں، پھر بے پناہ داد دیتے ہیں۔اِن لوگوں کے جذبات "خوارج" کے سے ہیں، یہ ظالم انتہائی بکواسات پھیلا رہے ہیں۔ ایک ایک مجلس میں ہزاروں لوگ شریک ہوتے ہیں،افسوس ہوتا ہے کہ کوئی ایک آدمی اِنھیں نہیں ٹوکتا کہ آپ کیا پڑھ رہے ہیں۔ زیادہ تر شیعہ مجالس کی یہی حالت ہے، اکثر خطیب و تمام ذاکر حضرات دین کی ابجد سے بالکل ناآگاہ ہیں۔ شیعہ علماء نے ہمیشہ اِن عناصر کی مذمت اور ملامت کی ہے۔خُدا گواہ ایسی مجالس، ایسے خطیب و جاہل ذاکرین، اُن کی حوصلہ افزائی اور موالیانِ اہل بیت کی اُن میں کثرت سے شرکت سے معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر موالیانِ اہلِ بیت "غالی/مشرک" ہیں۔ شیعہ علماء نجانے کیوں خاموش ہیں، یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ شیعیت کو سب سے زیادہ نقصان ہمیشہ اِس کے اندر چھپے "غالی مشرکوں" نے پہنچایا۔ یہ قوم کس طرف جارہی ہے!"

مکتبِ اہلِ بیت سے وابستہ احباب

فیس بک پر ہمارے شیعہ عالم دین دوست امجد عباس صاحب جو کہ جامعہ کوثر،

اسلام آباد میں مدرس بھی ہیں، اپنی وال پر لکھتے ہیں:

"جیسا کہ کئی بار گزارش کر چکا ہوں کہ موالیانِ اہلِ بیت کی زیادہ تر مجالس میں پڑھنے والے خطباء حضرات نام نہاد عوامی خطیب ہوتے ہیں، جنھوں نے باضابطہ علمِ دین کہیں سے نہیں سیکھا ہوتا۔ اکثر حضرات نُصیری فرقہ سے ہیں جو غلو اور شرک پھیلاتے اور پیسہ بٹورتے ہیں۔ میں نے "ولی العصر" نامی ویب سائٹ کو دیکھا، یہاں "شیعہ" علماء کے نام، پتے اور فون نمبر درج ہیں۔ میں وہ لسٹ دے رہا ہوں اگرچہ یہ لسٹ ذرا پُرانی ہے، اِس میں دو تین مرحوموں کا نام بھی آیا ہوا ہے۔ آپ اچھی طرح اِس لسٹ کو پڑھیے گا، پھر اِس میں سے صرف پانچ ایسے افراد بتادیں جو شیعہ ہوں، جنھوں نے باقاعدہ علمِ دین پڑھا ہو اور صحیح "تبلیغِ دین" کرتے ہوں۔ اِسے میرا کھلا چیلنج سمجھیے، اگر پانچ نام نہ مل سکیں تو میری بات مان لیجیے کہ زیادہ تر مجالس جہالت پھیلاتی ہیں، اکثر خطباء جاہل، غالی، نُصیری، مشرک ہیں۔ یہ جھوٹ بول کر پیسہ کماتے ہیں، یہ اِن کا روزگار ہے، یہ حضرات فی گھنٹہ 30 ہزار سے ایک لاکھ روپے تک وصولتے ہیں۔ ہاں بہت ہی کم صحیح علماء ہیں جو مجالس میں گفتگو کیا کرتے ہیں، یہ آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ آج کے شیعہ نوجوان کو اِن جاہلوں کی محافل سے اجتناب برتنا چاہیے، ہمارے ملک میں بہت کم علمی مجالس کا اہتمام ہوتا ہے لیکن اُن میں بھی زیادہ وقت واقعہِ کربلا پر لگایا جاتا ہے۔ درسِ قرآن، درسِ تفسیر، درسِ عقائد و درسِ حدیث کا سلسلہ موجود ہی نہیں۔ سو مکتبِ اہلِ بیت کی دینی تعلیمات کے لیے مستند دینی مراکز، وہاں موجود علماء اور معتبر کتب کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ شیعہ علماء اور مذہبی اکابر نے ہمیشہ اِن عوامی خطباء سے اظہارِ براءت کیا ہے۔ وہ اِنھیں شیعیت سے خارج اور دشمنِ اسلام جانتے ہیں۔ اُن کے خیال میں شیعہ عوامی مجالس کا منبر نُصیری، غالیوں کے ہاتھ لگ چُکا، جو خود کو شیعیت کے لبادہ میں پیش کرتے اور عوام کو گمراہ کرتے اور فرقہ واریت پھیلاتے ہیں۔"

صفویت کیا ہے؟

دوست کا سوال ہے کہ صفویت کیا ہے؟ اصل میں شروع اسلام میں مسلمانوں میں دو رجانات پیدا ہو گئے تھے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ حضرت عثمان، حضرت علی سے افضل ہیں۔ یہ لوگ اکثریت میں تھے اور اہل سنت والجماعت کہلائے۔ اس کے بر عکس کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ حضرت علی، حضرت عثمان سے افضل تھے۔ یہ لوگ اقلیت میں تھے اور اہل تشیع کہلاتے تھے، رضی اللہ عنہما۔

لیکن ان دونوں کا اتفاق تھا کہ شیخین حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما امت میں سب سے افضل ہیں، صحابہ کرام سے بھی اور اہل بیت سے بھی۔ اسی لیے شریک بن عبد اللہ رحمہ اللہ سے جب سوال ہوا کہ آپ ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے افضل مانتے ہیں حالانکہ آپ شیعہ ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ تمام شیعانِ علی کا یہی عقیدہ ہے۔ یہی وہ اہل تشیع ہیں کہ جن سے اہل سنت کے کبار محدثین مثلاً امام بخاری رحمہ اللہ وغیرہ نے اپنی کتابوں میں روایت لی ہے۔

لیکن آہستہ آہستہ کچھ غالی قسم کے لوگ اہل تشیع میں گھس گئے کہ جنہوں نے اس مذہب کو شیعیت سے رافضیت کی طرف پھیر دیا۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے سوال ہوا کہ رافضی کون ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ رافضی وہ ہے جو ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کو گالی دے۔ پس ایک شیعہ ہے اور ایک رافضی ہے، دونوں میں فرق ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ انہیں دو وجہ سے رافضی کہا گیا؛ ایک وجہ یہ تھی کہ انہوں نے زید بن علی بن حسین رحمہ اللہ کی امامت کا انکار کیا کہ زید بن علی بن حسین رحمہ اللہ ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما پر تبرا کرنے سے منع کرتے تھے۔ اور دوسرا اس وجہ سے رافضی کہا گیا کہ انہوں نے ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی خلافت کا نہ صرف انکار کیا بلکہ انہیں گالی بھی دی۔

ان رافضیوں سے پھر صفوی پیدا ہوئے۔ یہ ایک رافضی خاندان تھا کہ جس نے تقریباً تین سو سال تک (1199-905ء) ایران میں حکومت کی۔ ان کے جد امجد شیخ زاہد الجیلانی نے انہیں خبر دی تھی کہ یہ ظہور مہدی تک عالم دنیا پر راج کریں گے۔

واضح رہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں فتح ایران کے بعد سے ایران کا سرکاری مذہب سنی رہا ہے اور وہاں شوافع کی اکثریت تھی۔ صفویوں کے جد امجد شاہ اسماعیل اول نے تلوار کے زور پر سنیوں کو رافضی بنایا اور جنہوں نے انکار کیا، انہیں قتل کر دیا گیا۔

ایرانی سلطنت عراق اور افغانستان تک وسیع ہوئی، لاکھوں سنی قتل ہوئے، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مقبرہ گرایا گیا بلکہ اسے کوڑا کرکٹ کا ڈھیر بنایا گیا، شاہ عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ کی قبر اکھیڑی گئی، بازاروں اور منبروں پر شیخین اور خلفائے ثلاثہ پر تبرا کو رواج دیا گیا، ماتم اور زنجیر زنی کی محافل کا اہتمام شروع ہوا، آذان میں "أشهد أن عليا ولي الله" کے الفاظ شامل کیے گئے، کربلا کی مٹی پر سجدے کی بدعت کا آغاز ہوا وغیرہ وغیرہ۔ اگر آپ نے اہل تشیع اور صفویہ میں آسان سا فرق جاننا ہو تو جو فرق عام یہودی اور صیہونی (zionist) میں ہے، وہی ایک شیعہ اور صفوی میں ہے۔ صفویت کے بارے مزید مطالعہ کے لیے عبد العزیز بن صالح المحمود الشافعی کی کتاب "عودة الصفويين" کا مطالعہ مفید رہے گا جو کہ کئی ایک سنی اور شیعہ مصادر تاریخ کی روشنی میں مرتب کی گئی ہے اور اپنے موضوع پر ایک مختصر اور جامع کتاب ہے۔

سعودی عرب اور خلیجی ممالک کا خیال یہ ہے کہ معاصر ایرانی حکومت بھی صفوی دور حکومت کی ایکسٹینشن ہے جو عالم اسلام بلکہ بلد حرمین پر حکومت کے خواب دیکھ رہی ہے۔ یہودی گریٹر اسرائیل بنانا چاہتے ہیں تو ایرانی گریٹر ایران۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اہل تشیع کو تو اسپورٹ کیا جائے اور رافضیوں کی حوصلہ شکنی کی جائے۔ اہل تشیع پاکستان کے ساتھ مخلص ہو سکتے ہیں لیکن صفوی کبھی نہیں ہو سکتا۔ اب بھی یونیورسٹی وغیرہ یا پڑھے لکھے طبقے میں آپ کو ایسے لوگ مل جاتے ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اہل بیت سے بہت عقیدت رکھتے ہیں لیکن شیخین پر تبرا کو جائز نہیں سمجھتے بلکہ ان کے احترام اور فضیلت کے قائل ہیں، یہی اصل شیعہ ہیں۔

شیعہ کی بنیاد اہل بیت سے محبت ہے جبکہ رافضہ اور صفویہ کی بنیاد بغض شیخین ہے تو جس میں شیخین کا بغض ہو تو وہ رافضی ہے۔ تو اہل تشیع سے اتحاد ہونا چاہیے، ہم بھی اس

کے قائل ہیں کہ ان کے مذہب کی بنیاد اہل بیت سے محبت ہے لیکن رافضی اور صفوی آپ سے راضی ہو جائیں تو اس کی ایک ہی صورت ہے کہ سنی حکومتیں ان کے حوالے کر دیں کہ ان کے مذہب کی بنیاد بغض اور دشمنی ہے، نہ صرف شیخین اور صحابہ کرام سے بلکہ اہل سنت والجماعت سے بھی۔

غدیر خم کا واقعہ

غدیر خم مکہ اور مدینہ کے مابین ایک جگہ کا نام ہے کہ جہاں اللہ کے رسول ﷺ نے حجۃ الوداع سے واپسی کے موقع پر ایک خطبہ دیا تھا کہ جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت بیان فرمائی۔ بعض لوگوں نے اس خطبے کو بنیاد بنا کر یہ غلط فہمی عام کر دی کہ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو امام اور خلیفہ مقرر کرنے کا خطبہ تھا حالانکہ اس خطبے کا مقصد لوگوں کے دلوں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے منفی جذبات کو ختم کرنا اور ان کی محبت اور مودت پیدا کرنا تھا۔

ہم اس خطبے کے سبب (context) کو بیان کریں گے کہ جس کے بغیر اس خطبے کو سمجھنا بالکل بھی ممکن نہیں ہے۔ اگر آپ کسی واقعے میں سے اس کے سبب کو نکال دیں تو آپ کبھی بھی اس واقعے کی حقیقت تک نہ پہنچ پائیں گے۔ اور جب آپ واقعے کا اصل سبب نقل نہ کریں گے تو پھر آپ اس واقعے کا سبب گھڑیں گے اور یہاں ہی سے آپ حقیقت کا چہرہ مسخ کرنا شروع کر دیں گے اور یہی ہمارے ہاں جاہل ذاکر اپنی مجلسوں میں کرتے ہیں کہ ان کا دعوی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنی زندگی میں خلیفہ بنا گئے تھے جبکہ حضرت ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ نے ان کی خلافت غصب کر لی تھی۔

غدیر خم کے خطبے کے سبب کے بارے روایات جو کہ صحیح بخاری، صحیح مسلم، سیرت ابن اسحاق، سیرت ابن ہشام وغیرہ میں نقل ہوئی ہیں، کے مطابق اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یمن میں مال کو تقسیم کرنے اور اس میں سے خمس وصول کر کے لانے کے لیے صحابہ کرام کی ایک جماعت پر امیر بنا کر بھیجا تھا۔ واپسی میں کچھ واقعات ایسے ہوئے کہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بد دل اور متنفر ہو گئے اور انہوں نے اللہ کے

رسول ﷺ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شکایات لگائیں تو آپ ﷺ نے جب لوگوں کے دل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے رنجش دیکھی تو غدیر خم پر خطبہ دیا۔

صحیح بخاری کی روایت کے مطابق بعض صحابہ کو یہ اعتراض تھا کہ یمن سے جو مال ملا ہے، اس میں خمس میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے لیے سب سے بہترین لونڈی رکھ لی تھی۔ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ نے واپسی پر آپ ﷺ سے اس کی شکایت کی تو آپ نے پوچھا: اے بریدۃ رضی اللہ عنہ، کیا آپ علی رضی اللہ عنہ سے رنجش رکھتے ہیں تو انہوں نے کہا: ہاں! تو آپ نے فرمایا کہ ایسا نہ کریں کہ علی رضی اللہ عنہ کے لیے خمس میں اس سے بھی زیادہ حصہ ہے جو انہوں نے رکھ لیا ہے۔

سیرت ابن اسحاق کے مطابق یمن سے واپسی پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو قافلے کا امیر بنایا اور خود مکہ کی طرف جلدی کی تا کہ آپ ﷺ کے ساتھ حجۃ الوداع میں شریک ہو سکیں۔ اب جس شخص کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے امیر بنایا تھا، اس نے سب کو صدقہ کے مال میں سے قیمتی چادریں پہننے کا حکم دیا تا کہ مکہ میں داخل ہوتے وقت مسلمان ان کا استقبال کریں تو خوش ہوں۔ ادھر حضرت علی رضی اللہ عنہ حج سے فارغ ہوتے ہی قافلے کی طرف نکلے کہ مکہ میں ان کے ساتھ داخل ہوں لیکن جب ان کو چادریں پہنے دیکھا تو ڈانٹا کہ جس سے بہت سے لوگ ناراض ہو گئے۔

دلائل النبوۃ کی روایت کے مطابق یمن سے واپسی پر لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا تھا کہ ہمارے اونٹ تھک گئے ہیں لہذا ہمیں صدقہ کے اونٹوں پر سواری کی اجازت دیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سختی سے انکار کر دیا۔ اس سے لوگوں کو رنجش پیدا ہوئی اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے واپسی پر آپ ﷺ سے شکایت کی تو آپ نے ان کی بات کے درمیان میں کاٹتے ہوئے کہا کہ ٹھہر جائیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سختی اور ڈانٹ ڈپٹ اللہ کی راہ میں تھی۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے ان سے کبھی رنجش محسوس نہ کی۔

پس اس قسم کے کئی ایک واقعات کے نتیجے میں جب اللہ کے رسول ﷺ نے بعض

صحابہ کے دلوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے رنجش محسوس کی تو واپسی پر غدیر خم پر خطبہ دیا اور اہل بیت سے محبت رکھنے کا حکم دیا کہ جسے بعض لوگوں نے ان کی امامت اور خلافت کا حکم سمجھ لیا اور شیخین کو غاصب قرار دے کر اپنی عاقبت خراب کرنے لگے۔

اس خطبے میں جو باتیں نقل ہوئیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ جس کا میں مولی ہو، علی اس کا مولی ہے۔ یعنی میں جس کا محبوب ہوں، علی اس کا محبوب ہے۔ جو مجھ سے محبت کا دعوی رکھتا ہے، وہ علی سے بھی محبت رکھے۔ جو مجھے محبوب رکھتا ہے، وہ علی کو بھی محبوب بنا لے۔ اور دوسرا یہ فرمایا کہ دیکھو، میں اپنے اہل بیت کے بارے میں تمہیں اللہ سے ڈراتا ہوں۔ یعنی ان سے زیادتی نہ کرنا، ان سے دشمنی اور عداوت نہ رکھنا۔ پس اہل بیت سے دشمنی اور عداوت رکھنا اور ان سے ظلم وزیادتی کرنا یہ ایمان کے منافی ہے۔ اللہ سمجھ عطا فرمائے۔

واقعہ فدک کی حقیقت

فدک، خیبر کے قریب ایک یہودی قصبہ تھا کہ جہاں کھجوروں کا باغ اور چشمہ تھا اور اس پر مسلمانوں کو بغیر جنگ کے فتح حاصل ہوئی تھی۔ اور جس جنگ میں لڑائی کے بغیر فتح حاصل ہو تو اس کے مال کو "مال فے" کہتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور عام مسلمانوں کی فلاح وبہبود اور ویلفیئر میں استعمال ہوتا ہے اور مال غنیمت کی طرح تقسیم نہیں ہوتا۔

صحیح بخاری کی روایت کے مطابق اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت السیدۃ فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا، خلیفۃ الرسول ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آئیں اور ان سے مطالبہ کیا کہ فدک میں جو ان کی وراثت بنتی ہے، وہ انھیں دی جائے۔ اس پر حضرت ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا ہے کہ ہم انبیاء کی جماعت کوئی وراثت نہیں چھوڑتے، بلکہ جو ہم چھوڑ جاتے ہیں، وہ صدقہ ہوتا ہے۔ اللہ کی قسم! اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس باغ کی جو حیثیت تھی، میں وہی باقی رکھوں گا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں اس باغ کے بارے جو فیصلہ کیا، میں بھی وہی میں کروں

گا۔ یعنی اس کا پھل اللہ کی راہ میں صدقہ کرتا رہوں گا جیسا کہ آپ ﷺ اپنی زندگی میں کرتے تھے۔ اور یہ روایت حضرت السیدۃ الزھراء رضی اللہ عنہا کے علم میں نہ تھی کہ انبیاء کی وراثت نہیں ہوتی۔ یہ روایت اہل تشیع کے نزدیک بھی صحیح ہے۔

صحیح بخاری ہی کی روایت میں یہ بھی ہے کہ اس جواب پر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو رنجش ہوئی اور انہوں نے دوبارہ اپنی وفات تک اس بارے حضرت ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ سے گفتگو نہ کی۔ ان کی وفات کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ کو اپنے گھر بلوایا اور کہا کہ ہم آپ کے مقام اور مرتبے کے قائل ہیں لیکن آپ نے اس معاملے میں ہمارے ساتھ زیادتی کی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ بات سن کر حضرت ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ رو پڑے اور کہا کہ اللہ کی قسم، رسول اللہ ﷺ کے آل بیت مجھے اپنے آل بیت سے زیادہ محبوب ہیں لیکن اس معاملے میں، میں اللہ کے رسول ﷺ کے طرز عمل کو نہیں چھوڑ سکتا۔

صحیح بخاری ہی کی روایت میں یہ بھی ہے کہ اس کے بعد ظہر کی نماز ہوئی، حضرت ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ نے منبر پر خطبہ دیا کہ جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان بیان فرمائی۔ اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور حضرت ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ کی شان بیان فرمائی اور کہا کہ ہم آل بیت کو حضرت ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ کی فضیلت سے انکار نہیں ہے لیکن ہم آل بیت یہ سمجھتے تھے کہ یہ ہماری وراثت ہے لیکن ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ ایسا نہیں سمجھتے تھے تو ہمیں یہ بات محسوس ہوئی تھی۔ پس اس صلح پر مسلمان خوش ہو گئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقام ان کے دلوں میں اور بڑھ گیا۔

یہ اس واقعے کی کل حقیقت ہے اور جو جاہل ذاکر مسالے لگا لگا کر اس واقعے کو بیان کرتے ہیں، تعصب اور فرقہ واریت کی آگ بھڑکاتے ہیں، خوب داد وصول کرتے ہیں، کہ ان کا دعوی ہے کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے السیدۃ الزھراء رضی اللہ عنہا کو دھکا دیا تھا کہ جس سے ان کا حمل ضائع ہو گیا تھا وغیرہ تو یہ سب کذب، بہتان اور افتراء ہے کہ جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یہ جاہل، شیر خدا کو بزدل ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ان کی بیوی کا حمل گرا دیا گیا

اور وہ گھر سکون سے بیٹھے رہے۔ او ظالمو! قصہ گھڑتے ہوئے کچھ تو خیال کر لیتے کہ آل بیت کی مظلومیت ثابت کر رہے ہو یا بزدلی؟

اور روایات میں تو یہ بھی ملتا ہے کہ جب ازواج مطہرات نے حصہ مانگا تھا تو انھیں بھی حضرت ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ سے یہی جواب ملا تھا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو بھی حصہ نہ ملا تھا لیکن اسے کوئی ذاکر بیان نہیں کرتا۔ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا جو اصرار رہا ہے، وہ اس بات پر نہیں تھا کہ میں حصہ نہیں دیتا بلکہ آپ کا اصرار اس بات پر تھا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک طرز عمل جو آپ کی زندگی میں ثابت ہے، میں اسے کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟

فدک کے مسئلہ میں السیدۃ الزھراء رضی اللہ عنہا کی ناراضگی

ہم نے اپنی پچھلی تحریر میں اس کا ذکر کیا تھا کہ فدک کے باغ کے مسئلہ میں السیدۃ الزھراء رضی اللہ عنہا اور اہل بیت کو حضرت ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ سے رنجش پیدا ہو گئی تھی۔ بعض دوستوں نے اس پر سوال کیا کہ السیدۃ الزھراء رضی اللہ عنہا نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے جو وفات تک کلام نہ کیا تو اس کی کیا حقیقت ہے؟

ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ اس رنجش کی حقیقت کچھ نہ کچھ ہے لیکن زیب داستان کے لیے جاہل ذاکر جس طرح اس واقعے کو بڑھا چڑھا کر اور مسالہ لگا کر بیان کر کے دکانداری کرتے ہیں، تو یہ ایک ایسی حرکت ہے کہ جس کے ذریعے امت مسلمہ میں تفرقہ، انتشار، نفرت اور دشمنی کی آگ بھڑکائی جاتی ہے۔ تو اس بارے ہمیں کچھ اصولی باتیں کرنی ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو حضرت ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ سے رنجش پیدا ہوئی تھی اور یہ بات درست ہے لیکن یہ بات بھی حقیقت ہے کہ السیدۃ الزھراء اپنی وفات سے پہلے حضرت ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ سے راضی تھیں جیسا کہ سنن بیہقی کی روایت میں ہے کہ حضرت ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ نے مرض الموت میں السیدۃ الزھراء رضی اللہ عنہا سے ملنے کی اجازت چاہی، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے السیدۃ الزھراء رضی اللہ عنہا سے پوچھا

توانہوں نے اجازت دی۔ روایت میں ہے کہ ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا کہ میں نے اپنا گھر بار، اپنی جان مال اور اپنی آل اولاد سب اللہ، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آل بیت کو راضی کرنے کے لیے قربان کر دی۔ اس طرح کی باتوں سے حضرت ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ نے السیدۃ الزھراء رضی اللہ عنہا کی رنجش دور کرنی چاہی تو وہ ان سے راضی ہو گئیں۔ اور اس بات کا بیان کہ السیدۃ الزھراء رضی اللہ عنہا وفات سے پہلے حضرت ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ سے راضی ہو گئی تھیں۔ بعض جید شیعہ علماء جیسا کہ ابن ہیثم اور ابن ابی حدید نے "نهج البلاغة" کی شرح میں لکھا ہے کہ السیدۃ الزھراء رضی اللہ عنہا وفات سے پہلے ان سے راضی ہو گئی تھیں۔

بعض جاہل ذاکر واقعہ فدک کے ساتھ یہ روایت بیان کرتے ہیں کہ فاطمہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے اور جس نے انھیں ناراض کیا، اس نے مجھے ناراض کیا اور اس سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ حضرت ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ نے معاذ اللہ! اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی حاصل کر لی ہے۔ کیا انہیں یہ معلوم نہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے تھا۔

صحیح بخاری کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے السیدۃ الزھراء رضی اللہ عنہا کی زندگی میں دوسرا نکاح کرنا چاہا تو السیدۃ الزھراء رضی اللہ عنہا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شکایت لے کر آئیں اور کہا کہ لوگوں کا خیال ہے کہ آپ اپنی بیٹیوں کے بارے میں غصہ نہیں کرتے؟ یہ سن کر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ کے لیے کھڑے ہوئے اور کہا کہ میں نے ابو العاص رضی اللہ عنہ کو اپنی بیٹی دی اور انھوں نے اس کی اچھی خدمت کی۔ فاطمہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے، جس بات سے اسے تکلیف ہوتی ہے، اس سے مجھے تکلیف ہوتی ہے، اور ایک روایت میں ہے کہ جس نے اسے غصہ دلایا، اس نے مجھے غصہ دلایا۔

یہ خطبہ سن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دوسری شادی کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دوسری شادی کی بلکہ نو شادیاں کیں کہ جن سے ان کی نسل خوب آگے چلی۔ تو کہاں یہ روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے تناظر میں تھی اور کہاں اسے ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ پر چسپاں کر دیا گیا؟

آپ آل بیت اور اہل بیعت یعنی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں نفرت دکھا کر امت میں نفرت ہی پیدا کر سکتے ہیں، ان میں محبت دکھائیں جو کہ حقیقت بھی ہے تو امت میں محبت پھیلے گی۔ اگر آل بیت سے محبت کرنا شیعیت ہے تو سارے اہل سنت، شیعہ ہیں لیکن اگر شیعیت شیخین، ازواج اور صحابہ سے نفرت کا نام ہے تو یہ الحاد اور زندقہ ہے۔ میں تو اپنے شیعہ دوستوں کو کہتا ہوں کہ آپ اپنا مذہب مت چھوڑیں لیکن اس کی اصلاح ضرور کریں، اسے منفی کی بجائے مثبت بنیادوں پر استوار کریں، اسے نفرت کی بجائے محبت پر کھڑا کریں۔

انبیاء کی وراثت کے بارے آل بیت اور ازواج مطہرات کا موقف

ایک دوست نے یہ سوال کیا کہ صحیح بخاری میں حضرت ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ سے یہ جو روایت ہے کہ ہم انبیاء کی جماعت کچھ ورثہ نہیں چھوڑتے بلکہ جو ہم چھوڑ جاتے ہیں، وہ صدقہ ہوتا ہے، کیا یہ اور صحابہ سے بھی مروی ہے۔ تو عرض ہے کہ اس روایت کو صرف حضرت ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ نے نقل نہیں کیا بلکہ سنن النسائی میں حضرت عائشہ، صحیح بخاری میں حضرت ابو سلمہ، اور مسند حمیدی میں حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہم سے بھی یہ روایت مروی ہے۔

اسی طرح صحیح بخاری وغیرہ کی روایات کے مطابق حضرت عمر نے حضرت علی، حضرت عباس، حضرت عثمان، حضرت عبد الرحمن بن عوف، حضرت زبیر، حضرت سعد اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہم کو قسم دے کر پوچھا تھا کہ کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں کہا تھا کہ ہم انبیاء کی وراثت نہیں ہوتی اور جو ہم چھوڑ جاتے ہیں تو وہ صدقہ ہوتا ہے۔ تو ان سب نے اسکی تصدیق کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی کہا تھا۔

جہاں تک ازواج مطہرات کا موقف ہے تو سنن النسائی کی ایک روایت کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ازواج مطہرات نے یہ فیصلہ کیا کہ حضرت ابو بکر الصدیق کی طرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کو بھیجا جائے کہ وراثت میں انہیں ان کا حصہ دیا جائے لیکن اس مشاورت کے دوران ہی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بقیہ ازواج کو یاد کروایا کہ

کیا اللہ کے رسول ﷺ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ ہم انبیاء کی وراثت نہیں ہوتی اور جو ہم چھوڑ جاتے ہیں، وہ صدقہ ہوتا ہے۔ پس اس کے بعد انہوں نے مطالبہ نہ کیا۔

اور جہاں تک آل بیت کا تعلق ہے تو ان کا موقف شروع میں یہ رہا ہے کہ ہمیں آپ ﷺ کی وراثت ملنی چاہیے لیکن صرف السیدۃ الزھراء رضی اللہ عنہا کو چھوڑ دیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ سمیت سب نے اپنے اس موقف سے رجوع کر لیا تھا اور اسی موقف کے قائل ہو گئے تھے جو شیخین کا تھا۔ البتہ السیدۃ الزھراء رضی اللہ عنہا کا موقف وفات تک یہی رہا کہ ہمیں وراثت ملنی چاہیے تھی۔

آل بیت باغ فدک کی وراثت کے مسئلے میں شیخین کی رائے کے قائل ہو گئے تھے کہ یہی وجہ تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں فدک ان کی اولاد میں تقسیم نہیں ہوا۔ اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں فدک ان کے بہن بھائیوں میں تقسیم ہوتا۔ اہل تشیع کی کتب "شرح نهج البلاغة" لابن ابی الحدید اور "الشافي للمرتضى" میں یہ روایت موجود ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ان کے دور خلافت میں فدک واپس لینے کی بات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ مجھے اللہ سے شرم آتی ہے کہ ایک مسئلے میں ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ نے ایک فیصلہ کیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے جاری رکھا اور میں اس کے خلاف کروں۔

اور شرح نہج البلاغہ لابن ابی الحدید ہی کی ایک روایت کے مطابق محمد الباقر رحمہ اللہ سے جب یہ سوال ہوا کہ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ فدک کے مسئلے میں شیخین نے آپ لوگوں پر ظلم کیا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا: نہیں۔ اور اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس دور میں بھی ایسے لوگ تھے جو آل بیت کو مظلوم ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے کہ تبھی تو ایسے سوال کر رہے تھے۔ اور یہ دراصل وہ لوگ تھے جو آل بیت پر سیاست کرنا چاہتے تھے اور انہوں نے کر کے دکھا بھی دی ہے، اور یہ ان کا کمال ہے، اسے ماننا چاہیے۔ کیا یہ کمال نہیں ہے کہ آپ کہیں کہ میرے اوپر ظلم نہیں ہوا لیکن سامنے والا کہے کہ نہیں، ظلم ہوا ہے۔ اور آپ کی بات کوئی نہ سنے اور اس کی بات ہر کوئی سنے اور سر بھی دھنے۔

اہل بیت اور اہل بیعت کی باہمی محبت

اہل بیت یا آل بیت سے مراد نبی ﷺ کے گھر والے ہیں کہ جن میں ازواج مطہرات، آل علی، آل عباس، آل جعفر، آل عقیل، آل حارث رضوان اللہ علیہم اجمعین شامل ہیں۔ اور اہل بیعت سے مراد آپ کے مشن کے ساتھی ہیں یعنی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جماعت کہ جنہوں نے دین ہی کے لیے جینے مرنے پر آپ سے بیعت کی۔ بیعت رضوان میں چودہ سو صحابہ موجود تھے کہ جنہیں اللہ نے اپنی رضا کا پروانہ اسی دنیا میں ہی سورۃ الفتح میں یہ کہہ کر دے دیا کہ اللہ ان سے راضی ہو گیا۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ تقسیم کسی درجہ میں صحابہ کے زمانے میں موجود تھی کہ یہ آل بیت ہیں اور یہ اہل بیعت میں سے ہیں لیکن یہ ویسی ہی تقسیم تھی جیسی کہ انصار اور مہاجرین کی تقسیم معروف تھی۔ لیکن بد قسمتی سے ایک طبقے نے اپنا مقصود اسی کو بنا لیا ہے کہ وہ آل بیت اور اہل بیعت کو دو سیاسی پارٹیوں کی طرح ایک دوسرے کا حریف اور دشمن ثابت کریں اور امت کو آپس میں تقسیم کریں کہ جیسے اسی تقسیم ہی کی وجہ سے ان کی روزی روٹی لگی ہوئی ہو۔

روایات میں ہمیں کثرت سے یہ ملتا ہے کہ آل بیت اور اہل بیعت یعنی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ایک دوسرے سے محبت رکھنے والے تھے۔ وہ ایک دوسرے کی مدح بیان کرتے تھے، ایک دوسرے کو تحفے تحائف دیتے تھے، ایک دوسرے سے رشتے قائم کرتے تھے۔ صحیح بخاری کی روایت کے مطابق حضرت ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ مجھے آل بیت سے محبت اپنے گھر والوں سے محبت سے بھی بڑھ کر ہے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی شادی حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی بیٹی ام کلثوم رحمہا اللہ سے ہوئی۔ حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شادی حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی بیٹی حضرت نفیسہ رحمہا اللہ سے ہوئی۔ حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہ کی شادی حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی ام اسحاق رحمہا اللہ سے ہوئی۔ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی شادی حضرت ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ کی پوتی حضرت حفصہ رحمہا اللہ سے ہوئی۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے حضرت عاتکہ بنت

زید رحمہا اللہ سے شادی کی جو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی بھتیجی تھیں۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پوتے محمد الباقر رحمہ اللہ کی شادی حضرت ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ کی پڑپوتی ام فروہ رحمہا اللہ سے ہوئی۔ اس بارے مزید تفصیل کے لیے سید ابو معاذ احمد بن ابراہیم کی کتاب "الأسماء والمصاهرات بين أهل البيت والصحابة رضوان الله عليهم" ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

اسی طرح اہل بیت اپنے بچوں کے نام ابو بکر، عمر اور عائشہ رکھتے تھے اور اس کی وجہ یہی تھی کہ انہیں ان شخصیات سے گہری محبت تھی۔ حضرت حسن بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے ایک بیٹے کا نام ابو بکر اور دوسرے کا نام عمر تھا۔ حضرت علی زین العابدین رحمہ اللہ کے ایک بیٹے کا نام عمر تھا۔ اسی طرح حضرت موسی الکاظم رحمہ اللہ کے ایک بیٹے کا نام عمر تھا۔ حضرت جعفر الصادق رحمہ اللہ کی بیٹی کا نام عائشہ تھا۔ حضرت موسی الکاظم رحمہ اللہ کی بیٹی کا نام بھی عائشہ تھا۔ حضرت علی الرضا رحمہ اللہ کی بیٹی کا نام بھی عائشہ تھا۔ اس بارے مزید تفصیل کے لیے سید ابو معاذ احمد بن ابراہیم کی کتاب "الأسماء والمصاهرات بين أهل البيت والصحابة رضوان الله عليهم" ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

حضرت ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ نے بنو حنفیہ کے قیدیوں میں سے حضرت خولہ رحمہا اللہ، حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو ہبہ کیں اور ان سے محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ پیدا ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو ایک چادر ہبہ کی کہ وہ اسے ہمیشہ اوڑھے رہتے تھے کہ اکثر لوگ پوچھتے کہ آپ اس چادر کو ہر وقت کیوں پہنے رکھتے ہیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے کہ یہ میرے خلیل، صفی اور صدیق نے مجھے پہنائی ہے۔

کیا اہل بیت میں ازواج مطہرات شامل ہیں؟

قرآن مجید کے بیان کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت میں ازواج مطہرات بھی شامل ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں سورہ احزاب کی آیت 33 کہ جس میں اللہ کی طرف سے اہل بیت کو اچھی طرح پاک کرنے کا عندیہ دیا گیا ہے تو اس آیت کا آغاز ازواج مطہرات سے خطاب کے ساتھ ہوتا ہے بلکہ اس سے اگلی آیت میں بھی ازواج مطہرات ہی سے

خطاب ہے۔

امام طبرانی رحمہ اللہ کی المعجم الکبیر کی ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اہل بیت کو خوب پاک کرنے والی آیت میرے گھر میں نازل ہوئی تھی تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ، حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم کو بلوا بھیجا اور کہا کہ یہ میرے اہل بیت ہیں۔ تو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ کیا میں آپ کے اہل بیت سے ہوں؟ تو آپ نے فرمایا: ان شاء اللہ۔ ایک اور روایت کے مطابق اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی اہل بیت میں شامل فرمایا۔

قرآن مجید ہی میں سورۃ ہود میں آیت 73 میں اہل بیت کا لفظ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی حضرت سارہ علیہا السلام کے لیے استعمال ہوا ہے لہذا قرآن مجید سے یقینی طور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ازواج مطہرات بھی نبی کے اہل بیت میں شامل ہیں۔ اور رہے آل بیت تو ان میں ازواج مطہرات اور آل علی کے علاوہ آل جعفر، آل عقیل اور آل حارث وغیرہ بھی شامل ہیں کہ وہ اہل بیت سے وسیع تر اصطلاح ہے۔

نکاح متعہ اور آل بیت

نکاح متعہ سے مراد متعین مدت تک کے لیے نکاح ہے اور یہ اسلام سے پہلے دورِ جاہلیت میں رائج تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شروع اسلام میں جبکہ صحابہ رضی اللہ عنہم غزوات کے لیے نکلتے تھے تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنی بیویوں سے دور اور سفر میں ہونے کی وجہ سے نکاح متعہ کی اجازت دے دیتے تھے لیکن فتح مکہ کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعہ کے نکاح کو ہمیشہ کے لیے حرام قرار دے دیا۔

پس جن روایات میں نکاح متعہ کی اجازت کی بات ہے تو وہ فتح مکہ سے پہلے کی روایات ہیں جبکہ فتح مکہ کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قیامت تک کے لیے حرام قرار دے دیا۔ صحیح مسلم کی ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ اے لوگو! میں نے تمہیں عورتوں سے نکاح متعہ کی اجازت دی تھی، اور اب سن لو کہ اللہ عزوجل نے نکاح متعہ کو قیامت تک کے لیے حرام قرار دے دیا ہے۔ پس جس کے پاس نکاح متعہ کی عورت ہو تو وہ اسے

چھوڑ دے اور اسے جو حق مہر دے دیا ہے، وہ اس سے واپس نہ لے۔

آل بیت کا بھی متعہ کے نکاح کے بارے یہی موقف تھا کہ یہ منسوخ ہو چکا ہے۔
موطا امام مالک کی روایت کے مطابق حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ خیبر کے موقع پر متعہ کے نکاح کو اور گھریلو گدھوں کو، دو چیزوں کو حرام قرار دیا تھا۔ البتہ صحیح بخاری کی ایک روایت کے مطابق حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ حالت اضطرار یعنی بہت مجبوری کی حالت میں نکاح متعہ کی اجازت دیتے تھے جیسا کہ ان سے سوال ہوا کہ کیا متعۃ کا نکاح جائز ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ ہاں! تو ان کے آزادہ کردہ غلام نے کہا کہ یہ جواز تو عورتیں کم ہونے اور شدید حالات میں ہے، نہ کہ مطلق۔ تو حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہاں! تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یعنی ان کے نزدیک بھی نکاح متعہ کا جواز مضطر کے لیے تھا، نہ کہ ہر شخص کے لیے، جیسا کہ مضطر کے لیے حرام کھانا حلال ہو جاتا ہے۔

لیکن سنن الترمذی کی روایت کے مطابق حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے اپنی اس رائے سے رجوع کر لیا تھا۔ اور اس رجوع کی وجہ یہ تھی کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے انہیں یہ فتوی دینے سے منع کیا تھا جیسا کہ صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ عبد اللہ اور حسن اپنے والد محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہیں کہ ان کے والد علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا کہ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ متعہ کے نکاح کے جواز کا فتوی دیتے ہیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کو کہا کہ اے ابن عباس! رضی اللہ عنہ ایسا فتوی دینے سے رک جائیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم متعہ کے نکاح اور گھریلو گدھوں دونوں کو خیبر کے موقع پر حرام کر چکے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ کہا کہ اس مسئلے میں چونکہ صریح نص موجود ہے لہذا قیاس کرنا درست نہیں ہے۔ اور مستخرج ابی عوانۃ کی روایت ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی وفات اس حال میں ہوئی کہ انہوں نے اس رائے سے رجوع کر لیا تھا۔

متعہ کے جواز کے دلائل

پہلی بات تو یہ ہے کہ سورۃ النساء کی آیت 24 کے الفاظ ﴿فَمَا اسْتَمْتَعْتُم بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً﴾ سے متعہ کے جواز پر جو استدلال کیا جاتا ہے، تو وہ درست نہیں ہے کہ اس آیت کا سیاق (context) متعہ نہیں ہے بلکہ عام نکاح ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ اس آیت سے متعہ ثابت ہوتا ہے تو وہ درج ذیل آیات سے منسوخ بھی ہو گیا۔ ارشار باری تعالی ہے:

﴿وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ ﴿٥﴾ إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ﴿٦﴾ فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ﴾ [المؤمنون]

سورۃ مومنون کی اس آیت میں صرف دو طرح سے خواہش پوری کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ ایک زوجہ سے اور دوسرا لونڈی سے۔ اور متعہ جس سے کیا جاتا ہے، اسے "زوجہ" کوئی بھی نہیں کہتا بلکہ اہل تشیع میں اسے "مستاجرہ" کہا جاتا ہے یعنی ایسی عورت جو اجرت پر لی گئی ہے۔ اگر متعہ والی عورت زوجہ ہوتی تو اس کے لیے وراثت جاری ہوتی۔ چونکہ وہ زوجہ نہیں ہے لہذا اہل تشیع کے نزدیک اس کے لیے وراثت نہیں ہے۔ اور قرآن مجید نے زوجہ اور لونڈی کے علاوہ سے خواہش پوری کرنے سے منع فرمادیا ہے۔

اسی طرح قرآن مجید میں سورۃ نور آیت 33 میں حکم ہے:

﴿وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا حَتَّىٰ يُغْنِيَهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ﴾

اس آیت میں مومنوں کو حکم دیا گیا ہے کہ اگر نکاح کی استطاعت نہیں رکھتے تو عفت اور پاکیزگی کی زندگی اختیار کرو۔ اگر متعہ کی اجازت ہوتی تو یہاں یہ حکم ہوتا ہے کہ اگر نکاح کی استطاعت نہیں ہے کہ بیوی کو رہائش اور خرچہ دے سکو تو متعہ کر لو۔

اسی طرح قرآن مجید میں سورۃ النساء آیت 24 میں ہے:

﴿وَمَن لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنكُمْ طَوْلًا أَن يَنكِحَ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ فَمِن مَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُم مِّن فَتَيَاتِكُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ...ذَٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنكُمْ﴾

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ اگر پاکدامن مومن عورتوں سے نکاح کی استطاعت نہیں ہے تو لونڈی سے نکاح کر لو، لیکن لونڈی سے نکاح وہی کرے کہ جسے زنا میں پڑنے کا اندیشہ ہو۔ اب اگر متعہ کے نکاح کی اجازت ہوتی، بحالت مجبوری بھی، تو لونڈی کی جگہ اس کا حکم نازل ہوتا۔

ہم نے یہ کہا ہے کہ دور نبوی میں متعہ پہلے جائز رہا ہے کہ یہ دورِ جاہلیت سے چلا آ رہا تھا۔ اسلام نے نکاح کی ایک قسم کو جاری نہیں کیا تھا بلکہ محض اتنا کیا کہ شروع میں خاموشی اختیار کی گئی اور بعد میں منسوخ کر دیا گیا۔ باقی ایک سوال ضرور ہے کہ جس پر غور کیجیئے گا کہ کیا ایسا کوئی ثبوت ملتا ہے، اہل تشیع کی کتب میں، کہ آل بیت کی عورتوں نے نکاح متعہ کیا ہو؟ یعنی بارہ آئمہ تک کی بات کر رہا ہوں، اگر نہیں کیا تو کیوں نہیں؟ اور اگر کیا تو اس کی دلیل کیا ہے؟

متعہ دو قسم کا ہے؛ ایک "متعة الحج" کہ جسے حج تمتع بھی کہتے ہیں اور دوسرا "متعة النساء" کہ جسے نکاح متعہ بھی کہتے ہیں۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے بارے روایات میں جس متعہ کا ذکر ہے وہ متعۃ الحج ہے کہ صحیح مسلم کی ایک روایت کے مطابق وہ کہتی ہیں کہ ہم عورتیں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں متعہ کیا کرتی تھیں یعنی متعۃ الحج کرتی تھیں لیکن روافض نے اس متعہ کے لفظ کو پکڑ لیا اور اسے متعۃ النساء بنا لیا۔ اور جن روایات میں متعۃ النساء کا لفظ ہے تو وہ ضعیف ہیں۔ صحیح مسلم کی روایت کے مطابق حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا موقف تھا کہ متعۃ الحج جائز ہے لیکن حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اس کے قائل نہ تھے لیکن ان کی والدہ کا موقف بھی ان کے برعکس تھا۔ تو بعض لوگوں نے ان کی والدہ محترمہ حضرت اسماء بنت ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ سے اس بارے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس کی اجازت دی تھی۔

کیا امام ابو حنیفہ، امام جعفر الصادق رحمہ اللہ کے شاگرد تھے؟

دوست کا سوال ہے کہ کیا امام ابو حنیفہ، امام جعفر الصادق رحمہ اللہ کے شاگرد تھے، اس کا کہنا ہے کہ بعض اہل تشیع کا یہ دعوی ہے کہ امام ابو حنیفہ اور امام مالک دونوں امام

جعفر الصادق کے شاگرد تھے، اور امام شافعی، امام مالک کے شاگرد تھے اور امام احمد، امام شافعی رحمہم اللہ کے شاگرد تھے تو سب ائمہ اہل سنت، اہل تشیع سے نکلے ہیں؟ کیا یہ دعوی درست ہے؟

یہ بات بہت عام ہے کہ امام ابو حنیفہ، امام جعفر الصادق کے شاگرد تھے لیکن یہ ثابت نہیں ہے بلکہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اسے جھوٹ اور بہتان کہا ہے۔ اور وہ روایت جھوٹی روایت ہے اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ پر کذب اور بہتان ہے کہ جس میں ہے کہ امام صاحب نے کہا کہ "لو لا السنتان لهلك النعمان" کہ اگر وہ دو سال نہ ہوتے تو ابو حنیفہ ہلاک ہو جاتا۔ اور دو سالوں سے ان کی مراد امام جعفر الصادق رحمہ اللہ کی شاگردی کے دو سال ہیں۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی پیدائش 80ھ میں ہوئی جبکہ امام جعفر رحمہ اللہ ان سے تین سال بعد 83ھ میں پیدا ہوئے تو امام حنیفہ تو ان سے عمر میں بڑے ہیں بلکہ امام ابو حنیفہ، امام جعفر الصادق کے والد محمد الباقر رحمہم اللہ کی زندگی میں فتوی دیتے تھے۔ تو جو والد کی زندگی میں مفتی بن چکا ہو، وہ بیٹے کا شاگرد کیسے ہو سکتا ہے؟ امام ابو حنیفہ ساری عمر کوفہ میں رہے اور امام جعفر الصادق مدینہ میں تھے تو کیسے استادی شاگردی ہو گئی؟ چلیں، بالفرض ہم مان لیتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ نے دو سال امام جعفر الصادق کی شاگردی اختیار کی ہے؟ تو اب دو صورتیں ہیں؛

ایک صورت تو یہ ہے کہ دونوں کی فقہ ایک تھی، کچھ انیس بیس کا فرق تھا لہذا امام ابو حنیفہ کی فقہ وہی ہے جو ان کے استاذ کی تھی اور اہل تشیع نے امام جعفر الصادق پر جھوٹ بولا ہے کہ ایک نئی فقہ وضع کر لی، فقہ جعفری کے نام سے۔ یا دوسری صورت یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ ایک طرف تو یہ کہہ رہے ہیں کہ اگر میں امام جعفر کا شاگرد نہ ہوتا تو ہلاک ہو جاتا اور دوسری طرف امام جعفر کے مقابلے میں ایک فقہ وضع کر رہے ہیں یعنی خود اپنے ہلاک ہونے کی تصدیق کر رہے ہیں؟ امام ابو حنیفہ کی طرف دوسری بات کی نسبت تو ناممکن ہے، البتہ پہلی کی نسبت ہو سکتی ہے لیکن اہل تشیع اس پر راضی نہ ہوں

گے لہذا شاگردی کا قول ہی باطل ہے۔

بعض اہل تشیع "قراء" کے الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ امام ابو حنفیہ نے امام جعفر سے قرآن مجید پڑھا حالانکہ امام ابو حنیفہ نے جن سے قرآن مجید پڑھا، وہ امام عاصم رحمہ اللہ ہیں۔ علامہ ابن الجزری سے بڑھ کر قراءات کی اسناد کا احاطہ کس نے کیا ہے؟ انہوں نے "النشر في القرءات العشر" میں امام ابو حنیفہ کے قرآن کے استاذ کے طور امام عاصم رحمہ اللہ وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ اور رہی فقہ کی بات تو اس میں امام ابو حنیفہ، حماد کے شاگرد ہیں۔ اور حماد، علقمہ کے، اور علقمہ، عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگرد تھے۔

البتہ بعض محدثین نے یہ بات کہی ہے کہ امام ابو حنیفہ نے امام جعفر سے روایت لی ہے اور روایت لینے کا لفظ کسی ایک روایت کو نقل کر دینے پر بھی بولا جاتا ہے۔ اسے اصول حدیث کی اصطلاح میں "رواية الأقران" کہتے ہیں یعنی ساتھیوں کا ایک دوسرے سے حدیث روایت کر لینا بلکہ بعض اوقات تو بڑے، اپنے چھوٹوں سے حدیث نقل کر لیتے تھے لیکن اس سے وہ شاگرد نہیں بن جاتے تھے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، کعب الاحبار سے روایت نقل کر لیتے تھے جبکہ کعب تابعی تھے اور عمر صحابی تھے۔ اسی طرح تابعین، اپنے چھوٹوں یعنی تبع تابعین سے روایت نقل کر لیتے تھے جیسا کہ اور عبد اللہ بن عون اور یحی بن سعید، امام مالک سے روایت کرتے ہیں جبکہ وہ دونوں تابعی ہیں اور امام مالک تبع تابعی۔

یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک شاگرد اپنے استاذ کی مطلق علمی برتری کا اعتراف کر کے اس سے بعد المشرقین جتنا اختلاف کر لے، اس کا ایک ہی مطلب نکلتا ہے کہ شاگرد اپنی تعریف میں جھوٹا ہے بلکہ اصول کافی کی ایک روایت کے مطابق حضرت ابو جعفر الصادق رحمہ اللہ نے سدیر سے کہا تھا کہ کیا میں تمہیں وہ لوگ نہ دکھاؤں جو لوگوں کو اللہ کے دین سے روک رہے ہیں تو انہوں نے امام ابو حنیفہ اور سفیان ثوری رحمہما اللہ کی طرف اشارہ کیا جو مسجد نبوی میں حلقے لگا کر بیٹھے تھے کہ یہ وہ لوگ ہیں اور ان دونوں کو خبیث تک کہا۔ تو آپ کے اپنے بنیادی مصادر تو یہ کہانی بیان کر رہے ہیں اور آپ اہل سنت کی

کتابوں سے امام ابو حنیفہ کو شاگرد ثابت کرنے میں لگے ہیں۔

اعلی حضرت کی مسلمان امت کی تکفیر میں خدمات

اس وقت ہمارے سامنے فتاوی رضویہ ہے جو کہ تیس جلدوں میں، جامعہ نظامیہ رضویہ، لاہور نے 2006ء میں شائع کیا ہے۔اس فتاوی میں جناب اعلی حضرت نے تقریباً آدھی امت کو کافر بنادیا ہے۔اعلی حضرت کا کہنا ہے کہ گنگوہی، نانوتوی، انبیٹھوی اور تھانوی علمائے حرمین کے فتوی کے سبب مرتد ہیں اور جو دیوبندی، ان کو مرتد نہ سمجھے تو وہ بھی کافر ہے۔[فتاوی رضویہ: 590/6] وہ مزید فرماتے ہیں کہ دیوبندیہ بالاتفاق مرتد ہیں اور جو ان کے کفر میں شک کرے، وہ بھی کافر۔اور جو انہیں عالم دین سمجھے تو اس کے پیچھے نماز باطل۔اور جو ان کو قابل امامت سمجھے، اس کے پیچھے نماز باطل اور وہ انہی میں سے ہے۔[فتاوی رضویہ: 621/6] مزید فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں کفر کی تعلیم، ارتداد کی تلقین اور ایمان سلب کرنے کا مدرسہ، دیوبند کا مدرسہ ہے۔[فتاوی رضویہ: 267/21] اعلی حضرت کا کہنا یہ بھی ہے کہ دیوبندی عقیدے والوں کے پیچھے نماز باطل ہے، ہو گی ہی نہیں، اور فرض باقی رہے گا جبکہ ان کے پیچھے نماز پڑھنے کا گناہ بھی شدید ہو گا۔ نماز پنجگانہ، عید، جمعہ، جنازہ کچھ جائز نہیں اور جو ان کے کفر میں شک کرے تو وہ خود کافر ہے۔[فتاوی رضویہ: 573/6]

اعلی حضرت کا کہنا ہے کہ غیر مقلد کے کافر ہونے میں شک نہیں لہذا اگر کسی سنی مسجد میں کوئی غیر مقلد صف میں کھڑا ہو گا تو اس کی وجہ سے صف، قطع ہو جائے۔اور صف کا قطع ہونا حرام ہے لہذا اگر سنی اس غیر مقلد کے نماز باجماعت میں شریک ہونے پر راضی تھے یا راضی تو نہ تھے لیکن اسے منع بھی نہیں کیا تو ایسے سنی گناہ گار اور عذاب کے مستحق ہیں۔[فتاوی رضویہ: 151/7] مزید فرماتے ہیں کہ غیر مقلدین بد مذہب ہیں [فتاوی رضویہ: 375/11] جو عورت کسی بد مذہب کی بیوی بنی تو وہ کتے کے تصرف میں آئی۔بد مذہب کتے سے بھی بدتر اور ناپاک تر ہے کہ کتا فاسق نہیں ہے اور یہ فاسق ہے۔اور کتے پر عذاب نہیں ہے اور یہ شدید عذاب کا مستحق ہے۔ بد مذہب

جہنمیوں کے کتے ہیں۔ [فتاوی رضویہ:401/11]مزید فرماتے ہیں کہ وہابی مرد اور عورت مرتد ہیں اور ان کا نکاح کسی سے نہیں ہو سکتا، نہ کافر سے، نہ مرتد سے، نہ مسلمان سے، نہ انسان سے، نہ حیوان سے، اور اگر کسی سے کیا بھی تو زنا خالص ہو گا۔[فتاوی رضویہ:511/11]

اعلی حضرت فرماتے ہیں کہ وہابیہ، دیوبندیہ اور غیر مقلدین مرتد ہیں اور ان سے میل جول رکھنا اور ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا حرام ہے، چاہے باپ اور بھائی ہی کیوں نہ ہو۔ [فتاوی رضویہ:278/21]؛اہل کتاب سے بد تر مجوس ہیں، مجوس سے بد تر مشرکین ہیں جیسے ہندو۔ مشرکین سے بد تر مرتدین ہیں جیسے وہابیہ اور خاص طور دیوبندیہ [فتاوی رضویہ:264/21]؛وہابیوں کا کفر ایسا ہے کہ کلمہ پڑھنے سے بھی مسلمان نہ ہوں گے۔ [فتاوی رضویہ:177/15] وہابیوں کو کافر قرار دینا فقہاً واجب ہے۔ [فتاوی رضویہ:235/15]

اعلی حضرت فرماتے ہیں کہ شیعہ کفار اور مرتدین ہیں، ان کے ہاتھ کا ذبیحہ حرام ہے، ان سے نکاح حرام بلکہ خالص زنا ہے۔ اگر مرد سنی اور عورت شیعہ ہو تو اولاد، ولد الزنا ہو گی، اولاد کو باپ کا ترکہ نہ ملے گا کہ ولد الزنا کے لیے وراثت نہیں ہے۔ عورت کو نہ ترکہ ملے گا اور نہ حق مہر کہ وہ زانیہ ہے اور زانیہ کے لیے نہ وراثت ہے اور نہ حق مہر ہے۔ کسی شیعہ مرد عورت، عالم جاہل، سے سلام کرنا، میل جول رکھنا، کبیرہ گناہ اور حرام ہے۔ اور جو سنی ان کو مسلمان جانے یا ان کے کافر ہونے میں شک کرے تو وہ خود کافر اور بے دین ہے۔[فتاوی رضویہ:269/14]

اس کے علاوہ بہت سے فتاوی ہمارے پاس ہیں لیکن یہ تفصیل کا مقام نہیں ہے۔ بعض دوستوں کا کہنا ہے یہ شدت تو ہر مسلک کے علماء میں ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ شدت دوسرے مسالک میں بھی ہے اور جہاں بھی ہے، قابل مذمت ہے لیکن خدا راہ، دل پر ہاتھ رکھ کر بتلائے گا کہ ہندوستان کی تاریخ میں اتنے بڑے پیمانے پر اور اس طرح مسلمان امت کی تکفیر یعنی انہیں کافر قرار دینے کی سعادت اعلی حضرت کے علاوہ کسی اور

کے حصے میں بھی آئی ہے۔

اور بعض دوست کہتے ہیں کہ انہوں نے اخلاص سے ایسا کیا ہے۔تو بھئی، اس امت کو دوچار اور مخلصین ایسے دے دو، اللہ تمہارا بھلا کرے۔اور ان کا اخلاص تو اپنی جگہ اور تم 2006ء میں یہ سب کچھ اعزاز اور فخر کے ساتھ شائع کر رہے ہو، تو اس اخلاص کا ہم کیا کریں؟ خدارا! ان فتاوی کے معاشرتی اثرات پر غور کرو کہ تمہارے مفتیوں کی تو بات ہی کیا، تمہارے پی ایچ ڈی ریاضی، دیوبندیوں اور اہل حدیثوں کے سلام کا جواب تک نہیں دیتے، کیونکہ وہ بھی رضوی اخلاص ہی رکھتے ہیں۔

اعلی حضرت اور سنیوں اور بریلویوں کی تکفیر

سنی اور بریلوی عام طور یہ سمجھتے ہیں کہ اعلی حضرت نے صرف اہل تشیع، وہابیوں، دیوبندیوں، اہل حدیثوں اور غیر مقلدین کی تکفیر کی ہے جبکہ سب سے زیادہ تکفیر جن کی اعلی حضرت نے کی ہے، وہ سنی اور بریلوی ہیں۔ بعض لوگوں کو اس پر حیرت ہو لیکن یہ حقیقت ہے لیکن بات سمجھنے کی ہے۔

فتاوی رضویہ میں اعلی حضرت نے کسی کے کافر بن جانے کے جو اصول وضوابط بیان کیے ہیں، ان میں سے ایک ضابطہ اور قاعدہ جو کئی ایک مقامات پر بیان ہوا ہے، یہ ہے کہ جو کافر کو کافر نہ مانے تو وہ بھی کافر ہے۔انہوں نے کئی فتاوی میں ایسے سنیوں کو کافر قرار دیا جو اہل تشیع، وہابیوں، دیوبندیوں اور غیر مقلدین کو کافر نہیں جانتے تھے یا ان کے کافر ہونے میں شک کرتے تھے۔ اعلی حضرت فرماتے ہیں کہ ہمارے زمانے کے روافض قطعی طور کافر اور مرتد ہیں اور جو ان کو کافر نہ جانے، وہ بھی کافر ہے۔[فتاوی رضویہ: 260/14] مزید فرماتے ہیں کہ جو شخص وہابیہ اور اہل سنت دونوں کو علماء سمجھتا ہے تو اس قدر بات اس کے اسلام سے خارج ہونے کو جائز ہے اور ایسے شخص کے پیچھے نماز ایسے ہی ہے جیسے ہندو اور عیسائی کے پیچھے نماز۔ایسے شخص کے پیچھے جمعہ نہ پڑھے بلکہ ظہر کی نماز پڑھ لے۔اور اگر ایسے شخص کے پیچھے جمعہ پڑھے گا تو کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرے گا۔[فتاوی رضویہ: 638/6]

مزید فرماتے ہیں کہ بہشتی زیور ایسے شخص کی تصنیف ہے کہ جس کے کفر میں شک کرنا بھی کفر ہے۔[فتاوی رضویہ: 328/14] مزید فرماتے ہیں کہ دیوبندیہ بالاتفاق مرتد ہیں اور جو ان کے کفر میں شک کرے، وہ بھی کافر۔اور جو انہیں عالم دین سمجھے تو اس کے پیچھے نماز باطل۔اور جو ان کو قابل امامت سمجھے، اس کے پیچھے نماز باطل اور وہ انہی میں سے ہے۔[فتاوی رضویہ: 621/6] خلاصہ کلام یہ ہے کہ جو بریلوی، اہم تشیع، وہابیوں اور دیوبندیوں کو کافر نہیں سمجھتا یا ان کے کافر ہونے میں شک کرتا ہے تو وہ بھی کافر ہے۔

وہابیوں، دیوبندیوں اور غیر مقلدین کا خدا

اعلی حضرت جن بنیادوں اور اسباب کی بناپر مختلف گروہوں، جماعتوں اور مسلکوں کو کافر قرار دیتے تھے، وہ واقعی ان کی فقہی بصیرت اور رسوخ فی العلم کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ باقی گستاخ نہ مانیں، تو وہ تو ہیں ہی بد مذہب کہ کیونکر ان کی فضیلت کا اقرار کریں گے۔ ذیل میں ہم فاضل بریلوی کے فقیہانہ استدلال اور مجتہدانہ استنباط کے چند نمونے ان کے فتاوی سے پیش کر رہے ہیں۔اللہ سمجھ عطا فرمائے۔

اعلی حضرت کا دعوی ہے کہ وہابی ایسے کو خدا کہتا ہے کہ جو بہکتا ہے، بھولتا ہے، سوتا ہے، اونگھتا ہے، کھاتا ہے، پیتا ہے، غافل ہے، ظالم ہے، ناچتا ہے، تھرکتا ہے، پیشاب پاخانہ کرتا ہے، عورتوں سے جماع کرتا ہے، لواطت کا مرتکب ہوتا ہے، مفعول بن سکتا ہے، خنثی مشکل ہے، ماں باپ سے پیدا ہوا ہے، ربڑ کی طرح پھیلتا اور سمٹتا ہے۔ [فتاوی رضویہ: 547-546/15] مزید کہتے ہیں کہ دیوبندی ایسے خدا کو مانتے ہیں جو بالفعل جھوٹا ہے، دیوبندی خدا چوری کر سکتا ہے، وہ تمام جہاں کا تنہا مالک نہیں، ظالم بھی ہو سکتا ہے، دیوبندی خدا وہ ہے کہ علم میں شیطان اس کا شریک ہے۔اور اوپر وہابیوں کے خدا کی ساری صفات بھی ان کے خدا میں شامل کر لیں۔[فتاوی رضویہ: 15/548-550] مزید کہتے ہیں کہ غیر مقلد کا خدا وہ ہے جو وہابی اور دیوبندی کا خدا ہے۔ان کے خدا کے دین میں کتا حلال، سور کی چربی حلال، شراب سے نہا کر سارے کپڑے اس میں

رنگ کر نماز پڑھنا حلال اور ایک عورت متعدد مردوں پر حلال ہے۔[فتاوی رضویہ:551-550/15]

بریلویوں سے درخواست ہے کہ آپ اپنے ارد گرد نظر دوڑائیں تو آپ کو اپنے شہر، قصبے، بستی، محلے، رشتہ داروں، پڑوسیوں اور دوستوں وغیرہ میں کوئی نہ کوئی وہابی، اہل حدیث، غیر مقلد اور دیوبندی مل جائے گا۔ اب اس سے پوچھیں کہ کیا وہ ایسے خدا کو مانتا ہے کہ جو عورتوں سے جماع کرتا ہے، ہیجڑا ہے، ماں باپ سے پیدا ہوا ہے، پیشاب پاخانہ کرتا ہے، ناچتا ہے؟ اگر آپ کے معاشرے میں، آپ کے جاننے والوں میں، آپ کے حلقہ احباب میں وہابی تو موجود ہیں لیکن ان کے ایسے عقائد ہر گز نہیں ہیں تو پھر اس کا لازمی مطلب کیا یہ نہیں نکلتا کہ اعلی حضرت جھوٹے ہیں؟

اتحاد امت اور تکفیری سوچ

اتحاد امت، اس وقت کا سب سے بڑا تقاضا ہے لیکن اس تقاضے کو پورا کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ اگر کوئی ہے، تو وہ تکفیری سوچ ہے۔ ہم نے ہمیشہ اس سوچ کی مخالفت کی ہے کہ جس کے ذریعے امت کے ایک بڑے حصے کو کافر قرار دیا جائے، چاہے وہ سوچ اپنے آپ کو سلفی کہنے والوں کی طرف سے ہو، یا چاہے وہ عاشق رسول ہونے کے دعویداروں کی طرف سے ہو۔

جناب اعلی حضرت صاحب کی تکفیری سوچ کے حوالے سے چند گزارشات پیش کی تھیں کہ جن پر بعض دوستوں نے ناراضگی کا اظہار کیا۔ ان گزارشات سے ہمارا مقصد یہ ہر گز نہیں ہے کہ بریلوی، دیوبندی یا اہل حدیث بن جائیں کہ یہ ممکن ہی نہیں ہے لہذا بریلوی حضرات پریشان نہ ہوں کہ ان کی مرغیاں کم ہو جائیں گی۔ ہمارا مقصود صرف اتنا تھا کہ ہر جماعت اور مسلک میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جو تکفیری ذہن نہیں رکھتے اور معتدل مزاج ہوتے ہیں جبکہ کچھ ایسے ہوتے ہیں جو تکفیری سوچ رکھتے ہیں۔ پس اپنے مسلک میں معتدل مزاج رکھنے والے علماء کو اپنا امام بنائیں کہ اسی میں آپ کے مسلک کی بھی بھلائی ہے۔

اتحاد امت کی راہ اسی صورت ہموار ہو سکتی ہے جبکہ معتدل اور غیر تکفیری سوچ رکھنے والے علماء کو ہر مسلک میں نمائندہ علماء کا درجہ دیا جائے اور تکفیری سوچ رکھنے والے علماء کو اس مسلک میں تیسرے درجے کے علماء میں شمار کیا جائے۔ ہماری نظر میں بریلوی مکتبہ فکر کی امامت کا حق اگر کسی کو حاصل ہے، تو وہ پیر مہر علی شاہ رحمہ اللہ کی شخصیت ہے۔

بریلوی بھائیو! میں یہ نہیں کہتا کہ آپ مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ اور مولانا نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ کو فالو کریں لیکن اتنا تو کہہ سکتا ہوں کہ اپنے مسلک کے علماء میں سے پیر مہر علی شاہ کو اپنا امام بنائیں، آپ پیر کرم شاہ صاحب رحمہ اللہ کو فالو کریں، آپ پیر نصیر الدین صاحب رحمہ اللہ کو پیشوا مانیں، کہ یہ آپ کے مسلک کے ایسے معتدل لوگ ہیں کہ دوسرے مسلک کے علماء بھی ان کے اعتدال کے قائل ہیں۔

اعلی حضرت صاحب کو بریلوی مسلک میں جو درجہ دے دیا گیا ہے، یہ اسی کا فیضان ہے کہ آج یہ مزاج بریلوی مسلک کے گھر میں آگ لگا رہا ہے۔ آج اگر نمائندہ بریلوی علماء پیر کرم شاہ ازہری صاحب رحمہ اللہ، پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری صاحب، مولانا الیاس قادری صاحب وغیرہ کو کسی نے کافر قرار دیا ہے اور ان کے کفر کے فتوے جاری کیے ہیں تو اسی جماعت یعنی بریلوی مسلک ہی کے علماء نے ہی ایسا کیا ہے نہ کہ دیوبندیوں اور اہل حدیثوں نے۔

ہمیں اچھی طرح ادراک ہے کہ انگریز نے نفرت کا جو بیج بو دیا ہے اور مسلمان امت کو تین مسالک میں جس طرح تقسیم کر دیا ہے، اسے ختم کرنا ناممکن ہے لیکن اتنا تو کیا جا سکتا ہے اور کرنا چاہیے کہ ہر مسلک میں اس عالم دین کو امامت کا درجہ دیا جائے کہ جو کم از کم تکفیری سوچ نہ رکھتا ہو۔ میں تو خود اہل حدیث کو کہتا ہوں کہ مولانا نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ کے فتاوی کا مطالعہ کریں کہ وہ کس طرح اپنے فتاوی میں فقہ حنفی کی کتب سے بھی حوالہ دیتے ہیں۔

لیکن یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ ہر مسلک میں ان لوگوں کو امام بنا لیا جاتا ہے کہ جو

محبت کی بجائے نفرت کی بات زیادہ کرتے ہیں، جو جوڑنے کی بجائے توڑنے کی بات کرتے ہیں۔ بریلوی بھائیو! آپ کی مرغیاں آپ کو مبارک، مجھے ان مرغیوں سے کچھ لینا دینا نہیں، بس یہی کہنا تھا کہ ان کے لیے خوراک اعلی حضرت صاحب کے فتاوی کی بجائے پیر مہر علی شاہ رحمہ اللہ کے طرز عمل سے لے لیا کریں تو یہ دوسروں کی دیواروں پر بیٹ کرنا بند کر دیں گے۔ اللہ سمجھ عطا فرمائے!

بریلویت کے اصل امام

پیر نصیر الدین شاہ صاحب رحمہ اللہ ایک بریلوی عالم دین، محقق، صوفی، شاعر اور خطیب ہیں۔ آپ معروف بریلوی عالم دین پیر مہر علی شاہ رحمہ اللہ کے پڑپوتے ہیں۔ پیر مہر علی شاہ بریلوی علماء میں معتدل ترین عالم شمار ہوتے ہیں کہ جب اعلی حضرت رحمہ اللہ، دیوبندی علماء کی تکفیر کر رہے تھے تو پیر مہر علی شاہ صاحب انہیں اپنی کتابوں میں رحمہ اللہ لکھ رہے تھے بلکہ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ کو تو بیعت تک کی اجازت بھی دی۔ اپنی کتاب "تصفیہ مابین سنی وشیعہ" میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے اختلاف کے باوجود انہیں دعائیہ کلمات سے یاد فرمایا۔ برصغیر کے تمام مکاتب فکر کی نمائندگی کرتے ہوئے قادیانیت کا مقدمہ لڑا۔

ذیل میں پیر نصیر الدین نصیر شاہ صاحب رحمہ اللہ، سجادہ نشین گولڑہ شریف کی چار منٹ کی ایک ویڈیو شیئر کر رہا ہوں کہ جس میں انہوں نے اپنے مسلک میں مروجہ شرکیہ رسوم ورواج پر تنقید کی ہے اور اہل حدیثوں کی توحید کی تعریف بیان کی ہے۔ اپنے حلقے میں منبر پر بیٹھ کر اپنے ہی مسلک کے ماننے والوں کے خلاف بات کرنا اور وہ بھی ایک پیر اور سجادہ نشین کا، واللہ! فی زمانہ یہ فعل جہاد سے کم درجہ نہیں ہے۔ سب دوسرے کے مسلک کی اصلاح میں لگے ہیں، کوئی بھی اپنی اصلاح نہیں چاہتا۔ سب یہ چاہتے ہیں کہ دوسرے ہماری تعریف کریں اور خوب کریں، ہمیں کسی کی تعریف کرنی پڑ جائے تو اختلافات یاد آجاتے ہیں۔

بس ہر مسلک کو ایسے ہی علماء اور صوفیاء چاہییں جو اپنے مسلک پر نقد کریں اور

دوسروں کی مدح کریں۔ پیر صاحب واقعی میں مصلح بھی ہیں اور مجاہد بھی۔ یہ جہاد اپنے نفس سے بھی ہے کہ اپنے ہی مخالف ہو جاتے ہیں کہ ہم تو پیر صاحب سے لینے آئے تھے اور یہ کہہ رہے ہیں کہ اللہ سے جا کر لو۔ منبر پر بیٹھ کر کون اپنوں پر تنقید کی جرات کرتا ہے، عام سلفی اور دیوبندی بھی نہیں کرتے، اس ڈر سے کہ فریق مخالف طعن بنا لے گا۔

بلاشبہ بریلوی اس ملک کا سوادِ اعظم ہیں۔ ان میں پیر مہر علی شاہ صاحب کے منہج پر چلنے والے معتدل علماء بھی موجود ہیں جیسا کہ پیر کرم شاہ صاحب اور مفتی منیب الرحمن صاحب وغیرہ جو دوسرے مسلک سے مکالمہ کے ساتھ اپنے مسلک والوں کی بھی اصلاح کرتے رہتے ہیں۔ ہمیں ایسے بریلوی علماء کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے نہ کہ ان کے بیان حق کو ان کے مسلک کے خلاف طعن بنا لیں۔

بھئی، بریلویوں نے اہل حدیثوں کو بہت کچھ دیا لیکن اہل حدیثوں نے انکی قدر نہ کی۔ یہاں ہر دوسرا اہل حدیث وہ ہے، جو پہلے بریلوی تھا۔ بریلویوں میں حق بات قبول کرنے کا جذبہ دوسروں کی نسبت زیادہ ہوتا ہے۔ مسلک اہل حدیث کی آبیاری میں بریلویوں کا کردار بہت نمایاں ہے۔

یہ اگر بھولے ہیں تو بھولا ہونا بھی مومن کی نشانی ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ مومن بھولا بھالا اور سیدھا سادھا ہوتا ہے۔ یہ دیوبندی نہیں ہیں یہ بریلوی ہیں بریلوی جو کہ تھوڑی سی تعریف پر راضی ہو جاتے ہیں۔ اہل حدیثو! تم دیوبندیوں کو خوش کرنے میں لگے رہے اور وہ "هل من مزيد" کا تقاضا ہی کرتے رہے اور بریلویوں پر تم نے مشرک کے فتوے لگائے حالانکہ یہی تمہاری جماعت کی اصل نرسری بنے۔

رسول اللہ ﷺ کی محبت

صحیح حدیث میں ہے کہ تم اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ رسول اللہ ﷺ تمہیں والدین، اولاد اور ہر انسان سے زیادہ محبوب نہ ہو جائیں۔ اب علماء کا اس مسئلے میں اختلاف ہے کہ یہ مطلوب محبت طبعی اور جذباتی ہے یا عقلی اور شعوری۔ کچھ علماء کا کہنا یہ ہے کہ ہم سے جذباتی محبت کا مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ سب سے بڑھ کر ہو جبکہ

بعض کا کہنا یہ ہے کہ ہم سے عقلی اور شعوری محبت کا مطالبہ ہے کہ وہ سب سے بڑھ کر ہونی چاہیے۔

محبت تو نام ہی جذبات کا ہے لہذا یہ کیسے ممکن ہے کہ محبت ہو اور جذباتی نہ ہو۔ یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ محبت خود ایک جذبہ ہے لہذا آپ ﷺ سے تعلق اور نسبت میں جذبات وابستہ رہیں گے۔ تو جو علماء عقلی اور شعوری محبت غالب رکھنے کا کہتے ہیں تو ان کی مراد یہ نہیں ہوتی کہ رسول اللہ ﷺ سے جذباتی محبت نہیں ہونی چاہیے یا نہیں ہو سکتی۔ وہ دراصل یہ کہتے ہیں کہ عقل اور شعور کو جذبات پر غالب رہنا چاہیے۔

محبت تو ایک جذبہ ہے اور جذبات اندھے ہوتے ہیں، چاہے کسی کے بارے میں ہوں، خدا کے بارے میں ہی کیوں نہ ہوں، چاہے جھوٹا خدا ہو یا سچا تو اس خدا کی محبتِ محض بھی بہت خطرناک ہے بلکہ فساد ہے۔ دنیا کے مختلف مذاہب میں خدا کے نام پر قتل وغارت اس کی ایک بہت بڑی علامت ہے۔ داعش والے کلمہ گو مسلمانوں کو خدا کی محبت میں قتل کرتے ہیں تو پاسداران انقلاب حسین کی محبت میں، رضی اللہ عنہ۔ اولاد کی محبت میں اگر شعور غالب نہ رہے تو اولاد تباہ ہو جاتی ہے اور نبی کی محبت میں شعور غالب نہ رہے تو انہیں خدا کا بیٹا یا جزء بنالیا جاتا ہے۔

عقل اور شعور یہ دو ایسی چیزیں ہیں جو جذبات کو کنٹرول کرتی ہیں اور محبت کے جذبے میں اعتدال پیدا کرتی ہیں ورنہ تو وہ ایک اندھا جذبہ ہے جو اپنی تسکین کے لیے ہر اندھے رستے پر چل سکتا ہے۔ تو اصل سوال یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے محبت میں جذبات غالب رہنے چاہییں یا شعور؟ تو اس کے جواب کے طور پر دوسری قسم کے علماء یہ کہتے ہیں کہ شعور غالب رہنا چاہیے اور ہماری رائے بھی یہی ہے۔

اس کو آسان الفاظ میں ایک مثال سے یوں سمجھ لیں کہ بریلوی حضرات رسول اللہ ﷺ سے جو محبت رکھتے ہیں، اس میں جذبات غالب ہیں، اس لیے وہ ہر وقت عشق رسول کی بات کرتے ہیں۔ اور اہل حدیث حضرات رسول اللہ ﷺ سے جو محبت رکھتے ہیں، اس میں شعور غالب ہے کہ وہ ہر وقت اطاعت رسول کی بات کرتے ہیں۔ دونوں کا

رسول اللہ ﷺ سے جو تعلق ہے، اس کے احوال اور انفس میں فرق ہے۔ ایک کو نعت سن کر نبی سے تعلق محسوس ہو گا تو دوسرے کو حدیث پڑھ کر۔

توہین رسالت کا قانون اور سزا

بہت سے دوست توہین رسالت کے قانون اور اس کی سزا کے بارے سوال کرتے ہیں۔ یہاں تین سوال اہم ہیں؛ ایک یہ کہ دین اسلام میں اس شخص کی سزا کیا ہے کہ جو نبی کریم ﷺ کو گالی دے؟ تو دین اسلام میں ایسے شخص کی سزا موت ہی ہے اور نبی کریم ﷺ نے یہ سزا اپنی زندگی میں خود نافذ کروائی ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ آپ ﷺ اپنی ذات کے دفاع کے لیے حساس تھے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس ذات سے دین صادر ہو رہا ہے، اس کے داغدار ہونے کا مطلب پورے دین کا داغدار ہو جانا ہے اور یہی تو وجہ ہے کہ مشرکین مکہ دین اسلام کو کرپٹ دین ثابت کرنے کے لیے آپ ﷺ کی ذات پر طعن کرتے تھے کہ آپ شاعر ہیں، مجنون ہیں وغیرہ وغیرہ

البتہ یہ بات درست ہے کہ جب تک قوت اور اقتدار نہیں تھا تو یہ سزا نافذ نہیں کی گئی یعنی مکہ میں اور وہاں صبر کا رویہ اختیار کرنے کے عمومی حکم پر عمل کیا جاتا رہا البتہ جب قوت اور اقتدار حاصل ہو گیا تو پھر مدینہ میں جا کر اس سزا کا نفاذ ہوا۔

دوسری بات یہ کہ ائمہ میں اس بات میں اختلاف ہے کہ توہین رسالت کی یہ سزا حد ہے یا تعزیر۔ تو امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ اور ان کے متبعین اور حنفیہ کی ایک جماعت کے نزدیک یہ حد ہے جبکہ بعض حنفی فقہاء کے نزدیک یہ تعزیر ہے لیکن یہ لفظی اختلاف ہے۔ حد کا مطلب ہے کہ توہین کے مرتکب کا قتل شرعاً جائز ہے اور تعزیر کا مطلب ہے کہ اس کا قتل سیاستاً اور مصلحتاً جائز ہے۔ ماہنامہ محدث میں کئی ایک ایسے مضامین شائع ہوئے ہیں کہ جن میں ایسے واقعات کا تذکرہ ہے کہ جن میں توہین کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے موت کی سزا کا تذکرہ ہے۔

دوسرا یہ کہ پاکستان میں توہین رسالت کی سزا موت کا جو قانون نافذ ہے[1] تو وہ نہ

[1] Whoever by words, either spoken or written, or by visible representation or

صرف اسلام بلکہ جمہوریت کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔اور اگر اسلام میں یہ سزا نہ بھی ہوتی تو بھی دینِ جمہور کے تحت اس قانون کا بنایا جانا اور اس کا نفاذ عین عقلی اور منطقی قرار پاتا۔ پاکستان میں مسلمانوں کی تعداد 96 فی صد ہے اور سروے یہ بتلاتے ہیں کہ پاکستانی شہریوں کی اکثریت نہ صرف اس قانون کے حق میں ہے بلکہ اس کی پرجوش حامی ہے کیونکہ وہ توہین رسالت کو اپنے خلاف جرم (offense) سمجھتے ہیں۔ تو توہین رسالت ایک شخص کے خلاف نہیں بلکہ پوری قوم کے خلاف جرم ہے اور فساد فی الارض کی بنیاد ہے۔ پس اس سے نہ صرف قوم کے جذبات مجروح ہوتے ہیں بلکہ اس قدر مجروح ہوتے ہیں کہ زمین میں فساد برپا ہو جاتا ہے لہذا اس کی یہ سزا سو فی صد شرع اور عقل کے مطابق ہے۔

اب رہی یہ بات کہ اس قانون کا غلط استعمال ہوتا ہے تو اس کا حل یہ نہیں ہے کہ جس قانون کا غلط استعمال ہو تو وہ قانون ہی ختم کر دیں بلکہ اس کا حل یہی ہے کہ اس کا غلط استعمال روکیں اور اس کے لیے مزید قانون سازی کریں۔ اب یہاں تیسرا سوال یہ ہے کہ کیا فرد کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ توہین رسالت کی سزا نافذ کرے؟ تو اس کا جواب یہی ہے کہ یہ حق ریاست ہی کا ہے کہ وہ یہ سزا نافذ کرے لیکن ریاست ایک طرف تو مذہبی انتہا پسندی کے خلاف ایکشن میں اپنی آخری حد تک چلی جاتی ہے اور دوسری طرف لبرل انتہا پسندی اور فساد فی الارض میں ملنے کو تیار نہیں ہوتی تو لوگ قانون ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔ اب یہاں مسئلے کا حل یہ نہیں ہے کہ ریاست مولویوں کی منتیں کرے کہ وہ عوام کو سمجھائیں۔ بھئی، مولوی تو عوام کو کب سے یہ بھی سمجھا رہے ہیں کہ چوری ڈکیتی جائز نہیں لیکن پھر بھی ہو رہی ہے اور خوب ہو رہی ہے۔

مسئلے کا اگر سنجیدہ حل چاہیے تو توہین رسالت کے قانون کو اسی طرح موثر کریں

by any imputation, innuendo, or insinuation, directly or indirectly, defiles the sacred name of the Holy Prophet Muhammad (peace be upon him) shall be punished with death, or imprisonment for life, and shall also be liable to fine [295-C]

جیسے نیشنل ایکشن پلان کو موثر کیا گیا ہے۔ نبی کریم ﷺ کو گالی دینے والے، خدا کا مذاق اڑانے والے اور مذہب کی توہین کرنے والے کو ریاستی سطح پر دہشت گرد ڈیکلیئر کریں اور اسے اسی طرح عقوبت خانوں میں رکھیں جیسے مذہبی انتہا پسندوں کو رکھا جاتا ہے تو نہ توہین ہو گی اور نہ ہی فساد برپا ہو گا۔ یہ توہین کرنے والے بہت خبیث اور کمینے ہیں، اب معاملہ یہ نہیں ہے کہ کسی کی زبان سے غلطی سے کوئی لفظ نکل گیا تو آپ کہیں کہ چھوڑو معاملہ رفع دفع کرو۔ اب تو یہاں سوشل میڈیا پر ہی ان کا انداز دیکھ لیں کہ صرف توہین نہیں کرتے بلکہ بار بار کرتے ہیں اور مجمعے کو اکساتے ہیں، توہین کرنے کے بعد مذہبی دوستوں سے پوچھتے ہیں کہ کتنی مرچیں لگیں؟ تو ایسے فسادیوں کو کھلی چھوٹ دینا معاشرے کو تباہی کی طرف دھکیلنا ہے۔

بعض دوستوں نے یہ سوال کیا ہے کہ اگر کوئی توہین رسالت کے مرتکب کو قتل کر دیتا ہے تو اس کی کیا سزا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا کیس عدالت میں جائے گا اور اگر عدالت یہ فیصلہ سنائے کہ مقتول نے نبی کو گالی دی تھی تو مقتول کا خون رائیگاں ہے اور قاتل کو قانون ہاتھ میں لینے کی کوئی تعزیری سزا مثلاً قید یا جرمانہ کیا جائے۔ اور اگر عدالت یہ فیصلہ کرے کہ مقتول نے توہین نہیں کی تھی تو پھر قاتل سے قصاص لیا جائے اور سر عام لیا جائے۔

فرقہ اہل حدیث اور فکر اہل حدیث

حضرت الاستاذ مولانا عبد الرحمن مدنی اکثر فرماتے تھے کہ معاصر اہل حدیث حضرات کے دو طبقے ہیں؛ ایک وہ جو فرقہ اہل حدیث سے تعلق رکھتے ہیں کہ ان کے نزدیک اصل اہمیت چند امتیازی مسائل کی ہے کہ جن پر بحث و تحقیق، مجادلہ و مناظرہ اور انہی مسائل کی دعوت و تبلیغ اور حنفیت کا رد ان کی زندگی کا کل مقصد ہے۔

دوسری طرف بعض علماء "فکر اہل حدیث" کے قائل ہیں کہ جنہیں حنفیہ سے اختلاف تو ہے لیکن وہ ان سے رد عمل میں نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک اصل اہمیت امتیازی مسائل کی نہیں بلکہ فکر اہل حدیث کی ہے۔ اور ان کے ہاں دنیا میں "ردِ حنفیت"

کے علاوہ بھی بہت سے اہم کام اہل حدیث کے کرنے کے ہیں جیسا کہ دہریت والحاد کا رد، مغربی افکار کا رد، جدیدیت کا رد، تجدد پسندی کا رد، انکار حدیث کا رد وغیرہ۔

حضرت الاستاذ کہا کرتے تھے کہ برصغیر میں اہل حدیث اس سوچ اور فکر کا نام ہے کہ جو شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ نے تقلیدی جمود کے خلاف پیش کی تھی۔ برصغیر میں اکابر اہل حدیث علماء کو حنفیہ سے اختلاف تو رہا ہے لیکن کوئی بھی ان سے چڑان کی کیفیت میں نہیں رہا۔ شیخ الکل فی الکل حضرت نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ اپنے فتاوی میں کتاب وسنت سے براہ راست استدلال کے علاوہ حنفی کتب فقہ بدائع الصنائع، فتاوی عالمگیری، الرد المحتار اور برصغیر کے حنفی علماء کی عبارتوں سے کثرت سے استدلال کرتے نظر آتے ہیں۔

برصغیر میں جماعت اہل حدیث کے بانی حضرت محمد حسین بٹالوی رحمہ اللہ کہا کرتے تھے کہ میں اجتہادی مسائل میں، کہ جن میں کتاب وسنت کا کوئی واضح اور صریح حکم نہ ہو، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مقلد ہوں۔ جماعت اہل حدیث کے امیر مولانا اسماعیل سلفی رحمہ اللہ کہا کرتے تھے کہ امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ اہل حدیث کے اماموں میں سے ہیں کہ وہ تقلیدی جمود کے قائل نہیں تھے۔

پاکستان میں فکر اہل حدیث کا ترجمان ادارہ جامعہ رحمانیہ، گارڈن ٹاؤن، لاہور میں ہے کہ جس کے بانی و مہتمم جناب مولانا حافظ عبد الرحمن مدنی صاحب ہیں جو ایک طرف جامعہ اشرفیہ اور دوسری طرف مدینہ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہیں۔ اور ان کی درسگاہ میں جہاں اہل حدیث اساتذہ ہیں تو وہاں بعض دیوبندی اساتذہ بھی پڑھاتے رہے ہیں۔ ہم نے اہل حدیث مدرسہ میں مشکوۃ شریف ایک دیوبندی عالم دین مولانا رحمت اللہ صاحب رحمہ اللہ سے پڑھی ہے۔

اس درسگاہ سے فارغ ہونے والے طلباء کی ایک بڑی تعداد دین کا اتنا کام کر رہی ہے کہ انہیں اپنی ذات میں ایک جماعت اور انجمن قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہاں فیس بک پر ہی ہمارے کلاس فیلوز میں جناب طاہر الاسلام عسکری، سید علی القاری، جواد احمد، قاری فہد

اللہ، فیض اللہ ناصر، حافظ شفیق الرحمن، حافظ عبد الحنان کیلانی، نعیم ناصف صاحب وغیر ہم کثیر موجود ہیں کہ جنہیں قریب سے جاننے والے ان کی کثیر الجہات صلاحیتوں اور دینی خدمات سے اچھی طرح واقف ہیں۔

اہل الحدیث کا ذوق عبادت

دوست نے سوال کیا ہے کہ اہل حدیث میں صرف عقیدہ ہی عقیدہ ہے یا عمل کی بھی کوئی خوبی موجود ہے؟ میں نے کہا کہ اہل حدیث کی وہ خوبی کہ جس کا اعتراف ہر وہ شخص کرتا ہے کہ جسے انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے، وہ ان کا نماز کا اہتمام ہے۔ وہ نہ صرف نماز کو اعتدال اور ٹھہراؤ سے ادا کرتے ہیں بلکہ اسے ضائع کرنے سے بھی بچتے ہیں۔ بلاشبہ تناسب کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اہل حدیث میں نمازیوں کی تعداد بھی بہت بڑھ کر ہے۔

یہ ان کے افراد کی نہیں بلکہ جماعتی خوبی ہے کہ آپ برصغیر پاک وہند میں ان کی کسی مسجد میں چلے جائیں، جتنے سکون اور اطمینان سے وہ نماز کو ادا کرتے ہیں، دوسرے بحثیت جماعت اس کے قریب کسی طور بھی نہیں ہے۔ انہوں نے اللہ کے رسول ﷺ کی نماز کی ظاہری ہیئت کو جس قدر اپنے عمل سے محفوظ کیا ہے، اس قدر کسی اور نے نہیں کیا ہے۔ قیام ہو یا قومہ، رکوع ہو یا سجدہ، تشہد ہو یا سلام، جو سکون ان کے ہاں ان ارکان کو ادا کرنے میں ہے، وہ کہیں اور کم ہی ملے گا۔

فجر اور عشاء کی نماز جس اہتمام سے وہ ادا کرتے ہیں، فجر منہ اندھیرے، لمبی قراءت کے ساتھ، اور عشاء آخر وقت میں، اطمینان اور سکون کے ساتھ، تو انہوں نے اپنی ایسی نمازوں کے ذریعے سلف کے زمانے کی یاد تازہ کر دی ہے۔ ہر نماز کو اول وقت میں ادا کرنے کی سنت بھی صرف انہی کے ہاں ملے گی۔ انہوں نے، رمضان ہو یا غیر رمضان، بہترین قراء کے ذریعے نمازوں میں حجازی لب ولہجے میں قرآن مجید کی تلاوت کو فروغ دے کر عبادت کا ایک ماحول پیدا کر دیا ہے۔ یہ ان کا ذوق عبادت ہے کہ عبادت تو نام ہی نماز کا ہے۔

میں اگر لیٹ ہو جاؤں یا سفر میں ہوں تو حنفی مساجد میں بھی نماز پڑھ لیتا ہوں اور اس معاملے میں سخت نہیں ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ جو اطمینان اہل حدیث مسجد میں نماز پڑھنے سے ملتا ہے، وہ دوسری مساجد میں نہیں ملتا کہ اکثر وبیشتر مساجد میں چار سے چھ منٹ میں نماز پڑھا دی جاتی ہے جبکہ اہل حدیث مساجد میں نماز کا یہ دورانیہ دس سے پندرہ منٹ تک کا ہوتا ہے۔ اگر آپ کو اپنی نماز اچھی کرنی ہے تو کچھ عرصہ اہل حدیث مساجد میں نماز پڑھنے کا اہتمام کریں، آپ واضح فرق محسوس کریں گے۔

ایک حنفی دوست نے کمنٹ کیا کہ بعض اہل حدیث مساجد میں نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا تو مشاہدہ یہ ہے کہ وہ پاؤں ملانے میں سختی اور تکلف کرتے ہیں۔ اور اپنی داڑھی اور سر پر رکھے سعودی رومال سے بہت زیادہ کھیلتے رہتے ہیں۔ اس پر تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ اہل حدیث میں جو لوگ ایسا کرتے ہیں تو انہیں اپنی اصلاح کرنی چاہیے کہ نماز میں یہ عمل خشوع وخضوع کے منافی ہے لیکن ان کی جو خوبی ہے تو بہر حال حنفیہ کو اس کا اقرار کرنا چاہیے کہ یہ اپنے نفس کی اصلاح کے لیے بہت ضروری ہے کہ دوسروں کی خوبیوں کا اقرار کیا جائے۔

سلفیہ اور اہل الحدیث

سلفیہ اور اہل الحدیث مختلف پس منظر رکھنے والے دو الگ الگ مکاتب فکر ہیں کہ جنہیں اکثر لوگ ایک ہی سمجھ لیتے ہیں۔ ان دونوں میں وہی فرق ہے جو اشعریہ اور شافعیہ یا ماتریدیہ اور حنفیہ میں ہے۔ سلفیت اصل میں عقیدے کی اصلاح کی تحریک ہے جبکہ اہل حدیث ایک فقہی مکتب فکر ہے۔

اہل حدیث فقہی جمود کی اصلاح کی تحریک ہے کہ جس کا بطور تحریک برصغیر میں آغاز حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ سے ہوا۔ حضرت شاہ صاحب سے بہت پہلے امام ابن حزم رحمہ اللہ اور امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فقہی جمود کے خلاف آواز بلند کی تھی۔

امام ابن حزم رحمہ اللہ کی تحریک رد عمل کی تحریک تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی جلالت علمی کے باوصف ائمہ پر بعض اوقات طنز اور طعن بھی کر جاتے ہیں۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ

کی تحریک اصلاحی تحریک تھی کہ وہ ائمہ سے اختلاف کرتے ہوئے پورے ادب اور احترام کے ساتھ ان کا ذکر کرتے ہیں۔ اور برصغیر کی تحریک اہل حدیث کے بانیوں پر اصل اثر ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا ہے نہ کہ ابن حزم رحمہ اللہ کا۔ لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ وہ حنفیہ سے رد عمل میں نہیں ہیں۔ لیکن متاخرین اہل حدیث میں بعض لوگ ابن حزم رحمہ اللہ سے زیادہ متاثر ہو گئے کہ جس کی وجہ سے اہل حدیث کی ایک پہچان ردِ حنفیت بھی بن گئی۔

سلفیت عقیدے کی اصلاح کی تحریک ہے کہ جس کا آغاز تو امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے ہوا لیکن اسے ایک باقاعدہ تحریک کی صورت امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے دی۔ یہ تحریک دراصل یونانی فلسفے اور منطق اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مسلم فلاسفی، علم الکلام اور نظریاتی تصوف سے پیدا ہونے والے بگاڑ اور فساد کی اصلاح کے لیے کھڑی ہوئی۔ اور ماضی قریب میں حجاز کے علاقے میں شیخ محمد بن عبد الوہاب نجدی رحمہ اللہ کے ہاتھوں اس تحریک کی تجدید ہوئی ہے۔

اہل الحدیث میں اکثر سلفی ہوتے ہیں لیکن بعض ایسے بھی ہیں کہ جن کا عقیدہ سلفی نہیں ہے جیسا کہ مولانا حنیف ندوی رحمہ اللہ کہ فقہی مسائل میں تو اہل حدیث ہیں جبکہ عقیدے میں اشعریت کی طرف مائل ہیں بلکہ وہ تو عقلیات ابن تیمیہ میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا موقف بیان کرنے کی بجائے اس پر نقد شروع کر دیتے ہیں۔ اور بعض سلفی ایسے ہیں جو اہل الحدیث نہیں ہیں جیسا کہ حنابلہ بلکہ حنفیہ میں بھی سلفی العقائد علماء موجود ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ سعودی عرب وغیرہ میں عقیدے کی اصلاح پر زور ہے کہ وہاں کی وہابی تحریک کا اصل مقصد یہی تھا جبکہ فقہ کے معاملات میں وہ چاروں فقہیں پڑھاتے ہیں اور خود حنبلی مسلک کی نسبت رکھتے ہیں جبکہ برصغیر میں اہل حدیث نے زیادہ کام فقہی جمود کے خلاف کیا ہے لیکن جب یہاں سے طلباء اور علماء سعودی عرب جانا شروع ہوئے تو یہاں بھی توحید اسماء وصفات کی بحثیں عام ہونا شروع ہو گئیں۔

میں خود سلفی العقیدہ ہوں اور فقہی طور اہل حدیث کے مسلک سے فکری مناسبت رکھتا ہوں لیکن یہ بات کہنے میں حرج محسوس نہیں کرتا کہ آج سلفیت اور اہل حدیث کی

دعوت اور منہج کے پھیلاؤ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ خود ہیں۔ اور اس کی وجہ دلیل کی کمزوری نہیں بلکہ اخلاق اور رویوں کی کمی ہے۔ آج اہل حدیث کو ابن حزم رحمہ اللہ کی ضرورت نہیں بلکہ جنید بغدادی رحمہ اللہ کی ضرورت ہے لیکن ان کا سارا زور اور وسائل ابن حزم رحمہ اللہ پیدا کرنے پر صرف ہو رہے ہیں۔

سلفیوں کی خدمت میں

برصغیر پاک وہند میں اہل حدیث اور عرب دنیا میں حنبلی عموماً سلفی کہلاتے ہیں کہ جن کا دعوی ہے کہ وہ واحد جماعت ہیں جو سلف صالحین کے عقیدے پر ہیں۔ میں عقیدے میں سلفیہ کی خدمات کا ہمیشہ معترف رہا ہوں بلکہ تا حال ہوں اور یہ سمجھتا ہوں کہ سلفی عقائد ہی کتاب وسنت کا صحیح بیان ہیں اور سلفیہ ہی وہ واحد جماعت ہے جو سلف صالحین، صحابہ وتابعین، فقہائے دین، ائمہ اربعہ اور محدثین عظام کے عقیدے پر ہے۔

لیکن مجھے آج ان کے عقیدے پر بات نہیں کرنی بلکہ اخلاق اور رویوں پر کرنی ہے۔ جب بھی دوست سلفیوں کے رویوں کی شکایت کرتے ہیں تو میں ہمیشہ ان سے اتفاق کرتا ہے کہ ان میں رویوں کا بہت بگاڑ اور فساد موجود ہے، عوام میں بھی، طلباء میں بھی، اور علماء میں بھی۔ رویوں کی خرابی میں سب سے نمایاں طور ہمیں ان کی شدت وسختی اور تجہیل وتضلیل نظر آتی ہے کہ ذرہ ذرہ سی بات پر پھٹ پڑنا، دوسروں کو جاہل اور گمراہ کہہ دینا، انہیں حقیر سمجھنا، فتوی لگانے میں جلدی کرنا، جس سے اختلاف ہو، اس سے دل سخت کر لینا وغیرہ عام نظر آئے گا۔ اور میں یہ دعوی نہیں کرتا کہ میں خامیوں اور کوتاہیوں سے پاک ہوں کہ میں بھی انہی میں سے ایک ہوں۔ اور یہ کوشش کرتا رہتا ہون کہ دوسرے مکاتب فکر کی علمی اور اصلاحی مجالس میں شریک رہوں تاکہ کسی قدر اعتدال نصیب ہو۔

یہ صرف یہاں برصغیر پاک وہند میں نہیں ہے بلکہ عرب کی سلفی علمی دنیا تک اس وقت قطبی، حزبی، مدخلی، سروری، علمی، جہادی، تکفیری وغیرہ میں نہ صرف منقسم ہیں بلکہ ایک دوسرے کا اس شدت سے رد بھی کرتے ہیں کہ جیسے دوسری قسم کے سلفی

گمراہ فرقے ہوں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں ہر ایک کتاب وسنت کے اپنے فہم کو اتنا حتمی سمجھتا ہے کہ دوسرے کو اختلاف کی گنجائش ہی نہیں دیتا اور فورا فتوی جڑ دیتا ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ سارے سلفیوں کے رویے ایسے ہیں، وہ جو باہر نکلے ہیں، معاشرے میں، وہ جو دوسروں کے ساتھ اٹھے بیٹھے ہیں، ان کے رویوں میں آپ کو اعتدال نظر آئے گا۔ دو چار دن پہلے ایک سلفی دوست اپنے بھائی کو جو کہ ایک سلفی مدرسہ کے منتظم ہیں، کہہ رہے تھے کہ ہماری مسجد کے فلاں نمازی حنفی تو ہیں لیکن معتدل ہیں، لہذا انہیں کبھی کبھار مصلے پر امامت کے لیے کھڑا کر دیا کرو۔ اس سے امت میں اتحاد اور محبت کے جذبات کو فروغ ملے گا۔ اب یہ بھی سلفی ہیں لیکن ان کا تبلیغ میں وقت لگا ہے لہذا ایک مسلک کی بجائے امت کی سطح پر سوچتے ہیں۔

تو جو سلفی حضرات آپ کو جماعت اسلامی، تبلیغی جماعت، تنظیم اسلامی یا دیگر مسالک کے ساتھ نیکی کے کاموں میں تعاون کرتے نظر آئیں گے تو ان میں اعتدال ہو گا۔ اور سلفی حضرات میں رویوں کا اعتدال کیسے پیدا ہو سکتا ہے، میری نظر میں اس کا حل یہی ہے کہ یہ اپنے مسلک کے علاوہ لوگوں کے ہاں بھی اٹھیں بیٹھیں، کچھ ان کی بھی سنیں، سنائیں۔ ورنہ تو پھر ٹھیک ہے، دیگر فرقوں کی طرح یہ بھی ایک فرقہ بن کر رہ جائیں گے کہ باہمی تمزق و تفرق کا شکار ہو کر تقسیم در تقسیم ہوتے چلیں جائیں گے۔

رویے اس قدر خراب ہیں کہ یقین مانیے کہ ایک دیوبندی اور بریلوی سے معذرت کرتے ڈر نہیں لگتا کہ امید ہوتی ہے کہ معاف کر دے گا بلکہ شاید معافی کے الفاظ آپ کی زبان پر ہوں تو اس دوران وہ کہہ دے کہ حضرت کیا کرتے ہیں؟ معذرت کی کیا ضرورت؟ شرمندہ نہ کریں وغیرہ لیکن سلفی سے معذرت کرتے وقت پہلے دل پر بھاری پتھر رکھنا پڑتا ہے کہ اسے آپ سے صرف معذرت نہیں مطلوب بلکہ وہ آپ سے زمین پر ناک رگڑنے کا مطالبہ کرے گا اور اس کے بعد میں بھی کچھ نہ کچھ ایسا کمنٹ مار کر ہی آپ سے رخصت ہو گا کہ آپ اندر تک سڑ کر رہ جائیں۔

ایک دوست کا کہنا یہ ہے کہ دلوں کا سخت ہونا کیا یہ شبہ پیدا نہیں کرتا کہ عقیدہ میں

بھی کہیں کجی ہے؟ تو عرض یہ ہے کہ اللہ کے بارے تو عقیدہ ٹھیک ہے البتہ لوگوں کے بارے ٹھیک نہیں ہے۔ برے رویوں کا تعلق عموماً اس عقیدے سے ہوتا ہے جو مخلوق کے بارے رکھا جاتا ہے جیسا کہ کسی کو کم علم، جاہل، حقیر سمجھنا وغیرہ

ایک دوسرے دوست کا کہنا ہے کہ "سلفی عقائد ہی کتاب وسنت کا صحیح بیان ہیں"....اگر آپ کا یہ بیان درست ہے، تو سلفیوں کی غیر سلفیوں کے خلاف شدت ٹھیک ہے۔ جواب: کوئی بھی یہ نہیں سمجھتا کہ میرا عقیدہ کتاب وسنت کے خلاف ہے، مسکراہٹ۔ عقیدہ کہتے ہی ذہنی گرہ کو ہیں کہ "عقدة" سے بنا ہے، ہر مجتہد اپنے نزدیک "مصیب" ہوتا ہے۔ ہم کسی مجتہد سے یہ مطالبہ نہیں کر سکتے کہ وہ اپنے آپ کو "مخطئ" قرار دے۔ ایسا کرنے سے تو مذاق بن جائے گا۔

دوست کا کہنا ہے کہ خود کو قابل ترجیح سمجھنے سے بھی گزارا ہو جاتا ہے۔ میری رائے میں ہر جگہ نہیں ہو گا مثلاً قادیانی، باطنی، منکر حدیث وغیرہ جیسوں کی تفسیر کے مقابلے میں آپ اپنے فہم قرآن کو قطعی درجے حتمی سمجھیں گے مثلاً مفکر قرآن صاحب کہہ رہے ہیں کہ قرآن مجید میں عمرہ سے مراد امیگریشن کے قوانین ہیں کہ یہ لفظ آباد کاری سے نکلا ہے یعنی غیر ملکیوں کو اپنے ملک میں آباد کرنے کے قوانین وضوابط بنانا۔ تو اس کے مقابلے میں کیا آپ اپنے فہم قرآن کہ عمرہ سے مراد عمرہ ہی ہے، کو قابل ترجیح سمجھیں گے کہ ہو سکتا ہے کہ میں غلطی پر ہوں اور مفکر قرآن درست ہو، ہر گز نہیں!

سلفی تند خو ہیں یا نرم مزاج

ہم نے "سلفیوں کی خدمت میں" کے عنوان سے ایک پوسٹ لگائی تھی کہ جس پر بہت سے فاضل سلفی دوستوں کے کمنٹس اور تبصرے موصول ہوئے کہ جن میں سے بعض سے ہمیں اتفاق بھی ہے۔ کچھ دوستوں کا کہنا ہے کہ سلفیوں کے اخلاق برے نہیں بلکہ وہ اس بارے بدنام زیادہ ہیں۔ یہ مشاہدہ ہمارے سلفی دوستوں کا ہے تو ہمیں کسی کے مشاہدے کو جھٹلانے کا اختیار نہیں بلکہ جو ہم کر سکتے ہیں، وہ یہ ہے کہ اپنا مشاہدہ بیان کر دیں۔

اس پر ہمارا کہنا یہ ہے کہ بعض اوقات ایک ہی بات کو دیکھنے کے زاویے مختلف ہوتے ہیں لہذا ہر زاویے سے جو جو منظر یا تصویر نظر آ رہی ہوتی ہے، اس میں اختلاف ہوتا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دیکھنے والوں کی پوزیشن مختلف ہوتی ہے۔ میں اپنے گھر کی کھڑکی سے گلی کا منظر بیان کروں گا تو وہ، وہ نہیں ہو گا جو کہ میرا ہمسایہ اپنے گھر کی کھڑکی سے جھانک کر بیان کرے گا۔ تو ایک تو زاویہ نگاہ کا اختلاف ہے کہ جس کی وجہ پوزیشن کا اختلاف ہے یعنی آپ کے کھڑے ہونے کے مقام کا۔

یہاں پوزیشنیں اصل میں دو ہیں؛ ایک دفاع کی اور دوسری اصلاح کی۔ سلفی اگر دفاع کی پوزیشن سے دیکھے گا تو اسے اپنے حلقے کی اخلاقیات اور رویے سب سے بہتر نظر آئیں گی۔ اور وہ اس بات کو پسند بھی نہیں کرے گا کہ سلفی جماعت پر تنقید کی جائے کہ مخالفین پھر اسی تنقید کے حوالے دے دے کر طعنہ مارتے ہیں۔ یہ صرف سلفیوں کا معاملہ نہیں ہے بلکہ ہر مسلک اور جماعت کا معاملہ ہے کہ وہ ڈر کی نفسیات کا شکار ہیں کہ اگر ہم نے اپنے مسلک اور جماعت پر کھلے عام نقد کیا تو فریق مخالف اس کو میرے لیے طعن بنا لے گا۔ اور یہ بات درست بھی ہے کہ مناظرانہ ماحول نے ہمیں اس حد تک پہنچا دیا ہے۔

دوسری پوزیشن اصلاح کی ہے کہ جسے اپنی جماعت یا مسلک کو آگے لے کر جانا ہے تو وہ ضرور ان پر نقد کرے گا کیونکہ بہتری کے لیے نقد ضروری ہے۔ اور اگر سب اچھا کرتے رہیں گے تو وہیں کھڑے کے کھڑے رہ جائیں گے جیسا کہ وہی باپ اپنی اولاد کو کچھ بنانے میں کامیاب ہوتا ہے جو اسے کبھی یہ احساس نہ ہونے دے کہ وہ کچھ بن چکا ہے۔ اور جس دن اولاد کو یہ احساس ہوا نہیں، وہی دن اس کے زوال کا دن ہے۔

اور جب میں یہ کہتا ہوں کی میری جماعت یا مسلک میں یہ مسائل ہیں تو ان میں سب سے پہلے "میں" خود مراد ہوتا ہے۔ مجھ سے جب کسی نے میرے رویوں کے بارے شکایت کی تو میں نے کہا، بالکل ٹھیک کہتے ہیں، میں اپنی اصلاح کروں گا۔ اب چاہے تنقید کرنے والے نے مبالغہ ہی کیا ہو لیکن میرے مان لینے سے کیا جاتا ہے؟ سوائے اس کے

کہ میں اپنے آپ کو مزید بہتر بنالوں گا۔ لیکن میرے لیے یہ سمجھنا اسی وقت ممکن ہے جبکہ میں اپنی اصلاح کی پوزیشن لیے ہوئے ہوں نہ کہ دوسروں کی۔ اور آپ پر کی گئی تنقید اگر سو فی صد درست نہیں ہوتی تو سو فی صد غلط بھی نہیں ہوتی۔

اور بلاشبہ ہر مسلک اور جماعت نے لفظوں کی حد تک "مناظر" سے "مصلح" بننے کی پوزیشن لینے کا دعوی کیا ہے لیکن یہ "مصلح" بھی وہ دوسروں کے لیے ہوتے ہیں، اپنے لیے نہیں۔ میری جماعت اور میرا مسلک، میرا خاندان ہے۔ مجھے اگر اپنے بچوں کی اصلاح کرنی ہے تو میں اپنے پڑوسی کے بچوں کی بری عادتیں انہیں نہیں گنواؤں گا، چاہے وہ میرے بچوں سے لاکھ برے ہوں۔ پس اگر میری نوے فی صد پوسٹیں دوسروں کی اصلاح کے بارے ہوتی ہیں تو دس فی صد تو اپنی اصلاح کے بارے بھی ہونی چاہییں، یہ ہر اس جماعت اور مسلک کو سوچنا چاہیے جو دوسروں کے ساتھ اپنی اصلاح بھی چاہتے ہیں۔

اکیسویں صدی میں امت مسلمہ کی امامت

عالم اسلام کے فکری، علمی اور سیاسی احوال کا مشاہدہ واضح طور یہ بتلا رہا ہے کہ امر تکوینی یہی ہے کہ جس طرح بیسویں صدی میں امت مسلمہ کی علمی، فکری اور سیاسی امامت دیوبند کے پاس تھی، اسی طرح اکیسویں صدی میں یہ امامت سلفیوں کے پاس ہو۔ اب یہ بعد کا مسئلہ ہے کہ اکیسویں صدی والے بیسویں والوں کی امامت یا بیسویں والے اکسیویں صدی والوں کی امامت کے بارے یہ تبصرہ کریں:

﴿وَأَنَّا لَا نَدْرِي أَشَرٌّ أُرِيدَ بِمَن فِي الْأَرْضِ أَمْ أَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا﴾ [الجن: 10]

"ہمیں نہیں معلوم کہ جو زمین میں بستے ہیں، ان کے پروردگار نے ان کے ساتھ کوئی بھلائی کا ارادہ کیا ہے یا شر کا۔"

فکری اہل حدیث

علمی بات یہ ہے کہ اہل الحدیث کی اصطلاح دو طرح سے استعمال ہوتی ہے۔ ایک تو اہل الرائے کے بالمقابل، اور اس اعتبار سے اہل الحدیث وہ مکتب فکر ہے کہ جس کے بانی

امام مالک رحمہ اللہ ہے اور پھر اس مکتب فکر کو ان کے شاگرد امام شافعی رحمہ اللہ نے آگے بڑھایا۔ پھر ان کے شاگرد امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ لے کر چلے۔۔ پھر ان کے شاگرد امام بخاری رحمہ اللہ نے اس میں اضافے فرمائے۔ اس اعتبار سے اہل الحدیث ایک بہت قدیم سوچ اور فکر ہے جیسا کہ اہل الرائے یا حنفی ایک قدیم مکتب فکر ہے۔ اہل الحدیث اور اہل الرائے کے ان دو اجتہادی مکاتب فکر کے اختلافات پر میری مستقل تحریریں شائع ہو چکی ہیں جیسا کہ ماہنامہ الاحیاء وغیرہ میں۔

میں اپنی تحریروں میں امام مالک رحمہ اللہ کے زمانے سے مدینہ سے شروع ہونے والے اس قدیم مکتب فکر کو "فکری اہل حدیث" کا نام دیتا رہا ہوں۔ مجھ سے جب بھی کوئی پوچھتا ہے تو میں یہی کہتا ہوں کہ میں "فکری اہل حدیث" ہوں یعنی ان ائمہ دین کی فکر پر ہوں اور وہ فکر یہ ہے کہ ائمہ کے اقوال کو کتاب وسنت پر پیش کرتے رہو نہ کہ کتاب وسنت کو ائمہ کے اقوال پر پیش کرو۔ یہ فکری اہل حدیث آج بھی پائے جاتے ہیں لیکن تعداد میں بہت کم ہیں۔ یہ ائمہ دین پر طعن نہیں کرتے، یہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے استفادہ کے بھی قائل ہیں اور ان سے اختلاف بھی کرتے ہیں۔ اشارتاً عرض کرتا چلوں کہ "فکری حنفی" بھی موجود ہیں جو اختلافی مسائل میں سخت نہیں ہیں یعنی رفع الیدین سے بھی نماز پڑھ لیں گے لیکن فکری وابستگی اہل الرائے/حنفیہ سے ہے۔

دوسرا اہل الحدیث سے مراد برصغیر کی "جماعت اہل حدیث" ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ ایک خاص دور میں وجود میں آئی اور شیخ الکل نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ کو ان کا نقطہ آغاز کہا جا سکتا ہے۔[1] برصغیر میں تقلیدی جمود کی اصلاحی تحریک کا آغاز

[1] یہ در اصل اس موضوع پر دو تحریریں تھیں، جو کہ فیس بک پر پبلش کی گئی تھیں۔ پہلی تحریر جو "علمائے دیوبند" کے نام سے تھی، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ برصغیر کے اہل حدیث، حنفیوں سے نکلے ہیں لہذا ان سے اختلاف ضرور کریں لیکن ان کا احترام واجب ہے۔ بعد میں محترم ارشاد الحق اثری صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ یہ مقدمہ تاریخی طور درست نہیں ہے۔ عام طور اہل حدیث علماء برصغیر پاک وہند میں اپنا تاریخی آغاز محمد بن قاسم رحمہ اللہ کی آمد سے شروع کرتے ہیں نہ کہ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کی تقلیدی جمود کے خلاف اجتہادی مساعی سے۔ تو وہ تحریر اس کتاب میں شامل نہیں کی گئی اور موضوع پر دوسری تحریر "کیا حنفیہ، اہل حدیث سے نکلے ہیں؟" کو بھی استاذ محترم مولانا عبد الرحمن مدنی صاحب کے تبصرہ کے بعد

شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ اور ان کے خاندان کی "فکر اہل حدیث" سے ہوا تھا کہ جس نے شیخ الکل نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ پر آکر ایک جماعت کی صورت اختیار کر لی لیکن اب بد قسمتی سے یہ "فرقہ اہل حدیث" بن چکا ہے۔ اور ان کے شاگرد مولانا محمد حسین بٹالوی رحمہ اللہ نے قادیانیت، نیچریت اور تقلید کے رد میں بہت کام کیا اور 1877ء میں "إشاعة السنة" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا۔ انہوں نے ہی سرکاری کاغذات میں اپنے ہم فکر ساتھیوں کے لیے "وہابی" کی جگہ "اہل حدیث" کا نام پسند کیا۔ البتہ یہ بات تاریخی طور درست ہے کہ برصغیر میں حنفیت جو تین مسالک میں تقسیم ہوئی ہے تو اس میں اہل حدیث پہلے وجود میں آئے۔ دار العلوم دیوبند کے قیام سے تقریباً بیس سال پہلے شیخ نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ نے شاہ محمد اسحاق رحمہ اللہ کی مسند پر بیٹھ کر برصغیر میں اہل حدیث کی پہلی درسگاہ کی بنیاد رکھ دی تھی۔

اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہی مولانا محمد حسین بٹالوی صاحب رحمہ اللہ اپنے آپ کو "حنفی اہل حدیث" لکھتے تھے۔ وہ اجتہادی مسائل میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے قول پر فتوی دینے کے قائل تھے کہ عرف میں فقہ حنفی تھی لہذا مناسب یہی تھا کہ جن مسائل میں صریح احادیث موجود نہ ہوں تو امام صاحب کے قول پر فتوی دیا جائے۔ پھر اس کے بعد برصغیر کے اہل حدیث میں سختی آتی چلی گئی اور ان کی اکثریت میں امام صاحب سے چڑ پیدا ہو گئی بلکہ اہل حدیثیت نام ہی حنفیت کے رد کا پڑ گیا۔ امام صاحب کو لعن طعن کرنے والے بھی موجود ہیں اگرچہ کم ہیں۔ آج کل وہی لوگ جماعت میں غالب ہیں کو

تہذیب وتنقیح کے ساتھ "فکری اہل حدیث" کے نام سے پیش کر دیا گیا ہے۔ جزاکم اللہ خیرا۔ البتہ میں یہ بات اب بھی درست سمجھتا ہوں کہ برصغیر کی جماعتِ اہل حدیث، حنفیہ سے ہی نکلی ہے بایں معنی کہ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ حنفی اہل حدیث تھے۔ باقی ہماری اس تحریر پر بعض کٹر اہل حدیثوں کی طرف سے جو شدید رد عمل واٹس ایپ گروپس میں دیکھنے کو ملا تو اس سے معلومات میں یہ اضافہ ہوا کہ یہ حضرات بھی گالیاں دینے میں بہت فصیح وبلیغ ہیں۔ ان میں بعض ایسی۔۔۔ ہیں کہ جو اب یہاں بیان نہیں کی جا سکتیں لیکن بعض اہل حدیث کا رد عمل بہت معتدل بھی تھا اور میں ان کا شکر گزار ہوں۔ یعنی انہیں میری بات سے اتفاق نہیں تھا لیکن انہوں بہت احسن انداز میں رد بھی کیا اور مکالمہ بھی۔ اہل حدیثوں میں معتدل ترین لاہور کے اہل حدیث ہیں، اس کے بعد فیصل آباد کے اور رہے گجرانوالہ کے تو وہ واضح ہی ہیں کہ کیا ہیں۔

فقہ حنفی کا خوب رگڑا لگائیں۔ اور معاشرے میں انہی کو اہل حدیث کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے لیکن میں انہیں اہل حدیث کا اصل نمائندہ نہیں سمجھتا بلکہ "فکری اہل حدیث" کو اہل حدیث کا حقیقی نمائندہ سمجھتا ہوں اور انہی کی طرف نسبت رکھتا ہوں۔

مسلک سے براءت نہیں، مسلک کی اصلاح

اس میں کوئی شک نہیں کہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد مسلکوں سے بیزار آچکی ہے اور اس کی وجہ مسلکوں کا باہمی تعصب اور منافرت ہے۔ مجھے دعوت اور تبلیغ کے کام کے دوران بہت سے ایسے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ سب مسلکوں سے نکل جائیں، انہوں نے ہمارا بیڑا غرق کر دیا ہے۔ میں نے اس مسئلے پر پورے اخلاص کے ساتھ غور کیا ہے اور اس نتیجے تک پہنچا ہوں کہ مسئلے کا حل مسلکوں سے براءت نہیں، ان کی اصلاح ہے کہ یہ تعصب کی بنیاد پر کھڑے ہیں اور آپ ان سے محبت کا اظہار کر کے تو اس تعصب کو کم کر سکتے ہیں لیکن ان سے لاتعلقی کا اعلان کر کے اس تعصب کو مزید ہوا ہی دے سکتے ہیں۔

اب مسلکوں کی اصلاح کے لوگوں نے دو مطلب سمجھے اور دونوں غلط سمجھے کہ وہ دونوں ہی مسلک پرستی تھے۔ ایک مطلب یہ نکالا گیا کہ سب مسلکوں سے اعلان براءت کرو اور اپنے آپ کو مسلمان کہو اور بعد میں "جماعة المسلمين" بن جاؤ یعنی سب مسلک غلط اور ٹھیک صرف تم ہو۔ اور دوسرا یہ کہ مسلکوں کی اصلاح کا مطلب یہ ہے کہ میں نے دوسرے کے مسلک کی اصلاح کرنی ہے نہ کہ اپنی۔ اپنے مسلک کی اصلاح چھوڑ کر دوسرے کے مسلک کی اصلاح کرنا اتنا ہی لغو ہے جتنا اپنی ذاتی اصلاح چھوڑ کر دوسروں کی اصلاح کی فکر کرنا۔

مسلکوں کی اصلاح کا جو مفہوم مجھے سمجھ میں آیا، وہ یہ ہے کہ آپ کسی نے کسی مسلک سے منسلک رہیں، اس سے نسبت رکھیں، اسے اپنا سمجھیں، لیکن تقلیدی جمود کا شکار نہ ہوں، آنکھیں بند نہ کر لیں، دوسرے مسلک کی اصلاح پر اگر ستر فی صد وقت لگاتے ہیں تو بیس فی صد اپنے مسلک کی اصلاح پر لگائیں۔ اور یہ بھی ٹھیک نہیں ہے کہ آپ کو اپنے

مسلک میں کوئی اچھائی نظر ہی نہ آئے، اس کا مطلب بھی یہ ہے کہ آپ غلط جگہ آ گئے ہیں، دوسری جگہ چلے جائیں کہ جن سے آپ کو اتفاق زیادہ ہے۔

اپنے مسلک کو اپنا فرقہ نہ بنائیں بلکہ اس سے صرف نسبت رکھیں، فکری نسبت، بس۔ اور مسلک کو فرقہ بنانا یہ ہے کہ آپ نے ساری زندگی دوسرے کی مسلک کی اصلاح میں گزار دی اور اپنے مسلک کی اصلاح کے لیے کچھ نہ کیا۔ ہم ایک دوسرے کی اصلاح میں بری طرح ناکام ہو چکے، ہماری نمازیں حالت احسان میں ہوتی ہیں لیکن ہمارے قلم، فریق مخالف کا خون ٹپکا رہے ہوتے ہیں اور ہم اسے جہاد سمجھ رہے ہوتے ہیں۔ آج ہمیں احسان والی نماز نہیں، احسان والا قلم چاہیے کہ جو دوسروں کے بارے لکھتے ہوئے اللہ کی جناب میں موجود ہونے کے تصور سے لرز اٹھتا ہو۔

ہم کس قدر دینی اور اخلاقی بحران کا شکار ہیں، ہمیں ہر وہ شخص معتدل نظر آتا ہے جو اپنے مسلک پر نقد کرے اور ہم اسے لائک بھی خوب کریں گے، شیئر بھی کریں گے لیکن اپنے مسلک پر نقد کر کے خود ویسا معتدل بننا پسند نہیں کریں گے کہ ہم نے تنہائی میں مصلے پر بیٹھ کر اپنے غلط ہونے پر رب سے مکالمہ ہی نہیں کیا۔ یا اگر اپنے مسلک کو غلط سمجھا بھی ہے تو نقد اس لیے نہ کی کہ دوسرے مسلک سے ریسلنگ جو ہو رہی ہے، وہ ہار جائیں گے حالانکہ یہی ہار، آخرت میں ہماری جیت کی علامت ہے۔ بس، مسلک کی اصلاح اسی وقت ہو سکتی ہے، جب ہم حالت احسان میں آ جائیں۔ اور آج بد قسمتی سے کوئی حالت احسان میں نظر نہیں آتا، نہ سلفی نہ صوفی، میں آپ کی نماز نہیں آپ کا قلم دیکھ کر یہ بات کر رہا ہوں۔

ماضی میں ہوا یہی ہے کہ جس نے مسلک پرستی کے خلاف کام کیا اور کتاب وسنت کی طرف دعوت دی تو خود سے ایک نیا مسلک بنا لیا۔ مسعود الدین عثمانی اور مسعود احمد بی ایس سی اس کی دو بہترین مثالیں ہیں۔ اور آج کل انجینئر محمد علی مرزا صاحب اس کی بہترین مثال ہیں۔

اور حقیقت یہی ہے کہ مسلکوں کا رد کرنے والے اپنی تحقیق اور تشریح کے صحیح

ہونے پر اتنی ہی شدت سے اصرار کر رہے ہوتے ہیں جتنا کہ مسلک والے۔ بھئی، اگر کسی مسلک کی تشریح نہیں لیں گے تو عامی کہاں سے تشریح لے گا، آپ سے۔ اور جب آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ سب مسلک غلط ہیں تو آپ خود ایک مسلک ہیں۔ یہ بات تو بہت سادہ سی ہے۔

تنظیم سازی اور جماعتیں بنانے کی شرعی حیثیت

جماعۃ الدعوۃ کی سیاسی جماعت "ملی مسلم لیگ" کے سیاست میں آنے کے اعلان کے ساتھ ہی "جماعۃ الدعوۃ" اور "مرکزی جمعیت اہل حدیث" کے کارکنان کے درمیان سوشل میڈیا پر ایک غزو فکری (intellectual war) کا آغاز ہو گیا۔ ایسے میں اہل حدیث میں سے سنجیدہ علماء کی ایک جماعت نے دوبارہ سے اس بحث کو شروع کر دیا کہ جو تقریباً پچھلی صدی میں نصف صدی تک اہل حدیث علماء کے مابین باعث نزاع رہی ہے اور وہ یہ کہ اسلام میں تنظیمیں اور جماعتیں بنانا جائز ہے یا نہیں؟

اہل حدیث علماء کی ایک جماعت کا کہنا یہ ہے کہ اسلام کے بعد کسی جماعت اور تنظیم کی ضرورت نہیں ہے۔ اور یہ جماعتیں اور تنظیمیں امت میں افتراق وانتشار اور تحزب وعصبیت (fanaticism) کا باعث بنتی ہیں۔ ہر جماعت اور تنظیم کے کارکنان اپنی جماعت سے مخلص ہیں اور دوسری کے دشمن، چاہے ایک مسلک ہی کی کیوں نہ ہوں۔ ان سب کا دعوی یہ ہے کہ یہ دین کا کام کر رہی ہیں لیکن ان کا دینی کام تحزب اور تعصب کی بنیادوں پر ہوتا ہے کہ اپنی جماعت کے ساتھ کرنا ہے ورنہ نہیں کرنا۔

یہ اعتراض بہت قوی اعتراض ہے اور مشاہدے کے عین مطابق ہے کہ جماعتوں اور تنظیموں نے امت میں حزبیت اور تعصب کو ہوا دی ہے۔ اور تو اور تبلیغی جماعت والے تنظیم اسلامی والوں کو اپنی مسجد میں درس قرآن نہیں دینے دیتے۔ اور تنظیم اسلامی والے کون سا ان کے گشت میں شریک ہو جاتے ہیں؟ جماعت اسلامی اور جماعۃ الدعوۃ والے اپنا پلیٹ کسی اور جماعت کو دعوتی مقاصد کے لیے استعمال کرنے دیں گے کیا؟ پہلے مسلکوں کی مساجد ہوتی تھی، اب جماعتوں کی بھی ہیں۔

اوران کے ہاں اگر"وتعاونوا على البر والتقوى" کانعرہ لگایا بھی جاتاہے تواس کا معنی اور مفہوم یہی ہوتاہے کہ دوسری جماعت ہماری جماعت کے ساتھ تعاون کرے، باقی ہم اس کے ساتھ کریں تو یہ کسی کے ذہن میں نہیں ہے۔علاوہ ازیں ان جماعتوں اور تنظیموں کے وسائل ان کے بانیان کی خدمت کے لیے وقف ہو کر رہ جاتے ہیں اور اس پر مستزاد یہ کہ یہ خاندانی وراثت بن کر رہ جاتی ہیں حالانکہ انہیں پبلک پراپرٹی ہوناچاہیے کہ جماعتیں اور تنظیمیں کارکنان کی قربانی اور عوام کے پیسے سے بنتی ہیں۔

دوسری طرف جو علماء تنظیم سازی کے حق میں ہیں توان کا کہنا یہ ہے کہ جماعت کے بغیر مسلمان ایک ہجوم کی مانند ہیں اور ہجوم سے کسی اجتماعی کام کی امید کرنا عبث اور بے کار ہے۔جو علماء جماعت سازی کے خلاف ہیں تو وہ اس کے نقصانات یعنی تحزب اور عصبیت وغیرہ کی وجہ سے ہیں۔اس لیے جماعت سازی کی مخالفت کی بجائے اس کے نقصانات سے بچنے کی تدابیر اختیار کی جائیں کیونکہ جماعت کی افادیت سے کوئی کج بحث ہی انکار کرسکتاہے۔

پس تحریکی اسلامی کے کارکنان کو چاہیے کہ عوام کو صرف جماعتی زندگی اختیار کرنے کی دعوت نہ دیں بلکہ حزبیت کے انکار کی دعوت بھی دیں،تب یہ "کلمہ" مکمل ہوگا یعنی "الجماعة ولا حزبية" یعنی جماعتی زندگی اختیار کرو لیکن حزبیت سے دور رہو۔ دوسرا یہ کہ ہماری مذہبی جماعتوں اور اسلامی تحریکوں میں "امیر" وقتی اور عارضی ہونا چاہیے۔آپ شوریٰ کے اعتماد سے آئیں، تین یاچار سال کے لیے جماعت کے امیر رہیں، اب جاکر آرام کریں،اور دوسروں کو کام کا موقع دیں کہ یہ جماعت پبلک پراپرٹی ہے، خاندانی نہیں۔جب تک آپ مذہبی جماعتوں اور تحریکوں بلکہ دارالعلوموں اور جامعات میں "خاندانی آمریت" یا "اشرافیہ" (aristocracy) کے نظام کو ختم نہیں کرتے، اس وقت تک یہ جماعتیں اور تنظیمیں اس امت کے "امت" بننے میں رکاوٹ ہی رہیں گی۔میں ملوکیت کے نظام کے خلاف نہیں ہوں،اس کے جواز کا قائل ہوں کہ اسلام میں اس کی ممانعت نہیں ہے۔خلیفہ ہو یا بادشاہ، دونوں اچھے یا برے ہو سکتے ہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے والد کے وارث بنے تو اس میں حرج نہیں ہے کہ بیٹا اپنے باپ کی دینی وراثت پائے جبکہ وہ اس کا اہل بھی ہو۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ اس صورت میں آپ ملوکیت پر تنقید کرنے کا اخلاقی جواز کھو دیتے ہیں۔ یعنی آپ اگر ملوکیت کو جائز نہیں سمجھتے اور اس کے خلاف لمبی چوڑی تقریریں کرتے ہیں اور اسے ایک ظالمانہ اور استحصالی نظام قرار دیتے ہیں اور دوسری طرف اپنی اولاد کو اپنا دینی وارث بنادیتے ہیں تو یہ سیدھی سی منافقت ہے اور کچھ نہیں۔ ملوکیت کس چیز کا نام ہے؟ ملوکیت دو چیزوں کا نام ہے؛ بیٹا اپنے باپ کا وارث بنے اور تاحیات بنے۔ اس کے علاوہ کوئی تیسری چیز ملوکیت میں شامل ہوگی تو اضافی ہوگی۔ ملوکیت ضروری نہیں کہ ظالمانہ ہو، وہ عادلانہ بھی ہو سکتی ہے، یہ بات ہر کسی کے لیے واضح ہے۔

جماعتی زندگی اختیار کیجیے!

جماعتی زندگی میں ایک مسلمان انفرادی زندگی کی نسبت زیادہ پروڈکٹو ہو جاتا ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں ہے لہذا جماعت کے ساتھ جڑ کر رہیں۔ کتاب وسنت میں نیک لوگوں کی صحبت میں رہنے کا حکم دیا گیا ہے کہ فتنوں کے زمانے میں ایمان کی حفاظت اور دین پر عمل کا بہترین ذریعہ یہی ہے۔ اور نیک لوگوں کی صحبت کا ایک بہترین ذریعہ جماعتی زندگی بھی ہے۔

پاکستان میں کام کرنے والی چند ایک جماعتوں میں تنظیم اسلامی، جماعت اسلامی، تبلیغی جماعت اور جماعۃ الدعوۃ وغیرہ ہیں۔ تو تنظیم اسلامی جوائن کر لیں، یا اگر ان سے اتفاق نہیں تو جماعت اسلامی میں شامل ہو جائیں، ان سے بھی اختلاف ہے تو تبلیغی جماعت کے ساتھ جُڑ جائیں، ان سے بھی مناسبت نہیں تو جماعۃ الدعوۃ کے کارکن بن جائیں۔ اور اگر کسی سے بھی اتفاق نہیں تو اپنی جماعت یا ادارہ بنالیں۔

اپنی جماعت بنانے کی ترغیب تو ہمارے استاذ ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ بھی دیا کرتے تھے کہ ان کے نزدیک جماعتی زندگی اختیار کرنا لازم تھا کہ اس کے بغیر مسلمانوں کے فکری، علمی یا سیاسی غلبے کا کوئی خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ کام چالیس سے پہلے نہ

کریں تو اچھا ہے۔ اگر آپ کی خواہش ہے کہ لوگ آپ کے ساتھ مل کر کام کریں تو آپ بھی تو پہلے یہ ثابت کریں کہ آپ نے بھی لوگوں کے ساتھ مل کر کام کیا ہے۔ اطلاعاً عرض ہے کہ میرا جماعت یا ادارہ بنانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے لیکن اگر کوئی ایسا کرنا چاہے تو اس کی حوصلہ افزائی بھی کرتا ہوں اور ممکن تعاون بھی۔

فرد اور جماعت

اس میں کوئی شک نہیں کہ جماعت ایک فرد کی فکری، علمی اور اخلاقی تربیت کا ذریعہ بنتی ہے لیکن ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ جب یہی جماعت فرد کی فکری، علمی اور اخلاقی نشوونما میں رکاوٹ کا باعث بن جاتی ہے اور یہ اس وقت ہوتا ہے جبکہ جماعت، فرد کے بارے میں خوف کی نفسیات کا شکار ہو جائے۔ جماعت یہی چاہتی ہے کہ فرد، فرد ہی رہے، جماعت نہ بنے لہذا اسے جب بھی احساس ہوتا ہے کہ یہ فرد ایک جماعت بنے جارہا ہے تو وہ اسے اپنے وجود کے لیے خطرہ سمجھتی ہے کہ جماعت کی موجودگی میں جماعت کے چہ معنی دارد؟ لہذا عموماً قابل افراد، کہ جماعت جن کی نشوونما میں رکاوٹ بن جائے، یا تو جماعت سے باہر ہو جاتے ہیں یا سائیڈ پر ہو کر زندگی گزارتے ہیں۔ اور یہ مشکل ہر جماعت کو پیش آتی ہے۔

فرد اور جماعت کا اختلاف ویسا ہی ہے جیسا کہ مزدور اور سرمایہ دار طبقے کا ہے، اور یہ دونوں طرف سے دنیاوی مفاد کا اختلاف ہے، یہ مان لینا ضروری ہے۔ ورنہ ایک کو دنیا پرستی کا طعنہ دینا درست نہیں ہے یعنی جماعت کے لیے یہ کہنا درست نہیں ہے کہ فرد جماعت کے کندھوں پر چڑھ کر اپنا قد اونچا کرنا چاہتا ہے یا فرد کے لیے یہ کہنا درست نہیں ہے کہ جماعت اس فرد کی نشوونما کے حوالے سے خوف کی نفسیات کا شکار ہے۔

جماعت کی طبعی عمر

فرد کی طرح جماعت کی بھی ایک طبعی عمر ہوتی ہے کہ جسے گزار کر وہ مر جاتی ہے، ایسے میں ایک نئی جماعت معاشرے کی ضرورت بن جاتی ہے۔ ہر جماعت، چاہے وہ آپ کی ہو یا دوسرے کی، کا ایک عروج ہے، جس کے بعد اس کو زوال ہے۔ یہ تاریخی

اصول نہ صرف جماعتوں بلکہ ریاستوں اور تہذیبوں کے لیے بھی سو فی صد درست ہے۔ لہذا کبھی بھی نئی جماعتیں بننے کی مخالفت نہ کریں، ہمیشہ ان سے تعاون کریں کہ ایک نئی جماعت میں جذبہ بھی زیادہ ہوتا ہے، تخلیق بھی عمدہ ہوتی ہے اور سب سے اہم کہ فکری اور عملی جمود بھی کم ہوتا ہے کیونکہ تحریکوں میں فکری اور عملی جمود عموماً ایک وقت کے بعد پیدا ہوتا ہے۔

دین کا دعوتی ماڈل، انقلابی ماڈل اور جہادی ماڈل

اس وقت امت میں دین کا جس قدر تحریکی کام ہو رہا ہے، ہم اسے تین کیٹیگریز میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلی قسم کے لوگ وہ ہیں جو موجودہ زمانے میں دین کے تبلیغی اور دعوتی کام پر زور دیتے ہیں اور غلبہ اسلام کا درست منہج اسی کو قرار دیتے ہیں کہ تعلیم و تربیت اور دعوت و تبلیغ کا کام کیا جائے۔ اس منہج کے تحت پھر کئی طرح کی جماعتیں ہیں کہ کچھ تو ایسی ہیں جنہوں نے تعلیم و تربیت کو اہمیت دی اور کچھ ایسی ہیں کہ جن کے ہاں دعوت و تبلیغ اصل قرار پائی۔ دین کے غلبے کی جدوجہد کا یہ ماڈل "دعوتی ماڈل" کہلاتا ہے، اس کی سب سے بڑی مثال "تبلیغی جماعت" ہے۔

دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو غلبہ دین کے لیے صرف تعلیم و تربیت یا دعوت و تبلیغ کے قائل نہیں ہیں بلکہ ان کے ہاں ظلم کے خلاف جدوجہد کرنا وقت کا سب سے اہم دینی فریضہ ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو غلبہ اسلام کی جدوجہد اور امت مسلمہ کو ذلت و رسوائی سے نکالنے کے لیے غیر عسکری جدوجہد کے قائل ہیں جیسا کہ ظلم اور ظالم کے خلاف مظاہرے، لانگ مارچ، دھرنے، انتخابی اور احتجاجی سیاست کے وہ تمام طریقے کہ جنہیں دنیا کے کسی بھی خطے میں انسانوں کے بنیادی حقوق (Fundamental Human Rights) میں شمار کر لیا گیا ہے۔ دین کے غلبے کی جدوجہد کا یہ ماڈل "انقلابی ماڈل" کہلاتا ہے۔ اس کی عمدہ اور بہترین مثالوں میں "جماعت اسلامی" اور "تنظیم اسلامی" ہے۔

تیسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو ظلم کے خاتمے اور دین کے غلبے کے لیے عسکری

جدوجہد کو لازم سمجھتے ہیں، یہ عرف عام میں جہادی کہلاتے ہیں۔ یہ مسلم ممالک میں دین کے غلبہ اور غیر مسلم ممالک میں مسلمانوں پر ہونے والے ظلم وستم دونوں کے لیے جہاد وقتال ہی کو راہ نجات سمجھتے ہیں۔ پاکستان میں اس کی مثال تحریک طالبان پاکستان(TTP)ہے۔

پہلی قسم کے لوگوں کے رویے کو"پیسو"،دوسری قسم کو"ایکٹو"اور تیسری قسم کے رویے کو"ایگریسو" کہہ سکتے ہیں۔دعوتی ماڈل والوں کی دلیل یہ ہے کہ اسلام اوپر سے نہیں آسکتا،اندر سے آئے گا، تبدیلی اوپر سے نافذ نہیں کی جاسکتی،اندر سے آتی ہے۔ اگر معاشرہ اسلامی نہ ہو تو اسلامی حکومت قائم کرنے کا کوئی خاطر خواہ فائدہ نہ ہوگا۔اس لیے پہلے افراد پر محنت کریں، پھرانہی افراد میں سے جو لوگ اوپر جائیں گے تو اگر معاشرہ صالح ہوگا تو وہ بھی صالح حکمران ہی ہوں گے۔ یہ لوگ غیر مسلم اقوام سے قتال کی بجائے انہیں مسلمان کرنے کی محنت پر زور دیتے ہیں۔

انقلابی ماڈل والوں کا کہنا ہے کہ اکثریت ہمیشہ ایسے لوگوں کی رہی ہے جو محض دعوت تبلیغ یا منت سماجت سے نہیں سدھرتے۔ان کے خلاف جدوجہد کر کے ان کو عوامی پریشر میں لانا پڑتا ہے تا کہ وہ عوام کو ان کے جائز دینی حقوق فراہم کریں۔ تیسری قسم کے لوگ دراصل خود سے کوئی مستقل منہج نہیں ہیں بلکہ امریکی اور روسی ظلم وستم کا رد عمل ہیں۔اور رد عمل کی تحریکیں عموماً متوازن نہیں ہوتیں لہذا یہی وجہ ہے کہ ان تحریکوں سے امت کا نقصان زیادہ ہوا ہے۔خود مسلمان ریاستوں میں ظلم کے خلاف جو بھی عسکری جدوجہد ہوئی ہے،اس کا نتیجہ فساد کے علاوہ کچھ نہیں نکلا ہے۔

میری رائے میں غلبہ اسلام اور ظلم کے خاتمے کا قابل عمل ماڈل فی الحال دوسرا ہے، مسلمان ریاستوں میں بھی اور غیر مسلم ممالک میں بھی،اور اس بارے تفصیل سے گفتگو اپنی کتاب ”عصر حاضر میں تکفیر، خروج، جہاد اور نفاذ شریعت کا منہج“ میں کر چکا ہوں۔ اس موضوع پر میری تمام پوسٹیں اسی تناظر میں دیکھی جائیں۔

دوست کا کہنا یہ ہے کہ تیسرا منہج تو کتاب وسنت کا ہے تو عرض یہ ہے کہ یہی مکالمہ

بہت طویل ہے کہ نصوص میں وارد لفظ "جہاد" کا معنی کیا ہے بلکہ "قتال" کا معنی بھی۔ جہاد ہر گز "قتال" کے معنی میں نہیں ہے بلکہ "قتال" اس کا ایک معنی ہے۔اور "قتال" ہر گز "جنگ" کے معنی میں نہیں ہے بلکہ جنگ اس کا غالب معنی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ جیسے جلیل القدر محدثین کو دیکھیں کہ "طائفة منصورة" والی روایت کا کامل مصداق اپنی جماعت محدثین کو قرار دیتے ہیں جبکہ اس میں قتال کا لفظ بھی ہے۔ تو یہ بہت لمبی بحث ہے۔

﴿وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا﴾ [الحجرات: 9] کا شان نزول یہی ہے کہ جنگ نہیں ہوئی تھی بلکہ جھگڑا ہوا تھا۔ تو قرآن مجید میں قتال کا لفظ جھگڑے کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔اور سلف نے بھی اس سے یہ معنی بھی مراد لیا ہے جیسا کہ اوپر محدثین کی رائے نقل ہو چکی۔ باقی آج کل جس طرح قتال کا غلبہ ہے تو یہ بیان بھی کہ قتال کا کوئی اور معنی بھی نصوص میں ہے، خود کو اجنبی اور مطعون بنانے کے مترادف ہی ہے، یہ بات درست ہے۔

تبلیغی/دعوتی جماعت کیسی ہونی چاہیے؟

اہل حدیث میں دعوت تبلیغ کا کام کھڑا کرنا چاہتے تھے، لہذا ان کی مختلف لوگوں سے مشاورت ہو رہی تھی۔ اس سلسلے میں، میں نے بھی کچھ تجاویز مرتب کی ہیں کہ جن کا خلاصہ یہ ہے:

مثلاً میرے خیال میں ایک تبلیغی اور دعوتی نیٹ ورک میں مقامی کام کو مرکزی اہمیت حاصل ہونی چاہیے اور یہ بہت ضروری ہے۔ ہمارے ہاں تبلیغی جماعت نے گھروں سے نکالنے پر زیادہ زور دیا ہے کہ جس کے کچھ فوائد بھی ہیں کہ انسان مادی ماحول سے نکل کر مسجد کے ماحول میں آکر کچھ عرصہ اپنے آپ کو پر سکون محسوس کرتا ہے لیکن دعوت کا یہ نبوی منہج نہیں ہے کہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ گھروں سے باہر نکالا جائے۔ دعوت کے نبوی منہج میں مقامی تبلیغی کام پر زور زیادہ ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کی تیرہ سالہ تبلیغی زندگی میں صرف ایک مرتبہ طائف کا سفر کیا ہے۔

یہ تو ہم نہیں کہہ سکتے ہیں کہ تبلیغ کے لیے دوسرے شہر جاناثابت نہیں ہے۔ تبلیغ کے لیے دوسرے شہر جانا بالکل جائز ہے لیکن ہم نکتہ یہ بیان کر رہے ہیں کہ اگر مقامی تبلیغی کام میں دلچسپی نہیں ہے اور وہ بالکل نہ ہونے کے برابر ہے تو اندرون ملک چار ماہ یا بیرون ملک سال لگانے پر زور دینا بالکل غیر مناسب ترتیب ہے۔ اسی طرح اگر بیوی حاملہ ہے اور بچہ ہونے کے قریب ہے یا بچہ بیمار ہے یا گھر والوں کے لیے نان نفقے کا انتظام نہیں ہے تو انہیں اللہ اور اس کے رسول کے حوالے کر کے دوسرے شہر تبلیغ پر نکل جانا جہالت اور بے وقوفی ہے۔

اس قسم کے حالات میں بیوی بچے عموماً رشتہ داروں کے کھاتے میں پڑ جاتے ہیں کہ جنہیں چار وناچار انہیں سنبھالنا پڑتا ہے۔ اور اس طرح بعض تبلیغی اور داعی، اپنی گھریلو ذمہ داریاں دوسروں پر پھینک کر خود اپنی دعوت تبلیغ کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ اس کا حل یہی ہے کہ دعوت تبلیغ کے لیے مقامی کام کو اہمیت دی جائے۔ دعوت تبلیغ کے لیے کیا یہ فرض ہے کہ آپ دوسرے شہر ہی جا کر دعوت تبلیغ کا کام کریں؟ بالکل بھی نہیں۔

دعوت اور تبلیغ کے کام میں الاقرب فالاقرب کا اصول، بنیادی اصول ہے۔ پہلے اپنے گھر والوں کو تبلیغ کریں، پھر رشتہ داروں کو، پھر دوستوں کو، پھر محلے والوں کو، پھر شہر والوں کو، پھر دوسرے شہر والوں کو۔ اس طرح آپ اپنی دنیاوی ذمہ داریوں سے بھی سبکدوش ہو سکتے ہیں اور دعوت اور تبلیغ کے کام سے اپنی تربیت بھی کر سکتے ہیں کہ یہ مقامی لوگ ہی ہیں کہ جنہیں تبلیغ کرنے سے پہلے آپ کو اپنے آپ کو تبدیل کرنا ہوگا کیونکہ وہ آپ کی زندگی اور کاروبار زندگی سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں۔

جب بھی کچھ دوستوں نے کوئی نئی جماعت یا تحریک کھڑی کرنے کے لیے کسی عزم کا اظہار کیا تو میں نے ہمیشہ اسے تحسین کی نظر سے دیکھا کہ میری نظر میں ہر جماعت اور تحریک ایک مخصوص وقت گزارنے کے بعد تقلیدی جمود کا شکار ہو جاتی ہے اور اس کی اصلاح ممکن نہیں رہتی۔ ایسے میں وقت کی ضرورت یہی ہوتی ہے کہ کچھ اور لوگ آگے

بڑھ کر زمانے کے نئے تقاضوں کے مطابق اسی جماعتی اور تحریکی کام کو آگے بڑھائیں بشرطیکہ اپنے کام کو دین کا کل کام نہ سمجھیں بلکہ دین کا جزوی کام ہی سمجھیں اور دوسری جماعتوں کے ساتھ نیکی کے کام میں تعاون کریں۔

دیوبند کی تبلیغی جماعت کا نصاب دعوت وتربیت

ایک اہل حدیث عالم دین کہ جن کا تبلیغ میں بھی وقت لگا ہے، سے ملاقات ہوئی اور وہ یہ چاہ رہے تھے کہ اہل حدیث میں بھی رائے ونڈ کی تبلیغی جماعت کی طرح کا کام کھڑا کیا جائے تاکہ ان کی بھی اصلاح اور تربیت کا کام ہو سکے۔ میں نے تبلیغ میں وقت لگایا ہے۔ تین سال مقامی کام بھی کیا ہے، دو سال رائے ونڈ مرکز بھی آنا جانا رہا ہے۔ اور بلاشبہ ہزاروں اہل حدیث اس وقت بھی تبلیغی جماعت میں وقت لگا رہے ہیں جو دل میں اس کام کی اہمیت پیدا ہونے کے سبب سے ہے۔

تبلیغی جماعت میں خیر کے پہلو بھی بہت ہیں لیکن وہاں مسائل بھی ہیں کہ جن سے وقت لگانے والے اہل حدیث عموماً بے چین رہتے ہیں۔ ایک مسئلہ تو نصاب کا ہے کہ فضائل اعمال سے آگے نہیں بڑھتے۔ یا بہت کر لیا تو فضائل صدقات پر چلے گئے اور حیات الصحابہ سے کچھ مطالعہ کر لیا۔ اور قرآن مجید کے سمجھنے سمجھانے کی طرف تو بالکل رجحان نہیں ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اکسیویں صدی قرآن مجید کی صدی ہے۔ اب کوئی بھی تبلیغ یا تحریک قرآن مجید کو اپنا نصاب بنائے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ شروع میں کل قرآن مجید نہ سہی لیکن اس کے بڑے بڑے مضامین یا منتخب حصوں کو تو دعوت کا نصاب بنایا جا سکتا ہے مثلاً توحید وعبادت، رسول ورسالت، دنیا وآخرت، تلاوت وتزکیہ اور تعلیم کتاب وسنت۔

جس زمانے میں فضائل اعمال کو تبلیغ کا نصاب بنایا گیا تھا، اس وقت کے حساب سے ٹھیک تھا۔ آج تو ہر گلی محلے میں فہم قرآن کی تحریک پہنچی ہوئی ہے اور حدیث نہیں بلکہ صحیح حدیث پر عمل کی فکر بہت عام ہو چکی ہے۔ فضائل اعمال سے جتنا تبلیغ کا کام ہو سکتا تھا، ہو چکا۔ اب روایتی کام تو چلتا رہے گا، لیکن تبلیغی کام کا زمانے کے تقاضوں کے مطابق

آگے بڑھنا تو یہ اب اس نصاب کے ساتھ ممکن نہیں ہے۔ آپ قرآن مجید کل کا کل نصاب میں نہ رکھیں لیکن کم از کم اس کو مرکزی حیثیت تو دیں۔ تبلیغی جماعت کا نصاب دعوت چھ نمبر یعنی توحید، نماز، علم وذکر، اکرام مسلم، اخلاص نیت اور دعوت و تبلیغ تھے لیکن اب حقیقت یہی ہے کہ صرف "دعوت" کی ہی دعوت دی جارہی ہے۔

تبلیغی جماعت میں دوسرا مسئلہ علماء کا ہے، یہ تبلیغ کو تبلیغ نہیں رہنے دیتے بلکہ مسلکی تعصب میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ اگرچہ تبلیغی جماعت نے عام افراد کے لیے چار ماہ اور علماء کے لیے ایک سال رکھا ہے تاکہ انہیں مناظرانہ طبعیت سے دعوتی مزاج کی طرف پھیرا جاسکے لیکن اس کے باوجود یہ باز نہیں آتے۔ خود رائے مرکز میں ایک مفتی صاحب سوال پوچھنے پر یہ کہتے تھے کہ بھئی، غیر مقلد کے پیچھے نماز پڑھنے میں احتیاط ہے۔ البتہ انہیں یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ سوال پوچھنے والا بھی غیر مقلد ہی ہے۔ 99ء میں منڈی بہاؤالدین میں "چلے" میں چل رہا تھا تو جامعہ امدادیہ کے فارغ التحصیل ایک مولوی صاحب نے مجھے حنفی بنانے کے لیے بہت زور لگایا۔ لیکن عام تبلیغی ایسا نہیں ہے، یہ بات درست ہے، اور میں اس سے اتفاق کرتا ہوں۔

یہ بات اس لیے کر دی ہے کہ اہل حدیث میں اگر تبلیغ کا کام کھڑا کرنا ہے تو علماء سے تو نہیں البتہ علماء کے مزاج سے اسے بچا کر رکھیں، ورنہ ایک نئی مسلکی جماعت کا اضافہ ہو جائے گا، کام کچھ نہیں ہو گا۔ اور تبلیغ کے کام کی سرپرستی بھی وہی علماء ہی کریں کہ جن کا تبلیغ میں وقت لگا ہو۔ اس پر بالکل بھی کمپرومائز نہ کریں۔ تبلیغ کا کام ایک مزاج پیدا کرتا ہے اور وہ امت کو جوڑنے والا، اس کے لیے راتوں کو رونے والا، اس کے لیے درد رکھنے والا، اس کے لیے مارے مارے پھرنے والا مزاج ہے۔ یہ تبلیغی نصاب یا کتابیں پڑھنے سے نہیں، وقت لگانے سے ہی پیدا ہوتا ہے۔

تبلیغی جماعت کے بڑوں کی خدمت میں

سی پیک (CPEC) کی تکمیل کے ساتھ ہی اگلے چند سالوں میں چینیوں کا ایک سیلابی ریلہ پاکستان میں داخل ہونے والا ہے۔ ایسے میں وقت کی ایک اہم ضرورت ہے

کہ آج چینی زبان اور کلچر کو سیکھنے کی طرف توجہ کی جائے تاکہ ایسے داعی پیدا ہو سکیں جو چینیوں کو مشرف با اسلام کریں۔ اور اس کی امید تبلیغی جماعت ہی سے کی جاسکتی ہے۔ خود چین میں تو تبلیغ پر پابندی ہے لیکن ان کے یہاں آنے کے بعد تو انہیں تبلیغ پر کوئی پابندی نہ رہے گی۔

دنیا میں اس وقت اگر کوئی طاقت امریکہ کے مقابلے میں کھڑی ہو سکتی ہے، تو وہ چینی قوم ہے اور اچھی بات تو یہ ہے کہ یہ روسیوں کی طرف "فکری" لوگ نہیں ہیں۔ تو کیا معلوم کہ اس دعوت اور تبلیغ کے نتیجے میں "پاسبان مل گئے کعبے کو صنم خانے سے" والی صورت حال پیدا ہو جائے۔ آپ انہیں اپنی "مسجد" میں لانے کی فکر نہیں کریں گے تو وہ تو آپ کو اپنے "مساج سنٹر" میں لے جائیں گے۔ ایک سرکاری ادارے میں چینی زبان سکھانے والی کلاس کے تیس طلباء میں سے تقریباً چھبیس یا اٹھائیس کا تعلق فقہ جعفری سے ہے۔

تو بھئی آپ بھی کام کریں کام۔ دوسروں کو لعن طعن کرنے اور برا بھلا کہنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ دوسرے آپ سے تعداد میں بہت کم ہونے کے باوجود بہت کمٹڈ ہیں اور بہت پلاننگ سے کام کر رہے ہیں۔ انہی سے کچھ سیکھ لیں۔ بریلوی تو ہجوم ہیں، اہل حدیثوں کو جماعتیں بنانے سے فرصت نہیں ہے، اب اہل سنت میں سے دیوبند کی تبلیغی جماعت سے ہی کچھ امید کی جاسکتی ہے۔ بھئی، میں بھی چینی زبان سیکھنا چاہتا ہوں، کوئی رہنمائی کر دے، یہ ہر عالم کا جذبہ ہونا چاہیے۔

اہل حدیثوں میں دعوتی کام

ہمارے مدرسہ کے کچھ ساتھیوں نے اہل حدیث جماعت میں دعوت تبلیغ کے کام کا آغاز کیا ہے کہ جس کا مقصد یہ ہے کہ اہل حدیث کی ہر مسجد چار اعمال پر کھڑی ہو جائے:

① ہر مسجد میں ترجمہ قرآن کی کلاس شروع ہو اور ترجمہ قرآن کروانے والے معلمین کی تربیت کا بھی ایک باقاعدہ نظام بنایا جائے۔

② ہر مسجد میں جمعرات کے دن بعد از نماز عصر محلے میں گھوما جائے، لوگوں کو مسجد میں آنے کی ترغیب دی جائے، بعد از نماز مغرب آدھے گھنٹے کا اصلاحی بیان ہو، پھر بیان کے بارے باہمی مذاکرہ ہو کہ وہ بیان ذہن نشین ہو جائے اور سامعین اس کو آگے پھیلائیں، مزید وقت ملے تو نمازیوں کو دعوت دینے کی تربیت دی جائے، پھر عشاء کی نماز ادا ہو، اجتماعی کھانا کھایا جائے، پھر جن ساتھیوں نے گھر جانا ہو، گھر چلیں جائیں اور کچھ ساتھی مسجد میں رات گزاریں، رات کو جاگیں، صبح کی نماز باجماعت کے بعد اصلاحی بیان ہو اور اشراق کے ساتھ یہ اجتماع ختم ہو۔

③ ہر مسجد میں روزانہ عشاء کی نماز کے بعد "ریاض الصالحین" کی تعلیم ہو کہ پانچ سے سات منٹس میں ایک حدیث اور اس کی مختصر شرح بیان کی جائے۔

④ ساتھ والے محلے کی مسجد کو بھی ان تین اعمال پر کھڑا کیا جائے۔

ان چار اعمال کا مقصد یہ ہے کہ لوگ اپنی اصلاح کی فکر کرنے والے بنیں اور ہر شخص داعی بھی بنے۔ دعوت تبلیغ کے عمل میں دعوت کس چیز کی دی جائے گی تو اس بارے کل بارہ نکات سامنے آئے کہ ان کی اصلاح کے بارے دعوت دی جائے۔ ان بارہ نکات کو جوڑوں کی صورت میں چھ نکات بنا لیا گیا یعنی توحید و رسالت، دنیا و آخرت، تزکیہ و عبادت، اخلاقیات و معاملات، تعلیم کتاب و سنت، دعوت و تبلیغ۔

الحمد للہ! اس ترتیب پر لاہور اور ساہیوال کی بعض مساجد میں کام کا آغاز ہو چکا ہے۔ ہمارے محلے کی مسجد میں بھی ڈیڑھ ماہ سے اس ترتیب پر دعوت کا کام چل رہا ہے۔ اس ماہ ساتھیوں نے علماء کے سامنے اس کام کو رکھنے، ان سے مشورے لینے، اور ان کی دعائیں لینے کا پروگرام بنایا تو یہ طے پایا کہ ہر مہینے دو سے تین دن کسی ایک شہر کے کبار علماء کی خدمت میں حاضر ہوا جائے۔ اس ماہ فیصل آباد کا دورہ رہا۔ فضیلۃ الشیخ حافظ شریف صاحب، مولانا مسعود عالم صاحب، مولانا ارشاد الحق اثری صاحب، مولانا نجیب اللہ طارق صاحب، مولانا عبد اللہ امجد چھتوی صاحب، مولانا عتیق اللہ صاحب، مولانا شعیب

صاحب وغیرہ سے ملاقاتیں ہوئیں، سب علماء نے اس کام کی تائید فرمائی اور دعائیں دیں۔

مولانا عتیق اللہ صاحب نے کہا کہ اب تو داعیان، خطباء، مبلغین اور واعظین میں بھی بس شوں شاں ہی رہ گئی ہیں، عمل کچھ نہیں ہے۔ آپ لوگ بھی ایسے نہ ہو جانا۔ انہوں نے حاضرین مجلس سے پوچھا کہ آپ میں سے کوئی ایک بھی ایسا ہے کہ جس کی پچھلے چالیس دن میں ایک بھی تکبیر تحریمہ فوت نہ ہوئی ہو؟ انہوں نے کہا کہ وعدہ کر کے جاؤ کہ کوئی تکبیر تحریمہ فوت نہیں ہو گی اور کوئی تہجد کی نماز نہیں رہے گی۔ مولانا ارشاد الحق اثری صاحب نے فرمایا کہ انہوں نے کہیں پڑھا ہے کہ مولانا الیاس صاحب رحمہ اللہ نے کسی میواتی کا ہاتھ پکڑ کر انہیں دعوت دی تو اس نے مولانا کو غصے سے کہا کہ میرا ہاتھ چھوڑ دو تو مولانا نے اس کے پاؤں پکڑ لے۔ تو یہ عاجزی اور انکساری ہو گی تو دعوت کا کام ہو گا۔

مولانا نجیب اللہ صاحب نے کہا کہ اہل حدیث کے ساتھ لوگوں کو مسلمان بھی بناو کہ اہل حدیث بننے کی شرائط تو کم ہیں لیکن مسلمان بننے کی زیادہ ہیں۔ مثلاً اہل حدیث بننے کے لیے رفع الیدین، آمین بالجہر وغیرہ پر عمل کرنا ہو گا لیکن مسلمان بننے کے لیے وعدہ بھی پورا کرنے پڑے گا وغیرہ۔ الحمد للہ! جن مساجد میں رات کو ساتھیوں کا قیام رہا تو وہاں کے مقامی ساتھیوں نے خوب اکرام کیا۔ اگلے ماہ گجرانوالہ شہر کے علماء کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس کے بعد پشاور اور کراچی کا بھی پروگرام بنایا جائے گا، ان شاء اللہ۔

ملی مسلم لیگ

جماعۃ الدعوۃ سے تعلق رکھنے والے ایک دوست کا سوال ہے کہ آپ کی اس بارے کیا رائے ہے کہ جماعۃ الدعوۃ اپنی الگ سیاسی جماعت "ملی مسلم لیگ" کے نام سے قائم کر کے انتخابی سیاست میں آنا چاہ رہی ہے؟

جواب: جماعۃ الدعوۃ کا ویلفیئر کا کام مجھے بہت پسند ہے اور میں نے اس کی ہمیشہ تحسین کی ہے بلکہ سب ہی اسے اچھی نگاہوں سے دیکھتے ہیں الا یہ کہ جسے کوئی ان سے بہت ہی خار ہو۔ دوسری اچھی چیز جو جماعۃ الدعوۃ میں دیکھنے کو ملتی ہے لیکن ان کے معاصر تحریکوں میں کم ہے، وہ ان کے کارکنان کی محنت ہے۔ مجھے انہیں قریب سے

دیکھنے کا موقع ملا ہے اور یقین مانیے کہ ان جیسے جفاکش (hardworking) کارکنان پاکستان میں کسی تحریک تو کجا سیاسی جماعت کے پاس بھی نہیں ہیں۔

مجھے ان کے سیاست میں آنے پر اختلاف نہیں ہے بلکہ اختلاف اس پر ہے کہ آپ نے ایک عرصہ اس پر سیاست کی ہو کہ سیاست میں نہیں آنا چاہیے اور پھر آ جائیں تو یہ بہت بڑی اخلاقی گراوٹ ہے۔ یعنی جس کے شرک اور کفر ہونے پر آپ لوگوں کو گھنٹوں وعظ کرتے رہے اور دوسری جماعتوں سے اپنے امتیاز کی بنیاد بناتے رہے، اسے اچانک سے آپ نے یوں گلے لگا لیا جیسے برسوں کی آشنائی ہو۔

ممکن ہے کہ ایسا علمی بنیاد پر کیا گیا ہے یعنی علمی موقف میں تبدیلی آگئی ہے تو پھر پہلے اپنا نیا بیانیہ سامنے لائیں اور اپنے پچھلے موقف کی غلطی واضح کریں اور مانیں کہ ہم غلط تھے اور اب صحیح ہونے کی یہ دلیل ہے۔ اگر آپ ایسا نہیں کریں گے تو آپ کے اپنی جماعت کے کارکنان بے چینی محسوس کریں گے اور وہ ایسا کر رہے ہیں کہ ان میں سے بعض جماعت سے متنفر ہو رہے ہیں جیسا کہ ان کے تبصروں سے اندازہ ہوتا ہے۔

بھائی، آپ نے اپنے موقف میں یوٹرن لیا ہے، اس کے لیے کم از کم ایک سال تک جماعت کے اندر کارکنان کے لیول پر برین اسٹارمنگ ہونی چاہیے تھی تا کہ کارکنان کو واضح ہوتا کہ جماعت اس رخ پر جانا چاہ رہی ہے اور اس کے یہ دلائل ہیں۔ لیکن اب بھی جماعت کی لیڈرشپ کی طرف سے اس یوٹرن کے بارے جو وضاحتیں آ رہی ہیں، ان پر ہنسا ہی جا سکتا ہے۔ ایک ذمہ دار کہہ رہے ہیں کہ موقف میں تبدیلی نہیں ہوئی، جمہوریت آج بھی کفر اور شرک ہے، بس "الحرب خدعة" ہو رہا ہے۔ یعنی جنگ ایک دھوکے کا نام ہے۔ بھئی، دھوکا آپ انڈیا کو دینا چاہتے ہیں اور آپ کی جماعت کے کارکنان یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم سے ہاتھ ہو گیا ہے۔

اور یہ اچھا "الحرب خدعة" ہے کہ جس میں سوشل میڈیا پر اعلان کیا جا رہا ہے کہ ہم "الحرب خدعة خدعة" کھیل رہے ہیں۔ یا تو آپ بہت سادہ ہیں یا انتہائی بے وقوف، اور خیر یہ تو ہماری اکثر جہادی تحریکوں کا مسئلہ ہے یعنی سٹوپڈٹی۔ جب تک ہم

ذہانت، حکمت، بصیرت اور فراست میں اس درجے کو نہیں پہنچ پاتے جہاں اہل مغرب کھڑے ہیں، محض جذبات اور ریلیجس ایکٹوٹی سے ہمارے عالمی اسٹیٹس میں کچھ تبدیلی نہیں آنے والی ہے۔اس کو لکھ لیں۔اب سب مذہبی جماعتیں اور تحریکیں ذہانت اور بصیرت پیدا کریں، چاہے کسی یونیورسٹی سے آرٹیفیشیئل انٹیلجنس کا کورس پڑھ کر ہی کچھ حاصل ہو جائے۔ جماعۃالدعوۃ سے تعلق رکھنے والے کچھ دوستوں کا خیال ہے کہ سیاست میں ان کی آمد سے مراد انتخابات میں حصہ لینا نہیں ہے۔ چلیں، فی الحال تو اس معذرتی بیان پر کوئی بحث نہیں کرتا، صرف آپ کے اس بیان کی اسکرین شاٹس لے لیتا ہوں، کچھ وقت گزرنے دیں، آپ سے شیئر کر دوں گا۔

ملی مسلم لیگ کا نیا پاکستان

اس وقت ہمارے سامنے ملی مسلم لیگ کی آفیشل ویب سائیٹ ہے کہ جس میں اس "نئے پاکستان" کا خاکہ دیا گیا ہے جو کہ ملی مسلم لیگ بنانا چاہتی ہے۔ اس آفیشل ویب سائیٹ کے مطابق اس مذہبی سیاسی جماعت کی مذہبی سیاسی جدوجہد کے رنگ لانے کے نتیجے میں پاکستان میں چار قسم کی تبدیلیاں متوقع ہیں؛

① ایمپاور ویمن: جدید تعلیم یافتہ لوگ "ویمن ایمپاورمنٹ" کا ترجمہ بہت اچھا سمجھتے ہیں کہ اب یہ سیکولر اسٹیٹس کی ایک عالمی اصطلاح ہے۔ اگر آپ کو معلوم نہیں ہے تو ضرور معلوم ہونا چاہیے کہ ملی مسلم لیگ کے اعلیٰ تر مذہبی مقاصد میں سے ایک مقصد "ویمن ایمپاورمنٹ" بھی ہے۔ سادہ الفاظ میں "ویمن ایمپاورمنٹ" کا مطلب اس اصطلاح کے عالمی مفہوم اور اصول وضوابط کے مطابق زندگی کے ہر شعبے میں عموماً اور بزنس اور ملازمت میں خاص طور پر عورت کو بااختیار بنانے کی جدوجہد کرنا۔ سیکولر اسٹیٹس کا بیانیہ یہ ہے کہ دنیا میں عورتوں کے مظلوم ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ محسوس کی گئی ہے کہ اقتدار اور اختیار زندگی کے ہر شعبے میں مرد کے پاس ہے لہذا یہ اتھارٹی جب مرد سے عورت کو منتقل ہو گی تو ظلم خود بخود ختم ہو جائے گا اور

عدل کا نظام قائم ہو جائے گا۔ اب یہاں پاکستان میں کون سی لبرل اور سیکولر سیاسی جماعت ایسی ہے جو "ویمن ایمپاورمنٹ" نہیں چاہتی یا اس کا نعرہ نہ لگاتی ہو؟

۲) ملی مسلم لیگ کے قیام کے مقاصد میں سے ایک مقصد یہ بھی بیان ہوا ہے کہ وہ آئیڈیالوجی آف پاکستان کی حفاظت کرے گی اور آئیڈیالوجی آف پاکستان کیا ہے؟ انہی کے الفاظ میں یہ وہ اصول وضوابط ہیں، جن پر قائداعظم محمد علی جناح نے مسلم لیگ کو قائم کیا تھا اور چلایا تھا۔ ویسے یہ پہلی مذہبی سیاسی جماعت ہو گی جو محمد رسول اللہ ﷺ کی قائم کردہ جماعت کی بجائے محمد علی جناح کی مسلم لیگ کو اپنا آئیڈیل بنائے گی۔ اگر کوئی سیاسی جماعت، جو مذہبی ہونے کی دعویدار ہو، اس قسم کی اسٹیٹمنٹس جاری کرے تو آپ اسے اسٹوپڈٹی نہ کہیں تو کیا کہیں؟ ہاں! یاد آیا کہ "الحرب خدعة" کہہ سکتے ہیں۔ مجھے تو یہ سمجھ نہیں آ رہی کہ اب اگر جماعۃ الدعوۃ کے سالانہ اجتماع میں "سبیلنا، سبیلنا" کا نعرہ لگے گا تو اس کا جواب کیا آئے گا؟ بھائی، یہی آنا چاہیے کہ "ویمن ایمپاورمنٹ" اور "قائداعظم کی مسلم لیگ"۔ لیکن جس طرح ہر سیاسی جماعت کے پاس احمقوں اور بے وقوفوں کی کمی نہیں ہے لہذا یہاں بھی اطاعت امیر کے حیلہ کے نام پر وہی جواب آئے گا جو اندھی تقلید کا متقاضی ہو گا کہ "الجہاد، الجہاد" یعنی اب ویمن ایمپاورمنٹ اور قائداعظم کی مسلم لیگ بنانے کے لیے جدوجہد بھی "جہاد" شمار ہو گی؟

۳) ملی مسلم لیگ کے ایجنڈے کا تیسرا نکتہ اقلیتوں کے حقوق ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا اس ملک میں مسلمانوں کو پورے حقوق مل رہے ہیں جو آپ کو اقلیتوں کے حقوق کی فکر کھائے جا رہی ہے؟ اور پاکستان کی کون سی سیاسی جماعت ایسی ہے جو اقلیتوں کے حقوق کے نام پر سیاست نہ کر رہی ہو۔ یعنی ایک مذہبی سیاسی جماعت اور ایک سیکولر سیاسی جماعت میں امتیاز کیا ہوا؟ ایک

سیکولر سیاسی جماعت کیا ویمن ایمپاورمنٹ، قائد اعظم کی مسلم لیگ اور اقلیتوں کے حقوق کا نعرہ نہیں لگاتی؟ یا تو پھر آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ سیکولر سیاسی جماعتیں اس عالمی سیکولر ایجنڈے کے لیے صرف نعرے لگاتی ہیں جبکہ ہم اسے عملاً پورا کر کے دکھائیں گے، کیا یہ کہنا چاہتے ہیں یا پھر اس ایجنڈے کا مذہبی سیاسی جماعت سے تعلق کیا ہے؟ یہ سمجھ نہیں آرہا۔ آپ کتاب وسنت کے نفاذ کے ایجنڈے کی بات کرتے، آپ کوئی آئین کو اسلامائز کرنے کی جدوجہد کی بات کرتے، آپ کوئی سود کے خاتمے کی جدوجہد کی بات کرتے تو بات سمجھ میں بھی آتی کہ کسی مذہبی سیاسی جماعت کا ایجنڈا ہے۔ اور اب یہ نہ کہہ دینا کہ "الحرب خدعة" ہو رہا ہے۔ بھائی، اب یہ کبڈی کبڈی کہنا چھوڑیں اور کوئی کام کرنا ہے تو سنجیدگی سے کریں۔

④ کشمیر پالیسی یعنی کشمیریوں کے حقوق کی وکالت کرنا۔ چلیں، یہ نکتہ تو معقول ہے کہ آپ نے ساری زندگی اسی پر سیاست کی ہے لیکن یہ سمجھ نہیں آرہی کہ کشمیریوں کے حقوق کی جس وکالت کی آپ نے بات فرمائی ہے، وہ اقوام متحدہ کی قراردادوں کی روشنی میں حمایت کرنا ہے نہ کہ حق بات کی حمایت کرنا، یہ کیا ہے۔ اور دوسرا یہ کہ پاکستان کی کون سی سیاسی جماعت ایسی ہے جو اقوام متحدہ کی قراردادوں کی روشنی میں کشمیریوں کے حقوق کی وکالت نہ کرتی ہو تو آپ کس اعتبار سے دوسری سیاسی جماعتوں سے مختلف ہیں؟

ابھی تو سوشل میڈیا پر جماعت کے کارکنان کے بیانات ہی پڑھنے سننے کے لائق ہیں۔ کچھ سنجیدہ اور ذمہ دار کارکنان کہہ رہے ہیں کہ ہماری سیاسی جماعت کا مقصد الیکشن لڑنا نہیں ہے بلکہ ہم تنظیم اسلامی کی طرح کی احتجاجی سیاست کریں گے؟ تو پھر الیکشن کمیشن میں اپنے آپ کو بطور سیاسی جماعت رجسٹر کروانے کی وجہ کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ "الحرب خدعة" ہو رہا ہے یعنی ہم مغرب کو دھوکا دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چلیں جی، مغرب والے اتنے ہی سادہ ہیں جتنے کے آپ، اسی لیے تو دنیا پر حکومت

کر رہے ہیں اور اگلا نمبر آپ کا ہی ہے، ان شاء اللہ۔

ایک اور ذمہ دار کارکن نے کہا کہ ہم تو بیس سال سے سیاست میں ہیں۔ تو یہی تو ہم پوچھ رہے ہیں کہ اگر پچھلے بیس سال سے جماعۃالدعوۃ سیاست کر رہی ہے تو اب الیکشن کمیشن سے جماعت رجسٹر کروانے کی کیا ضرورت پڑ گئی؟ ان کا جواب تھا کہ شیخ نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ نے بھی جماعت رجسٹر کروائی تھی۔ بھائی، الیکشن کمیشن سے رجسٹر کروانے کے بارے میں پوچھ رہے ہیں؟ اور بطور سیاسی جماعت رجسٹریشن کے بارے میں سوال ہے؟ اور یہ صاحب مرید۔کے مرکز میں استاذ ہیں اور ان کے سترہ شاگرد شہید ہو چکے ہیں۔ اب ذہنی لیول دیکھیں اور جذبہ دیکھیں۔

اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ ہماری جہادی تحریکوں کا ایک ہی مسئلہ ہے اور ان کی ناکامی کی ایک ہی وجہ ہے، ٹی۔ٹی۔پی سے لے کر داعش تک، اور وہ ایک لفظ میں "سٹوپڈٹی" ہے۔ میں نے بات پوری کر لی ہے، اب آپ کے گالیاں دینے کا وقت ہوا چاہتا ہے! اور میں ہمہ تن گوش ہوں۔

باقی جو آپ کی جماعت میں اچھی باتیں ہیں، میں آج بھی ان کا قدردان ہوں جیسا کہ آپ کا ویلفیئر اور خدمت خلق کا کام ایک بے نظیر کام ہے اور آپ کے جماعت کے کارکنان کی جفاکشی اور محنت قابل تقلید صفات میں سے ہے۔

جماعۃالدعوۃ کے بڑوں کی خدمت میں

دو دن پہلے "الحکمۃ انٹرنیشنل" کے تحت ایک تقریب میں جماعۃالدعوۃ کے مرکزی رہنما اور ملی مسلم لیگ کے صدر جناب مولانا سیف اللہ خالد صاحب سے ملاقات ہوئی کہ جہاں انہوں نے "ملی مسلم لیگ" کے نام پر جماعۃالدعوۃ کے سیاست میں آنے کی وجوہات اور حکمتوں پر مفصل خطاب فرمایا۔ دستر خوان پر مولانا نے مجھ سے سوال کیا کہ آپ کی اس بارے کیا رائے ہے؟

میں نے کہا: مولانا! میری رائے تو یہ ہے کہ آپ کی جماعت کو یہ کام بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا جو ابھی کر رہے ہیں۔ لیکن اصل مسئلہ آپ کی جماعت کے کارکنان ہیں، جو

"میں نہ مانوں" والی ضد لگا کر بیٹھے ہیں۔ اور اب بھی اس بات پر مصر ہیں کہ جمہوریت کفر اور شرک ہے۔ اس لیے آپ پہلے اپنا جماعتی بیانیہ (narrative) واضح کریں۔

جس جماعت کی تیس سال تربیت اس نہج پر ہوئی ہو کہ جمہوریت کفر اور شرک ہے، الیکشن میں حصہ نہیں لیں گے، اس کے لیے اس پوسٹ سے ملحق امیر جماعۃ الدعوۃ جناب پروفیسر حافظ سعید صاحب کی ایک سابقہ تقریر بھی ضرور سماعت فرمائیں کہ جس میں وہ فرما رہے ہیں کہ سیاست میں کبھی نہیں آئیں گے، ممکن ہی نہیں کہ جہاد کے منہج کو چھوڑ کر کوئی اور منہج اختیار کر لیں، جمہوریت کفر اور شرک ہے، انتخابات میں کیسے حصہ لے سکتے ہیں۔ ان کی یہ تقریر اگرچہ بہت پرانی ہے لیکن بہت دلچسپ ہے۔ تو ان کی جماعت کا یہ فیصلہ ایک مہا یوٹرن ہے۔ تو ہمیں مسئلہ آپ کے سیاست میں آنے سے نہیں ہے کہ ہم تو خود آپ کو ووٹ دینے کے لیے تیار ہیں، اگر آپ سیاست میں صحیح طرح سے آتے ہیں تو۔

ہمیں مسئلہ آپ کے بیانیے سے ہے کہ بیانیہ کوئی نہیں ہے، ہر کارکن کا اپنا ہی موقف ہے۔ جماعۃ الدعوۃ کی لیڈر شپ کچھ کہہ رہی ہے، ان کے کارکنان کچھ کہتے ہیں اور ان کے علماء کچھ لکھ رہے ہیں۔ تو عوام ایک ایسی جماعت کی حمایت کیسے کر سکتے ہیں کہ جس کے بارے یہ ہی معلوم نہ ہو کہ اس کی علمی پوزیشن کیا ہے، فلاں مسئلے میں اس کا موقف کیا ہے اور وہ انتشار ذہنی کا شکار ہو۔

میری سوچی سمجھی رائے میں اس فتنے کا جماعۃ الدعوۃ کی لیڈر شپ کو ادراک نہیں ہے کہ جس میں وہ پڑ چکے ہیں اور وہ فکری انتشار کا فتنہ ہے اگرچہ یہ ان کی اپنی کھیتی ہے کہ جسے وہ کاٹ رہے ہیں کہ تیس سال دوسروں کو جمہوریت اور الیکشن کے نام پر طعنے دیے اور آج اسی گندی سیاست میں شامل ہونے جا رہے ہیں۔ لیکن پھر بھی، بھئی علمی موقف تبدیل ہو سکتا ہے، مجبوریاں ہو سکتی ہیں، مصلحت ہو سکتی ہے لیکن اس کے لیے آپ کو موقف کی تبدیلی کا اعلان کرنا پڑے گا اور ایک نیا بیانیہ جاری کرنا ہو گا۔

ائمہ وفقہاء نے بھی اپنے موقف تبدیل کیے ہیں، آپ بھی کر لیں تو حرج نہیں ہے

لیکن ابھی تک تو یہی نہیں معلوم ہو رہا کہ جماعت کا "جماعتی موقف" کیا ہے؟ اسے پہلے پرنٹ کر کے پبلش کریں اور پھر کارکنان سے کہیں کہ جسے اس سے اتفاق ہے، وہ جماعت میں رہے، نہیں تو جماعت چھوڑ جائیں۔ ورنہ تو جس طرح یہ چل رہے ہیں تو یہ "ہجوم" ہے، اسے سوشیالوجی میں "جماعت" نہیں کہتے۔ اور ہجوم فساد تو برپا کر سکتا ہے، کوئی مثبت کام نہیں کر سکتا۔ آپ اپنے موقف میں تبدیلی کا علمی بیانیہ جاری کریں، میں آپ کو ووٹ دوں گا۔ بھئی، اس پوسٹ کو سمجھنے کے لیے ویڈیو کلپ ضرور سنیں۔

تنظیم اسلامی کا اجتماع

تنظیم اسلامی کی بنیاد مولانا مودودی رحمہ اللہ کے شاگرد رشید جناب ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ نے رکھی تھی کہ جس کا مقصد پاکستان میں نظام عدل اور شریعت اسلامیہ کو پر امن طریقے سے غالب کرنا تھا۔ سید مودودی رحمہ اللہ نے دین اسلام کے غلبے کے لیے "انتخابی سیاست" کا طریق کار اختیار کیا تو ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ نے غلبہ دین کے لیے "احتجاجی سیاست" کے طریق کار کو پسند فرمایا۔

میں عام طور جن جماعتوں کے اجتماعات میں شامل ہوتا رہا ہوں، ان میں تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی، تنظیم اسلامی اور جماعۃ الدعوۃ ہیں۔ میری رائے میں ہمیں ہر اس اسلامی تحریک کو اسپورٹ کرنا چاہیے جو کہ دین کی نشر و اشاعت اور اس کے غلبے کے لیے پر امن طریق کار سے جدوجہد کر رہی ہے اور میں اپنی ذات کی حد تک اسی پر عمل پیرا ہوں۔

تبلیغی جماعت والوں کا یہ کام اچھا ہے کہ وہ گشت کے ذریعے لوگوں کو نماز کے لیے مسجد میں لاتے ہیں تو تنظیم اسلامی والوں کو چاہیے کہ وہ ان سے اس نیکی میں تعاون کریں۔ اور تنظیم اسلامی والوں کا یہ کام اچھا ہے کہ قرآن مجید کی درس وتدریس کا کام کرتے ہیں تو تبلیغ والوں کو چاہیے کہ انہیں اپنی مسجد میں درس کی اجازت دیں یا ان کے درس قرآن میں شریک ہوں۔

اور جماعت اسلامی اگر سیاست میں ہے تو بقیہ جماعتوں کے کارکنان کو چاہیے کہ

انہیں ووٹ دیں تاکہ پارلیمنٹ اور سینیٹ میں اسلام کی نمائندگی کرنے والے لوگ موجود ہوں۔ اور جماعۃ الدعوۃ اگر کشمیر کی آزادی کے لیے فکر مند ہے تو ہمیں اس سے اس بارے تعاون کرنا چاہیے کہ کم از کم کشمیر کی حد تک ہمارا عوامی اور ریاستی موقف ایک ہی ہے کہ کشمیر کو بھارت سے آزاد ہونا چاہیے۔

اور ان سب جماعتوں سے تعاون کی ایک اور صورت یہ بھی ہے کہ ان کے سالانہ اجتماعات میں شرکت کی جائے، اس طرح تحریک اسلامی کے کارکنان کو ایک دوسرے کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملے گا، نفرتیں کم ہوں گی، محبتیں بڑھیں گی، اور غلط فہمیاں دور ہوں گے۔ جزاکم اللہ خیرا!

بریلوی، دیوبندی، اہل حدیث، صوفی، سلفی اور تحریکی کی خدمت میں

میری نظر میں آپ سب دین کے طالب علم ہیں۔ اور دین کے طالب کے جوتے اٹھانا بھی ثواب ہے اور اسے جوتے مارنا بھی ثواب ہے۔ یہ تو مزاح کی بات ہوئی اور سنجیدہ بات یہ ہے کہ ہر کسی میں خیر کا پہلو بھی ہوتا ہے اور شر کا بھی۔ نہ تو کوئی سوفی صد درست ہے اور نہ ہی کوئی سوفی صد غلط۔ میری وال پر آپ کو اپنے مسلک اور جماعت کی تعریف بھی ملے گی اور اس پر تنقید بھی۔

اور مجھے یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ بہت مشکل کام ہے۔ ہر مسلک والے یہ چاہتے ہیں کہ ہماری تعریف ہی تعریف ہو، کوئی ہماری اصلاح نہ کرے۔ اور دوسرا مسلک یہ چاہتا ہے کہ ہمارے مخالف پر تنقید ہی تنقید ہو اور کوئی اس کی تعریف نہ کرے۔ لوگ کیا کرتے ہیں، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ میں جو کرتا ہوں، اس پر تنہائی میں غور بھی کرتا ہوں، اس لیے سوچ سمجھ کر کرتا ہوں اور اگر اپنا کیا غلط لگے تو اپنی اصلاح بھی کرتا رہتا ہوں۔ اگر آپ نے میرے مزاج کو سمجھنا ہے تو میری کتاب "صالح اور مصلح" کا مطالعہ کر لیں۔

فکر فراہی کے پانچ طبقات

① مولانا فراہی رحمہ اللہ عالم دین تھے اور اللہ سے ڈرنے والے تھے اگرچہ بعض

معاملات میں اہل علم کو ان سے اختلاف ہوا۔ یہ پہلا طبقہ ہوا۔

٢. مولانا فراہی کے شاگردوں میں نمایاں ترین مولانا اصلاحی بھی عالم دین تھے اور اللہ سے ڈرنے والے تھے اگرچہ بعض معاملات میں اہل علم کو ان سے اختلاف ہوا اور وہ اہل علم سے رد عمل میں آ کر ان کے خلاف ہو گئے۔ یہ دوسرا طبقہ ہوا۔

٣. مولانا اصلاحی کے شاگردوں میں کوئی بھی عالم دین نہیں ہے، البتہ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ ان میں سب سے قابل جاوید احمد غامدی صاحب ہیں۔ وہ اچھے مفکر ہیں، ذہین ہیں اور محنتی ہیں۔ علوم دینیہ کا عمومی مطالعہ نظر آتا ہے لیکن علوم الاصول، اصول فقہ، اصول حدیث، اصول تفسیر، اصول عقیدہ کی گہرائیاں اور وسعتیں، وہ ان میں دلچسپی نہیں رکھتے۔ شاید ان کے ہاں یہ واقفیت ضروری بھی نہیں ہے۔ یہ تیسرا طبقہ ہوا۔

٤. جناب جاوید احمد غامدی صاحب کے شاگردوں میں عمار خان ناصر صاحب عالم دین ہیں اور ان کی تحریروں سے نظر آتا ہے۔ لیکن اس کی وجہ غامدی صاحب نہیں، ان کا علمی گھرانہ اور مدرسہ ہے۔ جاوید صاحب کے باقی شاگرد اچھے کالم نویس ہیں، بس۔ یہ چوتھا طبقہ ہوا۔

٥. اور پانچواں طبقہ وہ ہے، جو بدقسمتی سے ہر مسلک اور جماعت میں پایا جاتا ہے۔ جنہیں جیالوں کے عنوان سے یاد کیا جا سکتا ہے۔ اور سوشل میڈیا اور فیس بک وغیرہ پر آج کل انہی کی بھرمار ہے۔

مکتب غامدی اور بھولے بادشاہ

ہمارے ممدوح ڈاکٹر عرفان شہزاد صاحب غامدی صاحب کی فکر کے حق میں لکھتے رہے، لوگوں نے توجہ ہی نہ دی۔ بس اتنا ہوتا تھا کہ واکنگ کسٹمر کی طرح کوئی چلتا پھرتا فیس بکیا ڈاکٹر صاحب کی وال پر آ نکلتا تو لائک مار کر آگے نکل جاتا تھا اور رہا سنجیدہ فیس بکیا تو وال پر لگے فوٹو دیکھ کر ہی اتنا گھبرا جاتا کہ لائک مارنا تو دور کی بات، پیج کو اس تیزی سے

یوں اسکرول کرنے لگ جاتا کہ جیسے کسی گناہ سے بھاگنے کی کوشش کر رہا ہو۔

پھر نہ معلوم محترم ڈاکٹر صاحب کو کیا سوجھی کہ انہوں نے بریلویوں کے خلاف پوسٹ لگا دی۔ اب دیوبندیوں اور اہلحدیثوں نے سمجھا کہ ڈاکٹر صاحب راہ راست پر آ گئے ہیں کہ ان کے نزدیک راہ راست بریلویت کے رد کا ہی دوسرا نام ہے، بس پھر کیا تھا، نہ صرف لائکس کی تعداد بڑھ گئی بلکہ روایت پسند بھی ڈاکٹر صاحب کی وال پر یوں جمع ہونے لگے جیسے پروانے شمع کے گرد۔

پھر ڈاکٹر صاحب کو معلوم نہیں کیا سوجھی کہ تبلیغیوں کے خلاف قسط وار سلسلہ شروع کر دیا۔ اب بھی بہت سے روایت پسندوں نے لائک مارے کہ جنہیں تبلیغی جماعت سے شکایات تھیں۔ پھر اہل حدیثوں کی باری لگے گی تو پھر وہ روایت پسند جم کر لائک ماریں گے کہ جنہیں ان سے شکایات ہیں۔ اسی لیے میں ان روایت پسندوں کو "بھولے بادشاہ" کہتا ہوں۔ انہیں یہ سمجھ نہیں آتی کہ بریلوی، دیوبندی اور اہل حدیث اگر غلط ہے تو اس کا کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب ہے، غامدی صاحب ٹھیک ہیں۔

غامدی صاحب ٹھیک ہیں، یہ بات کہنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک طریق کار ناکام ہو چکا کہ بریلوی، دیوبندی اور اہل حدیث سب ہی غامدی صاحب کو غلط کہہ رہے ہیں تو کون مانے گا کہ وہ ٹھیک ہیں۔ اور ایک طریق کار اب بھی کامیاب ہے اور وہ یہ کہ سب کو غلط ثابت کر دو تو نتیجہ خود نکل آئے گا۔ یہ بھولے بادشاہ کبھی کبھار ہم سے بھی پوچھتے ہیں کہ پی ایچ ڈی کا کیا فائدہ ہے، بھئی یہی فائدہ ہے۔ بھئی، آپ کو اگر روایت پسندوں کی اصلاح چاہیے تو اس کے لیے زاہد صدیق مغل صاحب، مفتی زاہد صاحب اور حافظ زبیر کافی ہیں۔ یہ ان شاء اللہ سے اپنے مسلک اور روایت کی بھی اصلاح کرتے ہیں اور دوسرے کے بھی۔

باقی یہ کوئی دلیل نہیں ہے کہ میں تو لائک، بات اور پوسٹ کو کرتا ہوں۔ میں تو ہمیشہ لائک فکر اور سوچ کو کرتا ہوں۔ جس کی مجموعی فکر اور سوچ اچھی ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ وہ روایت پسند ہے تو میں اسے لائک کروں گا۔ ہاں، اگر ہمارے فریق

مخالف ماڈرنسٹ کی کوئی بات ایسی ہے جو ہماری فکر کے مطابق ہے یعنی روایت پسندی کو اسپورٹ کرتی ہے تو ہم اس بات کو لائک کریں گے۔ ہم فکری لوگ ہیں اور فکر کی بنیاد پر تقسیم ہیں اور فکر ہی کی بنیاد پر اچھا برا ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ کیا ہم اتنے بانجھ ہو چکے ہیں کہ ان ماڈرنسٹوں سے اپنی اصلاح لیں گے؟

مغرب زدہ

مسلم معاشروں میں دو قسم کے طبقات مغرب زدہ ہیں؛ ایک وہ جو مغرب کو پڑھ کر اس سے متاثر ہو گئے اور دوسرے وہ جو مغرب کو پڑھ کر رد عمل کی نفسیات (psychology of reaction) کا شکار ہو گئے۔ یہ دوسرا طبقہ اگرچہ مغرب کا شدید ناقد ہے لیکن مغرب نے ان پر پہلے طبقے سے زیادہ گہرا اثر چھوڑا ہے۔ یہ اثر نیوٹن کے تیسرے قانون کے عین مطابق ہے کہ ہر عمل کا ایک رد عمل ہوتا ہے جو قوت میں برابر لیکن سمت میں مخالف ہوتا ہے۔

مغرب کے فکری اثر سے اگر کوئی طبقہ کسی قدر محفوظ ہے تو وہ، وہ طبقہ ہے جسے مغرب کو پڑھنے کی نعمت میسر نہیں ہے یا آسان الفاظ میں جنہیں اتنی انگریزی نہیں آتی کہ وہ مغرب کو پڑھ سکے اور اس پڑھنے کے نتیجے میں اس سے متاثر ہونے کے اسباب اور رستے ہی پیدا کر سکے۔

پس سائنس اور ٹیکنالوجی کے بارے میں اگر کوئی معتدل رائے سامنے آسکتی ہے تو اس کی امید روایتی علماء کے طبقے سے کی جاسکتی ہے۔ اور ان سب کا اس پر تقریباً اتفاق ہے کہ ٹیکنالوجی ویلیو نیوٹرل ہے، بھلے انہوں نے ان الفاظ کو استعمال نہ کیا ہو یا وہ ویلیو نیوٹرل کی اصطلاح کو نہ جانتے ہوں لیکن ان کے فتاوی کا خلاصہ یہی ہے، جمع کر کے دیکھ لو۔

ٹیکنالوجی کے بارے میں جو رائے "انصاری" مکتب فکر نے پھیلا اور عام کر دی ہے، وہ نہ تو سو فی صد درست ہے اور نہ ہی سو فی صد غلط ہے۔ لیکن انہوں نے اللہ کے فضل و کرم سے نوجوان اسکالرز کی ایک ایسی جماعت ضرور پیدا کر دی ہے جو اسمارٹ فون جیب میں رکھ کر اس کی شناعت و مضرت پر ایسی عمدہ گفتگو کر سکتے ہیں کہ کسی دار العلوم کے

آخری درجہ کے طلباء تو کجا دارالافتاء کے مفتی بھی مسحور ہو جائیں۔

یہ اس ماڈرن سوسائٹی میں رہتے ہوئے ٹیکنالوجی کے استعمال نہ کرنے کے بارے ایک ایسے شاذ موقف پر ضد کر رہے ہیں کہ جس میں امت تو کجا ان کی اولاد کو بھی پناہ نہیں ملے گا۔ یہ دین ایسے موقف کا حامل کیسے ہو سکتا ہے کہ جس پر اربوں کی امت کی بجائے چار افراد کو لانا مشکل ہو جائے۔ فقہاء اور مفتی بھلے مغرب کو کچھ نہ جانتے ہوں، اور یہ ان کی خوبی ہے اور تمہاری خامی ہے، لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ کل کلاں کو تمہاری نسلیں بھی انہی کے بیانیے کی روشنی میں زندگی گزار رہی ہوں گی۔

جدید ٹیکنالوجی کے ضرر اور نقصانات سے انکار نہیں ہے لیکن اس کے بارے جو موقف آپ لوگ پیش کر رہے ہیں، وہ امت کو ایک فتنے سے نکال کر دوسرے فتنے میں ڈال دینے کے مترادف ہے۔ اور اس رہبانیت کے لیے صوفیانہ ڈسکورس سے کمک لینا مزید ایک حماقت ہے کہ وہ سب کا سب ضعیف اور موضوع روایات پر کھڑا ہے۔ امت اگر مجموعی حیثیت میں کسی ڈسکورس پر کھڑی ہو سکتی ہے تو وہ فقیہانہ اور قانونی ہے نہ کہ صوفیانہ اور اخلاقی۔ صوفیانہ اور اخلاقی ڈسکورس کوئی علمی پوزیشن لینے کے لیے بنیاد بن ہی نہیں سکتا، البتہ اس سے کسی علمی پوزیشن میں استدلال لانے کے لیے ضرور مدد لی جانی چاہیے۔

یہ صوفیانہ ڈسکورس ہی کے فضائل و برکات ہیں کہ آج اکثر کو صحیح بخاری کی اس مستند ترین روایت کا علم نہیں ہے کہ بڑے گھر اور کھلے مکان کو رسول اللہ ﷺ نے ایک نعمت اور فضل قرار دیا لیکن یہ ضعیف روایت سب کو حفظ ہے کہ آپ ﷺ نے ایک صحابی کے "چوبارہ" بنانے کو اتنا ناپسند فرمایا کہ انہوں نے اسے گرا دیا تھا۔ ایک اور اعتبار سے بھی عرض کر دوں کہ یہ امت اپنی اجتماعی حیثیت میں گناہ گار ہے، لہذا اسے چلانے کے لیے گناہ گار مفتی زیادہ کار آمد ہیں، بنسبت متقی صوفیوں کے۔ مزید تفصیل اگر اللہ نے چاہا تو کسی مستقل تحریر میں عرض کر دوں گا۔

اسلام اور ٹیکنالوجی

ٹیکنالوجی کے مضر اثرات سے انکار نہیں ہے لیکن ٹیکنالوجی کو معاشرے کے لیے زہر ثابت کرنے کے لیے جس طرح کا استدلال کیا جا رہا ہے، وہ بھی ایک لطیفے سے کم نہیں ہے۔ ذرہ سا غور کریں تو ٹیکنالوجی پر کی جانے والی اس معاصر نقد کا حکیمانہ پن، بازاری پن محسوس ہونے لگتا ہے۔

"انصاری" مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے ایک فاضل بزرگ نے ٹیکنالوجی کے رد میں یہ مثال بیان فرمائی کہ بائیک کو ہی دیکھ لو۔ جس طرح بائیک پر دو افراد بیٹھے ہوتے ہیں یعنی آگے پیچھے، اگر یہ بائیک کے بغیر اس حالت میں بیٹھے ہوں تو تمہارے ذہن میں کیا خیال آئے گا؟ تو بھئی برا ہی خیال آئے گا، اچھا خیال کیا آئے گا۔ تو یہ ہے ماڈرن سواری کی نحوست! اب بھی افسوس ہوتا ہے ان علماء پر جو ٹیکنالوجی کو "ویلیو نیوٹرل" سمجھتے ہیں۔ پھر اس مکتب فکر سے وابستگاں کا خود کون سا ایک منہج پر اتفاق ہے۔ ڈاکٹر زاہد صدیق مغل صاحب تو فیس بک پر گاہے بگاہے اس اختلاف کا تذکرہ کرتے ہی رہتے ہیں، ڈاکٹر محمد علی جنید صاحب نے بھی "فلسفہ مغرب کی تفہیم جدید" کی تقریظ میں اس مکتب فکر کی متنوع شاخوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔[1]

یہ مثال سن کر میں اس سوچ میں پڑ گیا کہ "اسلامی سواری" اونٹ پر جب رسول اللہ ﷺ کے دور میں دو لوگ بیٹھتے تھے تو کیسے بیٹھتے تھے؟ اب بتلائیں کیا آپ کی اسلامی سواری "ویلیو نیوٹرل" ہے۔ بھئی، ٹیکنالوجی پر ضرور تنقید کریں، اس تنقید میں ہم بھی آپ کے ساتھ ہیں، بس مبالغہ تھوڑا کم کر لیں۔ ہم بحثیت مسلمان جن المیوں سے دوچار ہیں تو ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہمارے زاویہ ہائے نگاہ یعنی چیزوں کو دیکھنے کے

---

[1] ایک منفی رویہ جو اس مکتب فکر سے وابستہ بعض حضرات میں بھی ہے اور باسط بلال کوشل صاحب کے مریدوں میں تو بہت زیادہ دیکھا گیا ہے کہ لوگوں کی تحقیر اور تذلیل کہ آپ نے پڑھا کیا ہے؟ یا آپ کو پتہ کیا ہے؟ آپ نے فلاں کو پڑھا ہے؟ آپ نے فلاں کتاب دیکھی ہے؟ کبھی کبھی تو دل کرتا ہے کہ ان دونوں مکاتب فکر کے ان ریسلرز کو میز پر آمنے سامنے بٹھا دیا جائے تا کہ بقیہ جہلاء کے علم میں اضافہ ہو سکے کہ ان میں سے زیادہ "پڑھاکو" کون ہے۔

اینگلز خراب ہو چکے ہیں،اس بات کو ایک مثال سے سمجھیں۔

ایک اسٹوڈنٹ نے کہا کہ سر! دیکھیں کہ "کوکا کولا" کی بوتل کو الٹا کریں تو جو انگریزی میں "کوکا کولا" کے الفاظ لکھے ہیں، یہ "لا مکه لا محمد" بن جاتا ہے۔ تو بھئی، سوال یہ ہے کہ تمہیں کہا کس نے ہے کہ تم اسے الٹا دیکھو۔ بنانے والے نے اسے سیدھا بنایا ہے، بس سیدھی طرح دیکھو۔ ہمیں ہر چیز کو الٹا دیکھنے کی عادت ہی کیوں پڑ گئی ہے؟ الٹا دیکھنے سے تو کچھ بھی کچھ بن جائے گا۔

قرآن مجید ہی کے حروف کو ذرہ الٹا کر کے دیکھ لو تو نتیجہ معلوم ہو جائے گا۔ اور تمہیں یہ بھی بتلاتا چلوں کہ بد ترین جادو قرآن مجید کے حروف کو الٹا کرنے سے ہی پیدا کیا جاتا ہے۔ یقین نہ آئے تو کسی اچھے جادو گر سے پوچھ لو۔ ٹیکنالوجی پر رد سے انکار نہیں ہے لیکن اعتدال کی بہت ضرورت ہے کہ بہت زیادہ مبالغہ آرائی سے بات بگڑتی چلی جا رہی ہے۔

کیا فیس بک آلہ تبلیغ ہے؟

جدید ذرائع اور وسائل (modern techniques and tools of communications) کو تبلیغ کا ذریعہ بنانے کے بارے ہمیشہ اختلاف رہا ہے۔ امت کی اکثریت اس کی قائل رہی ہے کہ جدید ذرائع ابلاغ کو دعوتی اور تبلیغی سرگرمیوں کے لیے استعمال کیا جائے جبکہ امت کا ایک طبقہ ہر دور میں کسی نہ کسی پہلو سے اس رویے پر تنقید کرتا رہا ہے۔ یہ بحث لاؤڈ اسپیکر سے شروع ہوئی، پھر تصویر، کیمرہ، ٹیلی ویژن سے ہوتی ہوئی فیس بک تک بھی پہنچ چکی ہے۔

"انصاری" مکتب فکر کی سوچ کا خلاصہ یہ ہے کہ چونکہ یہ ذرائع ابلاغ مغربی فکر وفلسفہ کی پیداوار ہیں لہذا ان سے کسی بھی قسم کی خیر کی توقع رکھنا عبث اور بے کار ہے، یہ شر محض ہیں۔ ہمیں اس بحث میں ابھی نہیں جانا کہ یہ ذرائع ابلاغ مغربی فکر وفلسفہ کی پیداوار ہیں یا انسانی جبلتوں اور ضرورتوں کے تقاضوں کے نتائج تھے۔ ہمیں اس وقت صرف ان وسائل ابلاغ کے ذرائع تبلیغ ہونے کے امکانات پر بحث کرنی ہے۔

دیکھیں، ہمیں اس سے انکار نہیں ہے کہ فیس بک کے استعمال کے بہت نقصانات ہیں اور جو لوگ ہماری ٹائم لائن کو روزانہ وزٹ کرتے ہیں تو انہیں اس بارے کچھ نہ کچھ پڑھنے کو ملتا ہی رہتا ہے۔ لیکن یہی تمام نقصانات علماء ٹیلی ویژن میں بھی گنواتے رہے اور اس سے بہت پہلے لاؤڈ اسپیکر میں بھی۔ بھئی، سادہ سی بات ہے کہ لاؤڈ اسپیکر لگا کر آپ پورے محلے میں اپنی تقریر کی آواز کیوں پہنچانا چاہتے ہیں؟ یہ ریاکاری نہ بھی ہو تو اس کی بنیاد تو اس کے استعمال سے پڑ ہی جاتی ہے۔

علماء کی اکثریت کا ہمیشہ سے یہ موقف رہا ہے کہ جدید ٹیکنالوجی میں استعمال ہونے والے ذرائع ابلاغ "ویلیو نیوٹرل" ہیں۔ "ویلیو نیوٹرل" کا آسان سا مطلب یہ ہے کہ آپ اس کو مثبت استعمال کر لیں تو اس میں خیر ہے اور منفی استعمال کر لیں تو اس میں شر ہے۔ اب یہاں ایک لایعنی بحث یہ چھیڑ دی جاتی ہے کہ یہ ذرائع ابلاغ "ویلیو نیوٹرل" کیسے ہو سکتے ہیں جبکہ ان کے بنانے والوں کے مقاصد منفی تھے؟ تو بھئی جس نے "تلوار" بنائی تھی تو کیا اس کا مقصد بہت نیک تھا؟ ظاہری بات ہے کہ قتل کرنے کے لیے ہی بنائی تھی۔ آپ نے اس کا استعمال مثبت کر لیا تو ٹھیک ہے۔

پھر ایک بحث یہ کی جاتی ہے کہ اگر کسی چیز کا غالب استعمال شر کے لیے ہو جائے تو اسے خیر کے لیے استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ تو کلاشنکوف اور مشین گن سے لے کر میزائل اور جنگی جہازوں تک بلکہ تمام آلات جنگ وجدال کا غالب استعمال دنیا میں شر کے لیے ہو رہا ہے یا خیر کے لیے؟ تو سب کو آگ لگا دیں کیا؟ مجھے "انصاری" مکتب فکر کی کچھ باتوں سے اتفاق ہے کہ تنقید ہمیشہ سو فی صد غلط نہیں ہوتی لیکن مجھے جس بات پر غصہ آتا ہے، وہ یہ کہ اس مکتب فکر نے بہت ہی سطحی ذہن اور ردی دلیلوں کے ساتھ ٹیکنالوجی کے رد میں ایک موقف اپنانے اور پھیلانے کا فریضہ اپنے سر اٹھا رکھا ہے۔ چلیں، یہ اپنا موقف ایک رائے کے طور بیان کرتے رہتے تو بھی غنیمت تھی لیکن اب تو اپنی رائے میں قطعیت اس قدر غالب ہے کہ انہیں فریق مخالف باقاعدہ گناہ گار نظر آنے لگا ہے۔

پھر یہ ہے کہ تبلیغ صرف خیر کو پھیلانے کا نام نہیں ہے بلکہ شر کی روک تھام بھی تبلیغ میں شامل ہے۔ تو تبلیغ کی ایک صورت تو یہ ہے کہ آپ لوگوں کو دین پر لائیں اور دوسری صورت یہ ہے کہ آپ لوگوں کو دین سے دور جانے سے روکیں۔ پہلی صورت میں آپ لوگوں کو مسلمان کریں گے اور دوسری صورت میں الحاد اور فتنوں کی طرف جانے سے روکنے کا سبب بن جائیں گے۔ دوسری قسم کی تبلیغ ان جدید ذرائع ابلاغ کے ذریعہ ہی سے ممکن ہے۔ ایک شخص فیس بک پر بیٹھ کر الحاد کے فتنے کا شکار ہوا اور ہم اسے مسجد میں بیٹھ کر اس فتنے سے بچانا چاہتے ہیں؟

تو چلیں ٹیلی ویژن کو اس معنی میں آلہ تبلیغ نہ بھی مانیں کہ اس سے کوئی خیر پھیلے گا، اگرچہ بہت خیر پھیلتا ہے، لیکن اس معنی میں ٹیلی ویژن کو آلہ تبلیغ مانے بغیر چارہ نہیں ہے کہ اسے شر کا مقابلہ کر کے اس کے اثر کو کم کرنے کے لیے ایک ذریعے کے طور استعمال کر لیا جائے۔ ڈاکٹر ذاکر نائیک، ڈاکٹر اسرار احمد، مولانا طارق جمیل صاحب وغیرہ کے ویڈیو بیانات سے خیر کے پھیلنے کا انکار کوئی ایسا شخص ہی کرے گا جو ضدی اور ہٹ دھرم ہو۔

باقی یہ بات درست ہے کہ لاؤڈ اسپیکر پر کھڑے جاہل مولوی، چینل پر آنے والے اکثر مداری اور فیس بک کے اکثر لکھاری ان ذرائع ابلاغ کے ذریعے دین کے نام پر خیر سے زیادہ شر پھیلا رہے ہیں، اپنے نفس میں بھی اور ارد گرد کے ماحول میں بھی۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ ان تمام ذرائع ابلاغ کو شر محض ہی قرار دے دیا جائے اور یہ دعوی کیا جائے کہ تبلیغ کا ایک ہی طریقہ مسنون ہے کہ ذاتی ملاقات کی جائے تو پھر ہی کوئی اثر ہو گا۔ جن لوگوں کو فیس بک کے استعمال سے کوئی خیر پہنچا ہو تو وہ ضرور کمنٹس میں اپنی رائے کا اظہار کریں۔

باقی میں فیس بک کے مفاسد کا انکار نہیں کرتا، لیکن یہ مفاسد کہاں نہیں ہیں، مصلے پر بیٹھ جاؤ گے تو وہاں بھی ہیں، یہی وجہ ہے کہ تبلیغ والے جب مسجد سے گشت کے لیے نکلتے ہیں تو ان مفاسد سے بچنے کے لیے ہدایات جاری کرتے ہیں کہ بد نظری نہیں کرنی،

دعوت دیتے وقت اگر کوئی الجھے تو اس سے بحث مباحثہ نہیں کرنا، صرف ایک بھائی نے گفتگو کرنی ہے وغیرہ وغیرہ۔ تو مفاسد تو لائیو میں بھی ہیں لہذا اصل چیز تربیت ہے۔ بس لوگوں کی تربیت کریں کہ وہ ان ذرائع کے استعمال میں ان کے نقصانات سے بچ سکیں۔

مثلاً یہ کہ کبھی دو چار دن کے لیے فیس بک چھوڑ دیں اور یہ بہت ضروری ہے بلکہ فرض ہے۔ کبھی کوئی پوسٹ شیئر کر کے اب اگلے دن ہی اس کو دیکھیں، کبھی دو دن تک نوٹیفکیشن نہ دیکھیں، کبھی ایک دو دن انباکس میسنجر نہ دیکھیں، کبھی ایک دو دن لائکس اور شیئرز کی طرف توجہ نہ دیں جو آپ کی پوسٹ کو ملیں اور یہ کام وقفے وقفے سے کرتے رہیں گے تو ہی اس کے نقصانات سے بچ پائیں گے۔ اور کبھی دو نفل اس مقصد سے پڑھ لیں کہ اللہ عزوجل اس کے نقصانات سے بچائے، وغیرہ وغیرہ

دینی صحافت کا ایک بہترین مجلہ

"معارف فیچر" ایک پندرہ روزہ مجلہ ہے جو کہ اسلامک ریسرچ اکیڈمی، کراچی کے تحت شائع ہوتا ہے۔ دینی صحافت سے متعلق چھوٹے بڑے بہت سے اخبارات، رسائل اور جرائد نظر سے گزرتے رہتے ہیں اور عموماً یہ شکایت پائی جاتی ہے کہ مذہبی اور دینی طبقات کی صحافیانہ تحریروں کا معیار پیشہ ورانہ معیارات سے پست ہوتا ہے۔

لیکن مجھے معارف فیچر نے کبھی بھی یہ احساس پیدا نہیں ہونے دیا۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی ہے کہ معارف فیچر کا تخصص یہ بھی ہے کہ وہ مغربی صحافت میں سے اس لٹریچر کو اردو میں ترجمہ کر کے شائع کرتے رہتے ہیں کہ جس سے اسلامی معاشروں اور اسلامی تحریکوں کو تقویت اور اسپورٹ حاصل ہوتی ہو۔ اور مغرب کا سوچ اور تحقیق کا معیار ہم سے بہت بلند ہے، اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ بہر حال معارف فیچر کی ویب سائیٹ کا لنک نیچے شیئر کر رہا ہوں۔

معارف فیچر کے تازہ شمارے میں معروف امریکی دانشور "نوم چومسکی" کے حالیہ انٹرویو کا ترجمہ شائع ہوا ہے کہ جس میں انہوں نے نو منتخب امریکی صدر ٹرمپ کے بعد وجود میں آنے والے نئے امریکہ، یورپ اور نئی دنیا کی تصویر کشی کی ہے۔ دینی مدارس

کے وہ طلبہ جو صحافت کے میدان میں کچھ دینی کام کرنا چاہتے ہیں تو انہیں اس پندرہ روزہ مجلے کے مطالعے کو اپنے لیے فرض سمجھ لینا چاہیے۔ اگر آپ اپنا فکری لیول بڑھانا چاہتے ہیں یا اپنی سوچ کو عالمی کرنا چاہتے ہیں تو اس مجلے کا معیار بہت اچھا ہے۔ اسے سبسکرائب کر لیں۔[1]

درود ابراہیمی: امت کے حق میں بہترین دعا

دوست کا سوال ہے کہ امت مسلمہ آج کل جن مشکلات، آزمائشوں اور حادثات سے دوچار ہے تو دل کرتا ہے کہ انسان ہر وقت اس امت کے حق میں دعا گو رہے لیکن بہت سوچ بچار کی کہ کوئی ایسی دعا مل جائے جو مسنون بھی ہو اور اس کا موضوع امت مسلمہ ہو لیکن تلاش بسیار کے باوجود کوئی ایسی دعا نہ مل سکی، نہ قرآن مجید میں اور نہ ہی سنت میں۔ آپ کسی ایسی دعا کی طرف رہنمائی فرمادیں کہ جو امت کے حق میں ہو کہ میں اسے اپنی صبح وشام کا ذکر بنانا چاہتا ہوں تاکہ دردِ دل کو کچھ سکون ملے۔ کرنے کو تو انسان اپنے الفاظ میں بھی دعا کر سکتا ہے لیکن مسنون الفاظ سے قلب کو تسکین زیادہ ملتی ہے۔

اس امت کے حق میں رسول اللہ ﷺ سے ایک بہت ہی بہترین دعا منقول ہے۔ اور ان شاءاللہ، ایسی دعا ہے کہ اگر اس کو ذکر بنالیں گے تو نہ صرف بے چین اور مضطر دل کو قرار آجائے گا بلکہ رسول اللہ ﷺ سے ایک نسبت بھی حاصل ہو جائے گی۔ میرے علم میں امت کے حق میں اس سے بہتر کوئی دعا موجود نہیں ہے۔ اور یہ دعا درود ابراہیمی ہے۔ صحیح تر قول کے مطابق اس درود میں "آل محمد" سے مراد امت مسلمہ ہے۔

پس اس درود میں محمد ﷺ پر رحمتیں اور برکتیں نازل کرنے کی دعا کی گئی ہے اور ساتھ ہی آل محمد ﷺ پر بھی رحمتیں اور برکتیں نازل کرنے کی دعا ہے۔ پس اس دعا کے پہلے حصے کی قبولیت تو یقینی ہے اور اس کی برکت سے دوسرے حصے کی قبولیت بھی یقینی ہے، ان شاءاللہ۔ اور اس دعا کے نتیجے میں خود دعا کرنے والے امتی پر رحمتوں اور برکتوں

---

[1] http://irak.pk/an-interview-with-noam-chomsky/

کے نزول کی بھی حدیث میں بشارت ہے۔

بس امت کے لیے دعا کرنی ہے تو درود ابراہیمی کو اپنا ورد بنا لیں کہ دعا کا مسنون طریقہ بھی یہی ہے کہ اس میں اللہ کی حمد و ثنا بھی ہو اور رسول اللہ ﷺ پر درود بھی ہو اور اس دعا میں یہ سب بھی موجود ہے

اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ، وَعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ، كَمَا صَلَّيْتَ عَلَى إِبْرَاهِيمَ وَعَلَى آلِ إِبْرَاهِيمَ، إِنَّكَ حَمِيدٌ مَجِيدٌ، اللَّهُمَّ بَارِكْ عَلَى مُحَمَّدٍ، وَعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ، كَمَا بَارَكْتَ عَلَى إِبْرَاهِيمَ، وَعَلَى آلِ إِبْرَاهِيمَ، إِنَّكَ حَمِيدٌ مَجِيدٌ۔

باب شانزدھم

طنز و مزاح

اس باب میں طنز و مزاح سے متعلق بنیادی سوالات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

مثبت اور منفی ذہن

صبح اپنے گھر کے تالے کی چابی غلطی سے آفس کے دروازے میں لگادی تو تالا فورا کھل گیا، دوبارہ اور تیسری مرتبہ کا تجربہ بھی کامیاب رہا۔اب منفی ذہن تنقید کرے گا کہ پاکستان میں تالے معیاری نہیں ہیں بلکہ کچھ بھی معیاری نہیں ہے۔ جبکہ مثبت ذہن یہ سوچے گا کہ پاکستان میں چابیاں کتنی اعلی کوالٹی کی تیار ہوتی ہیں۔ ہر وقت منفی نہ سوچا کریں، کبھی مثبت بھی سوچ لیا کریں، یہ کرپٹ معاشرہ آپ کو نیک لگنے لگے گا۔

معلوم نہیں کیوں میرے ذہن میں اس وقت پانی کے آدھے بھرے ہوئے گلاس کی مثال آرہی ہے۔اب بتائیں کرپٹ معاشرے میں منفی سوچنا صحیح ہے یا مثبت؟

فراغت کا فتنہ

نوجوان کا کہنا ہے کہ جوان ہوں، اور اوپر سے فراغت بھی ہے، فرصت کے لمحات اچھے گزارنے کے لیے یا غلط غم کے لیے انٹرنیٹ پر بیٹھتا ہوں، تو معلوم نہیں کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہوں۔ کچھ رہنمائی فرمائیں کہ انٹرنیٹ پر وقت اچھا گزر جائے اور با مقصد بھی ہو جائے اور کوئی وعظ بھی نہ سننا پڑے۔

جواب: بھئی، پاک رشتہ جیسی ویب سائیٹ آپ ہی کے لیے بنائی گئی ہیں۔ شادی شدہ ہیں یا غیر شادی شدہ، انٹرنیٹ پر اگر اس طرح وقت گزارنا چاہتے ہیں کہ وقت بامقصد بھی بن جائے اور گناہ بھی نہ ہو اور دل ودماغ کی دلچسپی بھی برقرار رہے، تو یہ سب کچھ کا ایک ہی پیکج ہے، اور وہ رشتے کروانے والی سائیٹیں ہیں۔

فراغت کا بہترین حل شادی ہے۔ایک کے بعد بھی فارغ ہیں تو پھر دوسری کر لیں۔ اس سے زیادہ پروڈکٹو کام کوئی نہیں ہے۔

خواتین اور چوہے

کیا ساری دنیا کی خواتین چوہوں سے ڈرتی ہیں؟ اگر واقعی میں ایسا ہے تو اس بات میں غور کرنے والوں کے لیے بہت کچھ موجود ہے، مثلاً یہی کہ ڈراتے انہیں چوہے ہیں اور

اپنا حریف مردوں کو ثابت کرنے پر تلی ہیں، حقوق نسواں (women rights) والی بہنیں مخاطب ہیں!

اپنے اصل دشمن کو پہچانو کہ جسے دیکھتے ہی تمہاری چیخیں نکل جاتی ہیں۔ تمہیں غلط رستے پر لگا دیا گیا، تمہیں تو "ماؤس کلرز" بننا تھا۔ اگر نہیں بن سکتی تو بھی کوئی بات نہیں لیکن یہ ضرور یاد رکھو کہ مرد اس پوسٹ کے لیے بہترین کنڈیڈیٹ ہے، اسے اپنا دشمن سمجھنے کی غلط فہمی سے باہر نکلو اور پدرانہ نظام (patriarchy) کی بجائے چوہوں کے خلاف جدوجہد کو اپنا ہدف اول بناؤ۔

نوٹ: پدرانہ نظام (patriarchy) سے مراد وہ سوسائٹی ہے کہ جہاں مرد گھر کا بڑا سمجھا جاتا ہے۔ حقوق نسواں کی عالمی تحریک کا ایک بنیادی مقصد ایسے معاشروں کا احیاء بھی ہے کہ جہاں گھر میں مرد کی بڑائی ختم ہو جائے لیکن بی بیو! اس کے لیے پہلے چوہے مارنے کی ہمت پیدا کرنی ہو گی ورنہ تو مرد کی بڑائی تسلیم شدہ رہے گی۔

کیا جنت میں حوریں ملیں گے؟

دوست کا سوال ہے کہ کیا جنت میں ہمیں حوریں ملیں گی؟ میں نے کہا کہ خیریت ہے کہ حوروں کے ملنے میں کیا شبہ پیدا ہو گیا؟ کہنے لگے کہ قاری حنیف ڈار صاحب کہتے ہیں کہ جنت میں حوریں نہیں ملیں گی بلکہ یہی دنیا کی بیوی ہے کہ جسے قرآن وسنت میں حور کہا گیا ہے، اور یہی ملے گی، آپ ان کا رد کریں۔ میں نے کہا: حوروں کے انکار کی یہ سزا کیا کم ہے جو انہیں ملے گی، اب مزید بھی کسی رد کی ضرورت ہے کیا؟

بے ادب

جب بھی کسی بریلوی مسجد میں نماز پڑھتا ہوں تو اقامت شروع ہوتے ہی پہلی صف میں کھڑا ہو جاتا ہوں، لوگ مجھے گھورنا شروع کر دیتے ہیں اور میں اقامت کہنے والے کو۔ بھئی، گھورنے کا فائدہ نہیں ہے، اگر مجھے بٹھانا ہے تو پہلے اپنے اس بے ادب کو بھی بٹھاؤ۔

بیویاں

بیویاں، سب ایک جیسی ہوتی ہیں، بس تھوڑا سا فرق ہوتا ہے، رنگت کا۔ اب تو وہ بھی رنگ گورا کرنے والی کریموں کی برکت سے ختم ہوتا جا رہا ہے۔ سب کو ٹٹول کر دیکھ لیں، ایک ہی خواہش رکھتی ہیں کہ کسی طرح اپنے شوہر کی دوسری شادی کروا دیں، تاکہ اس کے دل میں ان کی قدر پیدا ہو، یا اس سے انتقام لے سکیں۔ ویسے یہ قدر کروانے اور انتقام لینے کا انوکھا طریقہ ہے جو ہر دوسری بیوی کو سوجھتا ہے۔ اور اب بھی ان کا خیال ہے کہ یہ بہت سمجھدار ہوتی ہیں، چلیں، ہوتی ہوں گی، ہمیں کیا۔

دوسری کے بعد پہلی کی قدر کا تو ہمیں علم نہیں، لیکن شوہر جب آفس جانے کے لیے گھر سے باہر نکلتا ہے تو آواز آتی ہے، اجی! آج کیا پکانا ہے؟ لڑائی کے بعد صلح کی کوشش کرتا ہے تو اصرار ہوتا ہے کہ آپ مانیں غلطی آپ کی تھی۔ ایک دوسرے کو سمجھنے سمجھانے کی بات آتی ہے تو ایک ہی جیسا وعظ سننے کو ملتا ہے کہ عورت کو اپنے شوہر سے محبت، عزت اور احترام چاہیے۔ کسی بات پر ناراضگی کا اظہار کرنا ہو تو بھی جملے ایک جیسے ہی ہیں، ہاں! ہاں! دوسری لے آئیں، تو آپ کو میری قدر آئے گی بلکہ میں تو سوچ رہی ہوں کہ آپ کی ایک اور شادی کروا ہی دوں۔

آج صبح صبح "ازدوجیات" کے نام سے ایک گروپ دیکھنے کا اتفاق ملا کہ کسی نے مجھے بھی اس میں "غلطی" سے ایڈ کر دیا تھا۔ اس گروپ کا مقصد شاید دوسری شادی کے بارے "شوہروں اور بیویوں" کے احساسات و جذبات کی ترجمانی کرنا ہے۔ بہر حال مقصد جو بھی ہو، آج کی پوسٹ کی یہ دو چار سطریں دوسری شادی کے خواہش مند ان "لڑکوں اور لڑکیوں" کے نام جو ایک شادی کرنے کے بعد بھی اپنی سوچوں اور احساسات میں "کنوارے" ہی ہیں۔

یہ بات تو مزاح میں ہوئی اور سنجیدہ بات یہ ہے کہ اگر پہلی کو دل سے مصیبت سمجھتے ہو تو دوسری بھی مصیبت ہی ہو گی، وہ اسی کا ورژن ہے، اپ ڈیٹڈ بھی نہیں بلکہ سیم ٹو سیم۔ اور اگر پہلی کو رحمت سمجھتے ہو تو پھر یہ اللہ کی رحمت ہے بھئی، جتنی مرضی سمیٹ

لو۔ تو مسئلہ تمہاری سوچ کا ہے، پہلی سے بھاگ کر شادی کرنے کا سوچنا بھی نہ کہ اس سے سکون نہیں ملا تو دوسری سے مل جائے گا۔

دوسری شادی کا اس وقت تک سوچیں بھی نہ جب تک کہ اس کی اہلیت نہ ہو۔ چلیں، آج آپ کو بتلا ہی دوں کہ دوسری شادی کی بنیادی اہلیت کیا ہے؟ کسی دن پہلی والی سے یہ سوال کر لیں کہ کیا آپ ایک اچھے سامع (listener) ہیں؟ اگر ہاں میں جواب آئے تو مبارک ہو، آپ دوسری شادی کے اہل ہیں۔ اور اگر ناں میں جواب آئے تو بھئی، پہلی ہی نہیں سنبھالی جا رہی تو دوسری کے خواب دیکھنا چھوڑ دو۔ بس، دوسری سے پہلے اتنا ضرور سوچ لیں کہ وہ ساری ریکارڈنگز جن کا اوپر تذکرہ کیا گیا ہے، دن میں دو مرتبہ سننی پڑے گی تو اس کے لیے اچھا سامع ہونا بنیادی اہلیت ہوا یا نہیں؟

ہاش پاپیز اور باٹا

سالہا سال کے تجربات کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ باٹا کے جوتے نہ صرف ڈیزائن میں گھٹیا ہیں بلکہ معیار میں بھی کم تر ہیں۔ نہ ہی اسٹائل میں کوئی خوبصورتی ہے اور نہ ہی پائیداری نام کی کوئی چیز ہے اور قیمتیں دیکھو تو یوں جیسے سونا خرید رہے ہو۔ بھائی، باٹا سے خوبصورت جوتا تو تمہارے گاؤں کا موچی بنا لے گا بلکہ پائیدار بھی اس سے زیادہ ہی ہو گا، ان شاء اللہ۔ اب باٹا صرف ایک کام کے لیے رہ گیا ہے کہ بچوں کے اسکول شوز اس سے جا کر خرید لو۔ اب اتنی بھی کیا تقلید کہ ہر صورت باٹا ہی لینا ہے، ایسے جیسے "اسی تے ہنڈا ہی لینا اے"۔

اور اگر برینڈڈ جوتا ہی خریدنا ہو تو مشورتاً عرض ہے کہ "ہاش پاپیز" بہتر ہے۔ اور اس مشورے کے بعد بھی اگر آپ کو باٹا کے جوتے اچھے لگتے ہیں تو ضرور آپ کی حس جمال (aesthetic sense) متاثر ہے۔ اور اسے بیدار کرنے کا ایک ہی نسخہ ہے کہ دعا کریں اللہ عزوجل آپ کو کوئی پہننے اوڑھنے میں باذوق اور سلیقہ مند بیوی نصیب فرما دے تو ان شاءاللہ، اس کی صحبت کے اثر سے آپ اس گمراہی سے جلد ہی نکل جائیں گے۔ اب یہ بڑی بڑی کمپنیاں بس صرف نام کا ہی کھا رہی ہیں، رہا پراڈکٹ کا معیار تو وہ گھٹیا ترین

ہے۔ شاید انہیں پتہ چل گیا ہے کہ بس ایڈ چلا دو کہ "ویوز، صرف نام ہی کافی ہے"، تو بہت سے بے وقوف اسی سے مل جائیں گے۔

بچوں کے جوتے خریدنے ہیں تو بہتر ہے کہ کسی ریڑھی والے پٹھان سے خرید لو کہ ڈیزائن بھی باٹا شاٹا اور سروس شروس کے درجے کے ہی ہوتے ہیں اور پائیدار یا سستے تو ان سے زیادہ ہی ہوتے ہیں۔ اور بچوں نے بھی جوتوں کا ستیاناس ہی کرنا ہوتا ہے تو بہتر ہے کہ برینڈ کے نام پر پیسہ نہ اجاڑو کہ اس نے بھی ایک سال ہی چلنا ہے اور ریڑھی والے کا جوتا بھی ایک سال ہی چلنا ہے۔ اور اگر زیادہ "برینڈ کانشیئنس" ہو تو بازار سے مختلف برینڈز کے اسٹکرز خرید کر جوتوں پر لگا لیا کرو۔ باقی، عورتوں کے جوتوں کا مجھے کوئی تجربہ نہیں ہے۔

یوفون کے بِل بورڈ

شہر بھر میں صاف آواز اور تیز انٹرنیٹ کے بِل بورڈ (bill-boardd) لگانے کی کیا ضرورت ہے جبکہ وہ سب کہ جو یوفون استعمال کرتے ہیں، انہیں یوفون کی ان خاصیات کا خاصہ علم ہے، یہ تو استعمال نہ کرنے والوں کو شبہے میں ڈالنے والی بات ہے کہ وہ خواہ مخواہ سوچیں کہ کہیں یہی دو مسئلے تو یوفون میں نہیں ہیں؟

یہ قوم اب الٹا سوچنے اور الٹا دیکھنے کی عادی ہو چکی ہے۔ جو "کوکا کولا" کو الٹا پڑھ کر "لا مکہ اور لا محمد" سمجھ سکتے ہیں تو صاف آواز اور تیز انٹرنیٹ کا "مفہوم مخالف" نہیں نکال سکتے کیا؟ کوئی ایڈورٹزمنٹ ہی کرنی ہے تو ڈھنگ سے کر لو۔

بد ذوق اور بد اخلاق

تمہارے بد ذوق ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ تمہیں "گورمے مٹھائی" پسند ہے۔ اور ہر معقول بات میں ایک "جزوی صداقت" ہوتی ہے، اگر تم اس تک نہ پہنچ پاؤ تو "کند ذہن" ہو۔ اور اگر جان لو لیکن اسے لائک نہ کر سکو تو "بد اخلاق" ہو۔

فیس بک پر ان ایکٹو فرینڈز کو ان فرینڈ کرنا

کسی دوست کے علم میں ہے کہ فیس بک پر ان ایکٹو (inactive friends) کو ان فرینڈ (unfriendd) کرنے کی کیا کوئی آپشن موجود ہے؟

عموماً ہوتا یہ ہے کہ اکثر لوگ فیس بک پر شوقیہ اکاؤنٹ تو بنا لیتے ہیں لیکن پھر انہیں فیس بک کو انجوائے کرنے کے لیے بیگم سے ادھار وقت نہیں مل پاتا لہذا اس امید پر بہت سے فرینڈز بنا کر غیبوبت کبری میں چلے جاتے ہیں کہ کسی وقت بیگم کے میکے جانے پر اچانک ظہور فرمائیں گے۔ اور پھر جب اچانک کسی کی وال پر ظہور فرماتے ہیں تو پھر نہ آگے دیکھتے ہیں اور نہ پیچھے۔

بھئی، کسی کی وال پر تین سالوں میں پہلی مرتبہ کمنٹ کرنا ہے تو ایک دو گھنٹے اس کی وال پر گزار کر اس کا مزاج ہی چیک کر لو۔ یہ تو خیر مذاق کی بات ہوئی لیکن میری رائے میں فیس بک پر یہ آٹو آپشن ہونا چاہیے کہ آپ کے فیس بکی دوست نے اگر چھ ماہ تک آپ کی کسی پوسٹ کو لائیک نہیں کیا اور سال بھر میں کسی ایک پوسٹ کو شیئر نہیں کیا تو اسے خود سے ہی ان فرینڈ ہو جانا چاہیے۔ ایسے بے قدروں کو دوست بنانے کا فائدہ؟

یا اگر اتنی ہی مصروفیت ہے کہ سال بھر میں عید کے صرف دو دنوں میں منہ دکھائی وصول کرنے کے لیے آ جائیں کہ ہماری سیلفی کو لائک مار یو جی تو پھر لائن لگی فرینڈز ریکوئسٹس کو ایک چانس ضرور دینا چاہیے۔ اور آخری بات یہ ہے کہ فیس بک انٹرٹینمنٹ کے لیے بنائی گئی ہے، اس کا مزاج خانقاہ اور معسکر کا نہیں ہے۔ یہاں ہلکے پھلکے انداز میں ہی دین کی تبلیغ ہو سکتی ہے البتہ یہ ہمارے مذہبی دوستوں کا کمال ہے کہ انہوں نے انٹرٹینمنٹ کے اس آلے کو دین کی تبلیغ کا ذریعہ بنا کر دکھا دیا ہے۔

اور فیس بک پر لائکس اور شیئرز کی خواہش رکھنا اتنا ہی فطری ہے جتنا کہ مسجد اور مدرسہ میں چندے کی خواہش رکھنا، پیر صاحب کا مریدوں کی تعداد میں اور مذہبی جماعت اور مسلک کا جماعت اور مسلک کے ممبران کی تعداد میں اضافے کی خواہش رکھنا۔ اس لیے زیادہ واعظ بننے کی ضرورت نہیں ہے، یہ وعظ کہیں اور جا کر فرمائیں۔

رہا غلو تو وہ تو کسی صورت بھی ناپسندیدہ ہے۔ اور آخری خواہش یہ ہے کہ اگر پوسٹ زیادہ پسند آئے تو براہ مہربانی دو مرتبہ لائک نہ کریے گا۔ اور یہ بھی کہ اگر اس پوسٹ میں کسی فیس بکی شیخ اکبر کو خود پسندی یا ریاکاری نظر آئے تو اس پوسٹ کو کسی فیس بکی پطرس بخاری کی طرف سے اپنے طبقے پر لطیف طنز شمار کرلے کہ اس کا بہت کچھ سامان بھی اس پوسٹ میں موجود ہے، بس لسانیات کی کچھ تھیوریز کو آگے پیچھے سے پکڑنا پڑے گا۔

چلو، چلو، رائے ونڈ چلو!

مستقبل کا مؤرخ کیا لکھے گا کہ دشمن کی فوجیں سرحد پر حملہ کرنے کے لیے تیار بیٹھی تھیں اور قوم کے "مسٹر" اس پر مناظرے (talk shows) کر رہے تھے کہ چلو، چلو، رائے ونڈ چلو۔

چلو، چلو، رائے ونڈ چلو! اگر ان حالات میں تبلیغی اس کے لیے قائل کرتا تو "مسٹر" مؤرخ یہ لکھتا کہ سرحد پر دشمن حملے کے انتظار میں بیٹھے تھے اور "مولوی" صاحب رائے ونڈ کی سیر کو جا رہے تھے جیسا کہ تاریخ میں سقوط بغداد کا طعنہ مولویوں کو دیا گیا کہ چنگیز خان حملہ کرنے آ رہا تھا اور مولوی مناظرے میں مصروف تھے۔

اب کی بار دشمن حملہ آور ہونے آ رہا ہے اور "مسٹر" مناظرے میں مصروف ہے۔ اس تناظر میں بات کی تھی۔ امید ہے کہ کچھ لوگوں کہ جنہوں نے لعن طعن کی، اور ان میں سے دو کو میں نے بلاک کر دیا، کی فہم ذرا سی بلند ہو گئی ہو گی۔

ایچ۔بی۔ایل کی فون بینکنگ سروس

نہ معلوم کتنی بار ایسا ہوا ہے کہ حضرت ایچ۔بی۔ایل کی ہیلپ لائن اور فون بینکنگ سروس پر بیسیوں کالز کرنے کے باوجود کوئی اٹینڈنٹ نہ ملا۔ اتنا مشکل تو شہباز شریف سے بات کرنا نہیں ہے جتنا ایچ۔بی۔ایل کے کسٹمر سروس کے نمائندے کی رٹی رٹائی انگریزی سننا۔

اوپر سے تنخواہ وصول کرنے کے دنوں میں ان کی اے۔ٹی۔ایم مشینیں خراب ہو جاتی ہیں، وہ خراب نہ ہوں تو اے۔ٹی۔ایم کارڈ کام کرنا چھوڑ جاتے ہیں جیسا کہ آجکل

میرے ساتھ ہو رہا ہے۔ معلوم نہیں کیا کیا بہانے ہیں ان کے پاس۔ ہم سے قرض لے کر ہمیں ہی واپس کرنے کو یوں محسوس کرتے ہیں جیسے کسی نے ان پر صدقہ کر کے واپس مانگ لیا ہو۔

سروسز کا حال یہ ہے اور اوپر سے سروسز کے بینک چارجز دیکھو تو ذہن میں ایک ہی لفظ آتا ہے "سوٹڈ بوٹڈ لٹیرے"۔ میری کہیں سے دو ہزار کی پے منٹ آنی تھی، انہوں نے ایچ۔بی۔ایل کی دوسری برانچ کے ایک اکاؤنٹ ہی کا ایک چیک بھیج دیا۔ ساتھ میں ایک لیٹر تھا کہ اس دو ہزار میں سے تین سو روپیہ سرکار کی خدمت میں بطور ٹیکس بھجوا دیا گیا ہے۔ خیر، بینک میں گیا تو انہوں نے کہا کہ اس سترہ سو کے آپ کے اکاؤنٹ میں جمع کرنے کے 439روپے چارجز ہیں۔

ایک طرف حکومتوں نے ظالمانہ ٹیکس لگا لگا کر غریبوں کا جینا حرام کیا ہوا ہے اور دوسری طرف بینکوں کی صورت میں مہذب لٹیرے موجود ہیں جو عین قانون کے مطابق آپ کے پیسے پر ڈاکہ مار سکتے ہیں۔ اوپر سے حکومتیں بینکوں کو خوش کرنے کے لیے ایسے قانون بنا لیتی ہیں کہ جن سے ان کے فنانشیئل کرائمز عین لیگل ہو جاتے ہیں۔ اور بینک حکومتوں کو خوش کرنے کے لیے قرضے جاری کرتے ہیں۔ اب بھی بندہ یہ نہ کہے کہ "کتی چوراں نال رلی ہے" تو کیا کہے؟

کیپٹلزم کا کمال یہی ہے کہ اس نے ڈکیتی کی بعض صورتوں کو قانونی جواز دے دیا ہے۔ لیکن ہمارے لوگ ہیں کہ اس بات کو سمجھنے کی طرف آتے ہی نہیں ہیں۔ یہ جہاد ہے بھئی، اصل جہاد۔ بینکوں کے سود خورانہ اور حکومت کے ٹیکسوں پر مبنی ظالمانہ نظام کے خلاف آواز بلند کرنا۔ بندہ نہ چاہتے ہوئے صدقہ کر دے اتنا دکھ نہیں ہوتا جتنا پانامہ لیکس والوں کو ٹیکس ادا کر کے اور ٹوئنٹی فور/سیون ٹائم ان اویلیبلز کو سروسز چارجز ادا کر کے۔

بھئی، میں تو سیلری اکاؤنٹ کی وجہ سے مجبور ہوں، آپ کو کیا مجبوری ہے ایچ۔بی۔ایل میں اکاؤنٹ کھلوانے کی؟ اور بینک تھوڑے ہیں کیا۔ اب کی بار تو اپنی بیگم کا

اکاؤنٹ بھی میزان بینک میں ہی کھلوایا ہے۔ ابھی تک تو رویوں میں مہذب ہی معلوم ہوتے ہیں۔

کم سوالات کرنا دانشمندی کی علامت ہے؟

بہت سے دوست انباکس میں سوال کرتے ہیں، کچھ ای میل پر پوچھ لیتے ہیں، کچھ واٹس ایپ پر اور کچھ براہ راست فون پر بھی۔ بعض دوستوں کو بلکہ اکثر کو ان کے سوالات کے جوابات دے دیتا ہوں لیکن بعض رہ جاتے ہیں کہ وہ تحقیق طلب سوالات ہوتے ہیں لہذا ان کے فوری جواب دینا مناسب معلوم نہیں ہوتا لیکن تحقیق کے لیے فرصت بھی نہیں ملتی لہذا لوگ شکوہ کرنے لگ جاتے ہیں کہ ہمارے سوال کا جواب نہیں آیا۔

ایک وقت میں تو موبائل پر اتنے لوگوں نے سوال پوچھنا شروع کر دیے کہ خود مجھے محسوس ہونے لگا کہ اس مصروفیت کے ساتھ تو میں اور کچھ بھی نہیں کر پاؤں گا لہذا موبائل اٹھانا ہی چھوڑ دیا۔ اب بہت سے لوگ اس کا شکوہ کرنے لگ گئے کہ آپ فون ہی نہیں اٹھاتے۔ اب لوگ یہ نہیں سوچتے کہ اگلا بھی انسان ہے، ان کے نزدیک تو صرف انہوں نے فون کیا ہے لیکن ان صاحب کو معلوم ہے کہ اس دن میں ان کو فون کرنے والے بیس لوگ ہیں۔

اور پھر ایسا محسوس ہونے لگا کہ جیسے موبائل نعمت سے زیادہ زحمت ہو کہ ہر شخص بس فون اٹھائے اور کوئی کام ڈال دے یعنی گھر میں بیٹھے بٹھائے پہلے سے ملازمت، گھر، دعوت تبلیغ، درس وتدریس اور تعلیم و تحقیق کی مصروفیات کے ساتھ بیسیوں اضافی اسائنمنٹس مفت میں حاصل ہونے لگیں کہ کسی کو حدیث کی تحقیق چاہیے، کسی کو ایم۔فل کا سائن آپسس تیار کر کے دینا ہے، کسی کے ہاں درس قرآن دینا ہے، کسی کے ہاں جمعہ پڑھانا ہے، کسی کا نکاح پڑھانا ہے، کسی کے لیے ویڈیو پروگرام ریکارڈ کروانا ہے وغیرہ وغیرہ۔

میں اس بارے پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ آپ کے نزدیک آپ کا سوال ایک ہی ہوتا ہے لیکن مجھے جو دن بھر میں سوالات اور اسائنمنٹس موصول ہوتی ہیں، وہ

دسیوں ہوتی ہیں۔ آپ اپنے روٹین کے کاموں سے اتنا نہیں تھکتے کہ جتنا یہ اضافی کام آپ کو تھکا دیتے ہیں لیکن بہت سے لوگ پھر بھی یہ سب کچھ کرتے ہیں۔ یہ صرف میرے ساتھ نہیں ہے بلکہ جو بڑے علماء اور داعیان دین ہیں، ان کے ساتھ تو زیادہ ہے کہ ان کی مصروفیات زیادہ ہوتی ہیں یا وہ معروف زیادہ ہوتے ہیں تو زیادہ لوگ ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں لہذا خود عوام ہی کو اس کا دھیان کرنا چاہیے۔

رہی سوالات کی بات تو بہت زیادہ سوالات سے آپ کم سیکھ پاتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ سوال نہیں کرنا چاہیے بلکہ یہ کہہ رہا ہوں کہ سوال کم کرنے چاہییں۔ زیادہ سوالات کو ویسے بھی ہمارے دین نے پسند نہیں کیا ہے۔ کم سوالات کرنا سیکھیں، آپ کا سیکھنا بڑھ جائے گا۔ آپ علماء سے رابطے میں ضرور رہیں لیکن ان کے بولنے سے زیادہ ان کی خاموشی سے سیکھیں۔ میں نے لوگوں کی خاموشی سے زیادہ سیکھا بنسبت ان کے بولنے سے یعنی جو جگہ بولنے کی تھی، وہاں اگر خاموش رہا تو مجھے زیادہ سیکھنے کو ملا۔

بس انباکس میں بہت زیادہ سوالات شروع ہو گئے تھے لہذا اس لیے عرض کر دیا کہ اگر سوال کا جواب مل جائے تو فبہا اور اگر نہ ملے تو برا منانے کا فائدہ نہیں ہے۔ کسی اور سے پوچھ لیں کہ ہو سکتا ہے کہ کوئی اور اس کے بارے زیادہ بہتر جانتا ہو۔ اور یہ یاد رکھیں کہ آپ سائل ہیں اور جس سے سوال کیا ہے تو اس پر لازم نہیں ہے کہ وہ آپ کو سوال کا جواب دے ہی دے۔ بعض لوگوں کو سوال کا جواب نہ ملے تو ان کا لب ولہجہ تھانیداروں والا ہو جاتا ہے، یہ مناسب نہیں ہے۔ بھئی، ہر بندہ یہاں مصروف ہے، ہو سکتا ہے کہ اگلا آپ سے زیادہ مصروف ہو۔ بعض اوقات تو پوسٹ لکھتے ہوئے ڈر رہا ہوتا ہوں کہ ایک کے انباکس میسج کا جواب دوسرے کو نہ چلا جائے۔

عطر، خوشبو، پرفیوم

بھئی، دار البلاغ سے عطر لینے کا تجربہ اچھا نہیں رہا۔ جو عطر انہوں نے بارہ سو میں دیا، وہی تبلیغیوں سے دو سو میں مل جاتا ہے۔ بس ان کا عطر مقدار میں دوگنا تھا، اور تو کوئی فرق محسوس نہ ہوا۔

البتہ دار السلام کے عطر کا تجربہ بہت اچھا رہا، ان کا "حجر اسود" تو کمال ہے۔ ہزار بارہ سو میں اچھے عطر ہیں ان کے پاس۔ عطر کا پتہ لگاتے وقت نہیں آدھے گھنٹے بعد پتہ چلتا ہے، وہی اس کی اصل خوشبو ہوتی ہے۔

باقی اب بہت سے لوگ امپورٹڈ عطر کے نام پر مارکیٹ میں عطر بیچ رہے ہیں لیکن استعمال کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ لوکل ہی ہیں۔ عطر میں عربوں کا ذوق اچھا ہے، بس وہی استعمال کریں کہ جس کے خالق عرب ہوں۔

خوشبو میں عطر اس لیے پسند کرتا ہوں کہ الکحل فری ہوتے ہیں اور پرفیومز ویسے بھی پسند نہیں آتے، یا ہمارے ہاں ہیں ہی ساری لوکل کوالٹی۔

ٹھیکیدار

گھر میں کچھ کنسٹرکشن کا کام کروانا تھا تو دو ہفتوں کے لیے مستری مزدور ٹھیکے پر لگائے، اور اب دو مہینے ہو چکے لیکن کام ختم ہونے کو نہیں آرہا، واٹس ایپ تو ڈیلیٹ کر ہی دیا، اب فیس بک بھی بھاگ رہی ہے۔ ہمارے ساتھ فیس بک پر بہت سے ایسے دوست ہیں جو دنیاوی کاموں میں تجربہ کار ہیں، لیکن اپنے تجربات شیئر نہیں کرتے، ہر کوئی دینی وعظ و نصیحت کرنے میں لگا ہے۔ بھئی، دینی وعظ کرنے والے بہت ہو چکے، اب کوئی دنیا کی بھی بات کر لو، کسی کا بھلا ہو جائے، کوئی نقصان سے بچ جائے، کسی کی ٹینشن کم ہو جائے، کوئی ڈیپریشن سے نکل آئے۔

ہماری اس سوسائٹی کا واحد کردار "مولوی" ہے جو فی سبیل اللہ کام کر دیتا ہے۔ باقی تو فی سبیل اللہ مشورہ بھی نہیں دیتے۔ ڈاکٹر سے لے کر ٹھیکیدار تک ہماری سوسائٹی کا کون سا کریکٹر ایسا ہے جو یہ کام ثواب کے جذبے سے کرتا ہو؟ ہر انسان ہر کام کا اہل نہیں ہوتا، جنت کا رستہ بتلانے والے زیادہ ہو چکے ہیں، چلنے والا کوئی نہیں ہے۔ اب لوگوں کو دنیا گزارنے کے رستے بتائیں، چھوٹے چھوٹے مشورے دیں، کہ وہ گاڑی خرید سکیں، گھر بنا سکیں، بچوں کو دنیاوی تعلیم دلوا سکیں، کوئی ہنر سیکھ سکیں، اپنا روزگار بہتر بنا سکیں۔

اللہ کے رسول ﷺ نے لوگوں کی صرف آخرت نہیں بنائی، دنیا بھی سنواری

ہے۔ جس طرح آخرت کی رہنمائی ثواب دارین ہے، اسی طرح دنیا کی رہنمائی بھی ویلفیئر کا کام ہے جو کہ مولوی کے علاوہ دیگر طبقات کو اسی جذبے سے کرنی چاہیے، جس جذبے سے مولوی کر رہا ہے۔ ہر انسان ہر کام کا نہ اہل ہوتا ہے اور نہ تجربہ رکھتا ہے لہذا بہت نقصان اٹھاتا ہے۔ ایسے میں آپ کی تھوڑی سی رہنمائی اسے نہ صرف جان، مال اور اوقات کے نقصان سے بچاسکتی ہے بلکہ ٹینشن اور ڈیپریشن سے بھی نکال سکتی ہے۔

یہاں فیس بک پر ہمارے ایک دوست زاہد صدیق مغل صاحب یہ کام کرتے ہیں اور بڑے جذبے سے کرتے ہیں کہ اگر کہیں شمالی علاقہ جات کی سیر پر بھی گئے تو مشورہ دیتے ہیں کہ یہ کرلینا اور یہ نہ کرنا۔ تو یہ کرنا چاہیے لیکن اگر ٹورازم کا ایکسپرٹ یہ کرے گا تو ہزاروں کا بھلا ہو گا۔ چلیں، اسے اپنے کام کی زکوۃ سمجھ کر ہی کرلیں۔ ہم میں سے ہر مرد کا معاملہ یہ ہے کہ اس نے گھر کی ذمہ داری اٹھانی ہے لیکن اکثر کو اگر پہلی مرتبہ اے۔ سی ٹھیک کروانا پڑ جائے تو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ اے۔ سی میں گیس بھروانے کا مارکیٹ ریٹ کیا ہے؟ اور گیس کتنی قسم کی ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ

اگر کوئی دوست یہی کام کرلیں کہ "ٹھیکیدار" کے نام سے کوئی فیس بک پیج بنالیں اور اس میں باقی دوست مختلف چیزوں کے بارے اپنے تجربات مثلاً ریٹس، کام کی نوعیت، دو نمبر اور اصلی کا فرق وغیرہ شیئر کر دیا کریں جیسا کہ "پاک ویلز" پر لوگ گاڑیوں کے بارے اپنے تجربات شیئر کرتے ہیں تو ان شاء اللہ! امید ہے کہ اس سے انھیں اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا واعظین کو وعظ و نصیحت سے ملتا ہے۔

بھئی، مولوی حضرات کو مشورہ یہ ہے کہ گھر ٹھیکدار سے بنوانے کی بجائے خود ہی بنوائیں، تنگ تو ہوں گے اور نقصان بھی کریں گے لیکن اس قابل ضرور ہو جائیں گے کہ لوگوں کی آخرت کے ساتھ دنیا بھی سنوار سکیں کیونکہ خود دنیا داروں میں تو یہ جذبہ نہیں ہے کہ ایک دوسرے کی دنیا بھی سنوار سکیں، یہ کام مولوی ہی کر سکتے ہیں اور وہی اس کے اہل بھی ہیں۔ زاہد صدیق مغل صاحب اس کی اچھی مثال ہیں۔ اور ٹھیکیدار رکھ بھی لیں گے تو اس کی ٹھیکیداری بھی آپ ہی کو کرنی پڑے گی۔ ان کی آخرت کی جنت

کے ٹھیکدار تو ہم تھے ہی، اب ہمیں ان کی دنیا کی جنت کا ٹھیکیدار بھی بننا پڑے گا۔

قومی صفات

ایک دوست نے ایک ویڈیو شیئر کی اور دیکھنے کو کہا جو غالباً امریکی ٹیلنٹ کے نام سے تھی، میں نے صرف دو منٹ ویڈیو دیکھی، اب انہوں نے شاید امریکی ٹیلنٹ کو داد دینے کی غرض سے ویڈیو شیئر کی تھی لیکن میں نے اس ویڈیو سے کچھ اور تاثر لیا۔

میں نے نوٹ کیا کہ کچھ عام امریکی اسٹیج پر آتے ہیں اور اپنی صلاحیتوں کا اظہار کرتے ہیں اور مجمع انھیں دل کھول کر داد دیتا ہے۔ میں نے کبھی کسی مجمعے کو اس طرح کسی کو داد دیتے نہیں دیکھا حالانکہ فن کا مظاہرہ کرنے والے بھی عام لوگ تھے اور ان کا فن بھی کچھ خاص نہ تھا۔ اور کچھ تو کنفیوژڈ بھی تھے لیکن مجمعے نے ان کا مذاق نہیں اڑایا بلکہ حوصلہ دیا اور تالیاں بجائیں۔

اس سے میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ جس طرح افراد کی صفات ہوتی ہیں، اسی طرح قوموں کی بھی صفات ہوتی ہے۔ ہم پاکستانی بحثیت قوم کسی کو داد دینے میں یا کسی کو اپیری شیئیٹ کرنے میں بیت کنجوس اور حد درجے بخیل ہیں۔ البتہ کسی پر طعن و تشنیع کرنی ہو یا کسی پر تنقید کرنی ہو تو ہم بہت فیاض اور سخی بن جاتے ہیں۔ یہ رویہ آپ کو گھر، دفتر، آفس، گلی محلے بلکہ ہر جگہ نظر آئے گا۔ میاں بیوی ایک دوسرے پر تنقید کرنے میں خوب بلاغت کا اظہار کرتے ہیں لیکن ایک دوسرے کو ایپیری شیئیٹ کرتے وقت ان کے پاس الفاظ دو چار ہی ہوتے ہیں۔ باس اپنے ماتحت کے کام میں نقص خوب فصاحت سے نکالے گا لیکن اس کی تعریف کرتے وقت اسے الفاظ بھول جائیں گے۔

جس طرح ایک فرد خوش اور غمگیں ہوتا ہے، اسی طرح ایک قوم بھی خوش اور غمگیں ہوتی ہے۔ مجھے معلوم نہیں کیوں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم پاکستانی خوش نہیں ہیں بلکہ غمگیں قوم ہیں یا ٹینس اور ڈیپریس قوم کہہ لیں۔ سڑک پر دیکھ لیں، گاڑی چلاتا ہوا ہر شخص آپ کو مضطرب، بے چین اور پریشان نظر آئے گا۔ ہم میں سے اکثر کے لبوں پر مسکراہٹ کی بجائے چہروں پر تناؤ اور کھچاؤ رہتا ہے۔ کسی سے بات کرتے وقت ہم کہیں

اور کھوئے ہوتے ہیں۔ شاید ہم پر کام کا دباؤ زیادہ ہوتا ہے، یا ہماری خواہشات بہت بڑھ چکی ہیں، یا ہم زندگی کو جینے اور زندہ دلی جیسی صفات سے محروم ہو چکے ہیں، کچھ تو ہے جو صحیح نہیں ہے۔

پھر ہم نے اپنی کچھ خامیوں اور عادتوں کو مذہب کا جھوٹا سہارا بھی دے رکھا ہے۔ کسی کی تعریف کرتے وقت فوراً یہ سوچنا شروع کر دیں گے کہ کہیں یہ بگڑ نہ جائے، اس میں تکبر نہ آجائے بلکہ اکثر لوگوں سے آپ یہ جملہ سنتے بھی ہوں گے کہ بیوی یا ملازم کی کھل کر تعریف کر دیں گے تو بگڑ جائیں گے لیکن تنقید ہم پھر بھی کھل کر کرتے ہیں حالانکہ اس میں بھی بگڑنے کا شائبہ اتنا ہی موجود ہوتا ہے بلکہ صحیح حدیث کا مفہوم ہے کہ تمہاری عیب جوئی کسی مسلمان کو بگاڑ دیتی ہے۔ تو یا تو ہم اپنے آپ کو اس طرح متوازن کر لیں کہ اگر تعریف زیادہ نہیں کر پاتے تو تنقید ہی کم کر دیں۔ لیکن یہ شاید ہماری فطرت کے خلاف ہے کہ ہم تنقید کم کر دیں لہذا ہمیں کم از کم تعریف میں اضافہ کر دینا چاہیے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر دوسروں کی حوصلہ افزائی کریں اور دل کھول کر کریں۔

میرا خود رویہ یہی رہا ہے کہ اگر میری پوسٹ پر کوئی زیادہ تنقید کر دے تو وہ کمنٹ تو ڈیلیٹ کرتا ہی ہوں اور اگر کوئی تعریف میں مبالغہ کر دے تو وہ بھی ڈیلیٹ کرتا رہا ہوں، اب میں نے اس پر غور کیا کہ میں ایسا کیوں کرتا ہوں تو شاید کسی تقوی یا نیکی کی وجہ سے نہیں کرتا بلکہ اس وجہ سے کہ ہمارے معاشرے میں اس کا رواج نہیں ہے اور یہ چیز کسی ایک کے ساتھ ہو جائے تو بہت عجیب معلوم ہوتی ہے اور عجیب شیٔ نظروں میں آجاتی ہے اور پھر اس پر منفی سوچ شروع ہو جاتی ہے۔ اگر تعریف میں مبالغہ آمیز کمنٹ میری وال پر موجود ہو گا تو بہت سے لوگ یہ سوچنا شروع کر دیں گے کہ یہ اپنی تعریفیں پسند کرتا ہے اور اس منفی سوچ کی انتہا یہ ہو گی کہ یہ تعریف کا بھوکا ہے لیکن اگر سوسائٹی میں تعریف میں مبالغہ ایک عام چیز ہو گی تو کسی کو برا نہ لگے گا بلکہ ایک روٹین کی چیز معلوم ہو گی۔ رہی حدیث میں تعریف میں مبالغہ نہ کرنے کی بات تو وہ کسی اور کانٹیکسٹ میں ہے، جس پر پھر بات کروں گا۔

بدمعاش کلاس

ہم اپنے معاشرے کو طبقاتی اعتبار سے چار قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں؛ لوئر کلاس، مڈل کلاس، ہائر کلاس اور ایلیٹ کلاس۔ لوئر کلاس تو بیچاری نہ تین میں نہ تیرہ میں۔ دو وقت کی روٹی ہی پوری کر لیں تو ان کی زندگی کا گویا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ رہی ہائر اور ایلیٹ کلاس تو ان کے اپنے مسائل ہیں لیکن مجھے اس وقت مڈل کلاس کے رویوں کو ڈسکس کرنا ہے۔

مڈل کلاس ہمارے معاشرے کا ایک بہت بڑا طبقہ ہے جو ہائر کلاس میں شامل ہونے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں کے نظام کو ایک لفظ میں اگر بیان کیا جائے تو وہ لفظ "اشرافیت" (aristocracy) ہے یعنی ہائر کلاس کی حکومت۔ یہ پولیٹیکل سائنس کی اصطلاح ہے اور آسان الفاظ میں اس سے مراد نہ تو جمہوریت ہے اور نہ ہی آمریت بلکہ ایک خاص کلاس کی حکمرانی ہے اور یہ کلاس، اس معاشرے کی ہائر کلاس ہوتی ہے۔ یہ کلاس ہر طبقے میں موجود ہوتی ہے، مذہبی گروہ ہو یا سیاسی جماعت، فوج ہو یا پولیس۔

جس شخص نے بھی اس معاشرے کا ذرہ سی گہرائی سے تجزیہ کیا ہے وہ اس نتیجے تک پہنچ چکا ہے کہ بنیادی طور یہ بدمعاشوں کا معاشرہ ہے اور جسے آگے بڑھنا ہے یا اپنے حقوق کا تحفظ کرنا ہے، تو اس کا ایک ہی اصول ہے اور وہ ہے بدمعاشی۔ ہمارے ہاں ایک شخص کے بارے دعوی کیا گیا کہ وہ اپنے دور کا بدمعاش تھا یعنی پرویز مشرف۔ اس کی بدمعاشی ختم کرنے کے لیے ایک اور فریق میدان میں آیا اور یہ وکیل تھے۔ اب جب لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ بدمعاش بن گئے تو ان کی بدمعاشی ختم کرنے کے لیے ایک اور فریق میدان میں آیا اور اس کا نام میڈیا ہے اور اب عوام کے بقول انہوں نے بدمعاشی شروع کر دی۔ بدمعاشی کا علاج بدمعاشی ہے لیکن کیا کریں کہ ایک بدمعاش کو ختم کرنے کے لیے ایک دوسرا بدمعاش پیدا کرنا پڑتا ہے لہذا ایک طبقے کا مسئلہ تو حل ہو گیا لیکن معاشرے کا مسئلہ تو حل نہ ہوا۔

ہائر کلاس کی یہ حکومت صرف ایک اصول کے تحت چل رہی ہوتی ہے اور اس اصول کا نام ہے بدمعاشی۔ اس بدمعاشی کی وجہ سے ہی ہائر کلاس کی عزت بھی ہوتی ہے، ان کے حقوق بھی محفوظ رہتے ہیں اور معاشرے کی قوت اور اقتدار بھی ان کے ہاتھ میں ہی رہتا ہے۔ مڈل کلاس اس اصول سے متاثر ہو جاتی ہے اگرچہ اس کے پاس اس کے وسائل نہیں ہوتے۔ مڈل کلاس کے لوگ جو ہائر کلاس میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا ان کے جیسی عزت حاصل کرنا چاہتے ہیں یا ان کے جیسا اپنے حقوق کا تحفظ چاہتے ہیں تو وہ بدمعاش بننے کی شعوری یا لاشعوری کوششیں کرتے ہیں۔ وہ دوسروں کو اپنا تعارف ایسے کرواتے ہیں جیسے گورنر، وزیر اعلی، جرنیل، آئی۔ جی وغیرہ ان کے ملازم رہے ہوں۔

آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ مڈل کلاس کے لوگوں سے جب آپ کا اختلاف یا جھگڑا ہو تو وہ آپ کو دھمکیاں بہت لگاتے ہیں جیسے یہ کہ ہمارے بڑے تعلقات ہیں، فلاں ہمارا رشتہ دار ہے، ہم دیکھ لیں گے، ہم یہ کر دیں گے، وہ کر دیں گے وغیرہ وغیرہ۔ اور ہو سکتا ہے کہ ان کے تعلقات ہوتے بھی ہوں لیکن اتنے ہی جیسا کہ کوئی ریٹائرڈ بریگیڈیئر جرنل فیس بک پر میرا فرینڈ ہو۔

اگر آپ کو ایسے لوگوں سے واسطہ پڑ جائے تو کیا کریں؟ بھئی، دو کام کریں ایک یہ کہ ایسے ذہن کا استعمال کہ ان کے جذبات ٹھنڈے پڑ جائیں لیکن اپنا حق مت چھوڑیں کہ اس سے معاشرے میں بدمعاشوں کی تعداد بڑھے گی۔ اور دوسرا یہ کہ جو ان کا حق بنتا ہے تو ان کی دھمکیوں کی وجہ سے رد عمل میں اسے روک نہ لیں، وہ انہیں ضرور دیں، اللہ عزوجل آپ کو دنیا میں اور آخرت میں بھی عزت دے گا، ان شاءاللہ۔

❁❁❁❁❁❁❁

باب ہفدہم

حجیت حدیث اور انکار حدیث

اس باب میں حجیت حدیث اور انکار حدیث سے متعلق بنیادی
سوالات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

قرآن مجید کی روایات

ہمارے دین کے دو بنیادی مصادر ہیں۔ قرآن مجید اور سنت۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن مجید نقل کرتے ہیں تو ان کے اس نقلِ قرآن کو اصطلاح میں "قراءت" کہتے ہیں اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سنت نقل کرتے ہیں تو ان کے اس نقلِ سنت کو "حدیث" کہتے ہیں۔ پس قراءت، قرآن مجید کی روایت ہے اور حدیث، سنت کی روایت ہے۔

قرآن مجید اور سنت ہمیں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے قطعی خبر کے ذریعے سے ملے ہیں۔ قرآن مجید کی وہ روایات جو قطعی طور ثابت ہیں اور جنہیں امت میں تلقی بالقبول حاصل ہے اور ان پر امت کا اجماع ہے تو وہ کل بیس روایات ہیں کہ جنہیں اصطلاح میں قراءات سبعہ عشرہ بھی کہتے ہیں۔ قراءات کے امام دس ہیں کہ جن کے شاگرد بیس ہیں اور قرآنی روایات انہی شاگردوں کے نام سے منسوب ہیں۔[1]

امت مسلمہ کے پاس اس وقت جو قرآن مجید موجود ہے، وہ انہی قراء کی سند سے موجود ہے۔ اگر ان قراء کو درمیان سے نکال دیا جائے تو امت کے پاس موجود مصحف کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا چھوڑا ہوا مصحف ثابت کرنا ممکن نہیں ہے۔ مسلم دنیا میں اس وقت قرآن مجید کی چار روایات رائج ہیں کہ جن میں معروف ترین روایت، "روایتِ حفص" ہے جبکہ دوسرے نمبر پر "روایتِ وَرش" ہے۔ ان کے علاوہ روایتِ قالون، روایتِ دُوری بھی بعض ممالک میں عوامی طور پر پڑھی پڑھائی جاتی ہیں۔

قرآن مجید کی "روایتِ دُوری" سوڈان، صومالیہ، نائیجیریا، چاڈ اور وسطی افریقہ میں عوامی سطح پر پڑھی پڑھائی جاتی ہے۔ قرآن مجید کی "روایتِ قالون" لیبیا اور تیونس میں پڑھی پڑھائی جاتی ہے۔ قرآن مجید کی "روایتِ ورش" الجزائر، موریطانیہ، مراکش، مالی، سینیگال وغیرہ میں پڑھی پڑھائی جاتی ہے۔ اور مسلم دنیا کے اکثر حصے میں "روایتِ

---

[1] مودودی، ابو الاعلی، سید، قرآن مجید میں قراءتوں کا اختلاف، ماہنامہ رشد، ستمبر 2009ء، مجلس تحقیق اسلامی، لاہور، ص 48-49

حفص" پڑھی پڑھائی جاتی ہے۔یہی روایت ہمارے ہاں جنوبی ایشیااور مشرق وسطی میں رائج ہے۔[1]

دنیائے اسلام کے مشرق میں اگر مصحف، روایتِ حفص میں شائع ہوتے ہیں تو بلادِ مغرب اور افریقہ میں مصاحف کی اشاعت روایتِ ورش، قالون اور دُوری میں ہوتی ہے۔ اور بلادِ مغرب میں لاکھوں قراء کرام اور کروڑوں عوام الناس اپنی نمازوں اور نمازوں کے علاوہ میں بھی تلاوت اپنی روایت کے مطابق ہی کرتے ہیں۔ امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ یہ سب روایات قطعی طور اللہ کے رسول ﷺ سے ثابت ہیں۔

حال ہی میں شاہ فہد پرنٹنگ پریس، مدینہ منورہ، سعودی عرب نے بلادِ مغرب اور افریقہ کے مسلمانوں کے لیے ان کی روایات میں قرآن مجید پبلش کیے ہیں۔ جن میں سے ایک معروف روایت، "روایت ورش عن نافع" ہے۔ یہ مصحف اسی طرح سے پبلش کیا گیا ہے جیسا کہ بلادِ مغرب میں موجود مسلمان حکومتوں کی وزارت اوقاف انہیں اپنی عوام کے لیے شائع کرتی ہے۔ بلادِ مغرب کے ان شائع شدہ مصاحف میں ہمارے ہاں کے شائع شدہ مصاحف سے کچھ رسم، کچھ قراءات اور کچھ ضبط کے اختلافات ہیں۔ اور یہ تینوں مختلف علوم ہیں کہ جنہیں علوم قرآنیہ کے طلباء ہی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر بلادِ مغرب میں جو مصاحف شائع ہوتے ہیں، ان میں بسم اللہ کو سورۃ الفاتحہ اور سورۃ البقرۃ کی پہلی آیت شمار کیا گیا ہے اور انہیں سورت میں شامل کر کے لکھا گیا ہے[2] جبکہ ہمارے ہاں شائع شدہ مصاحف میں بسم اللہ کو سورت سے علیحدہ لکھا جاتا ہے اور اسے سورۃ الفاتحہ اور سورۃ البقرۃ کی مستقل آیت شمار نہیں کیا جاتا۔ یہ قراءت کا اختلاف ہے۔ اسی طرح بلادِ مغرب کے مصاحف میں قاف کو لکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے اوپر ایک نقطہ ڈالا جاتا ہے جبکہ ہمارے ہاں قاف کے اوپر دو نقطے

---

[1] نعیم الرحمن ناصف، حافظ، رشد قراءات نمبر اور منکرین حدیث کی بوکھلاہٹ، ماہنامہ رشد، مارچ 2010ء، مجلس تحقیق اسلامی، لاہور، ص 14

[2] Al-Quran Al-Kareem bi Riwayat e Warsh, Retrieved 01 November, 2016 from https://archive.org/details/standard1-quran

ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں بلادِ مغرب کے مصاحف میں فاء کو لکھتے وقت اس کے نیچے ایک نقطہ ڈالا جاتا ہے جبکہ ہمارے ہاں فاء کو لکھتے وقت اس کے اوپر ایک نقطہ ہوتا ہے۔ یہ علم الضبط کی مثال ہے۔[1]

قرآن مجید کی حفاظت کا اصل ذریعہ کتابت یا حفظ؟

ہر دور میں کسی شیء کو محفوظ کرنے کے ذرائع مختلف رہے ہیں۔ زمانہ قدیم میں عربوں میں علم کو محفوظ کرنے کا اصل ذریعہ حفظ تھا جیسا کہ دور جاہلیت کی عرب شاعری کو زبانی ہی محفوظ کیا گیا ہے اور زبانی ہی نقل کیا گیا ہے۔ قرون وسطی میں کتابت کو اہمیت حاصل ہوتی چلی گئی اور آج جدید دور میں کہ جسے ہم آئی ٹی کا دور کہتے ہیں، کتابت بھی متروک ہو چکی ہے اور اس کی جگہ کمپیوٹرائزیشن لے چکی ہے۔

اب ہم اپنا علم اپنی ڈائری کی بجائے اپنی ہارڈ ڈسک میں محفوظ رکھتے ہیں۔ اور اب تو کتابیں کیا، لائبریری تک ہارڈ ڈسک میں موجود ہوتی ہے۔ علوم اسلامیہ کے طلباء کے لیے اس کی بہترین مثال "المکتبۃ الشاملۃ" ہے کہ جس میں کوئی ساٹھ ہزار تک کتب جمع کی جا چکی ہیں۔ اب طلباء کتاب کی ہارڈ کاپی کی بجائے سوفٹ کاپی سے زیادہ استفادہ کرتے ہیں۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہر زمانے کا علم کو محفوظ کرنے اور رکھنے کا ایک مزاج ہوتا ہے اور زمانہ قدیم میں یہ مزاج حفظ کا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کی وفات ہوئی تو سینکڑوں حفاظ موجود تھے لیکن قرآن مجید کا ایک بھی لکھا ہوا مکمل نسخہ موجود نہ تھا حتی کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آ کر سب سے پہلے قرآن مجید کا پہلا مکمل نسخہ تیار کروایا جو کہ ایک سرکاری نسخہ تھا۔ آپ ﷺ کے زمانے میں قرآن مجید جو کہ لکھا گیا تھا، وہ ایک جگہ جمع نہیں تھا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں بھی قرآن مجید کا ایک سرکاری نسخہ تو تیار ہو گیا لیکن اس کی کتابی اشاعت نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ حضرت عمر

[1] Al-Quran Al-Kareem bi Riwayat e Warsh, Retrieved 01 November, 2016 from http://ia601606.us.archive.org/14/items/QRaaNT/QRaaNTH.pdf

بن خطاب رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت بھی گزر گیا اور قرآن مجید کا ایک ہی سرکاری نسخہ موجود رہا۔ پھر حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے دور میں ایک سے زائد نسخے تیار ہوئے اور وہ بھی پانچ سے زائد نہ تھے۔[1] گویا خلافت راشدہ میں قرآن مجید کے عوامی سطح پر پڑھنے کا جو عمل جاری تھا، وہ استاذ اور شاگرد کے باہمی تعلق سے جاری تھا اور قرآن مجید کو محفوظ رکھنے کا جو ذریعہ استعمال ہوا، وہ حفظ تھا۔ اسی لیے تو اللہ عزوجل نے قرآن مجید کا تعارف یہ کہہ کر کروایا کہ یہ اہل علم کے سینوں میں وہ آیات ہیں، جو واضح ہیں۔[2]

پس قرآن مجید وہی ہے جو اہل علم کے سینے میں محفوظ ہوا اور پھر سینہ بسینہ نقل ہوا ہے۔ قراء کرام نے قرآن مجید کی اسناد اور روایات کو محفوظ کیا اور آج ہر قاری قرآن کے پاس ایسی سند موجود ہے کہ وہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچنے والی ہے۔ آج بھی جبکہ پرنٹنگ پریس کا زمانہ اپنے عروج پر ہے اور مصاحف لاکھوں کی تعداد میں شائع ہو رہے ہیں، قرآن مجید میں اصل اعتبار حفظ کا کیا جاتا ہے نہ کہ کتابت کا۔

دنیا کے کسی بھی اسلامی ملک میں حکومت کی اجازت سے جو مصاحف شائع ہوتے ہیں تو ان کی تصدیق پہلے قراء کرام سے کروائی جاتی ہے۔ پاکستان کی وزارت مذہبی امور اس وقت تک کسی پبلشر کو مصحف شائع کرنے کی اجازت فراہم نہیں کرتی جب تک کہ دو قراء کرام اس مصحف کی صحت کی تصدیق نہ کر دیں۔ لہذا قرآن مجید کی نقل میں اصل قراء ہیں نہ کہ مصاحف کہ لکھے ہوئے کی تصدیق قراء اور حفاظ کر رہے ہیں۔ لکھا ہوا قرآن مجید یا مصحف اس وقت تک مستند نہیں ہے جب تک کہ اسے قراء اور حفاظ کی مہر تصدیق حاصل نہ ہو جائے۔

اور اہم تر بات یہ ہے کہ لکھے ہوئے کو پڑھنا اور صحیح پڑھنا کسی بھی زبان میں بغیر ماہر استاذ کے ممکن ہی نہیں ہے کہ ایک ہی زبان میں تلفظ اور لہجات [accents and dialects] کا فرق ہوتا ہے۔ کسی زبان میں کچھ حروف سائلنٹ ہوتے ہیں۔ انگریزی

---

[1] علي بن سليمان العبيد، الدكتور، جمع القرآن الكريم حفظا وكتابة، مجمع الملك فهد، المدينة المنورة، ص 55

[2] العنكبوت: 29: 49

زبان کا ایک ہی لفظ امریکن کسی اور طرح ادا کرتے ہیں اور برطانوی کسی اور طرح سے۔ اور بعض اوقات تو زمین وآسمان کا فرق ڈال دیتے ہیں۔ پس قرآن مجید اگر لکھا ہوا بھی ہے تو اس لکھے ہوئے کو کیسے پڑھنا ہے؟ تو اس میں پھر اصل قراء اور حفاظ ہیں۔ اگر آپ لکھے ہوئے کو ویسے ہی پڑھیں جیسا کہ وہ لکھا ہوا ہے تو قرآن مجید کے بہت سے مقامات کو غلط پڑھ جائیں گے۔ اور ان باتوں کی گہرائی سے قراء خوب واقف ہیں کہ بعض مقامات پر قراءت، ظاہری رسم کے مطابق نہیں ہو رہی ہوتی ہے۔

اس لیے قرآن مجید میں اصل نقل ہے نہ کہ کتابت، اور نقل بھی ماہرین کی نہ کہ عوام کی۔ قراء اور عوام کے قرآن مجید محفوظ رکھنے میں جو فرق ہے، وہ سب کے علم میں ہے۔ دیہات میں بوڑھی اماں جی بھی بچوں کو قرآن مجید پڑھا رہی ہوں گی اور ان کے بھی سینکڑوں شاگرد ہوں گے اور ان کے اخلاص کا اللہ کے ہاں انہیں اجر بھی ملے گا لیکن کیا ان بوڑھی اماں نے قرآن مجید کو اسی طرح سے محفوظ رکھا ہوا ہے جیسا کہ اللہ کے رسول ﷺ نماز میں تلاوت فرماتے تھے؟ تو یہ اعزاز صرف قراء کو حاصل ہے۔

کتاب وسنت کا باہمی تعلق

عرصہ ہوا کہ جناب مفتی فیصل جاپان والا کے توسط سے کراچی میں غامدی صاحب کے شاگرد معز امجد صاحب سے ایک علمی گفتگو ہوئی تھی کہ جس میں راقم کے ساتھ جناب طاہر الاسلام عسکری صاحب بھی شریک تھے۔ اس مجلس کا کل حاصل میرے لیے ایک جملے میں یہ تھا کہ معز امجد صاحب نے یہ کہا کہ میرے لیے بنیادی ترین سوال یہ ہے کہ کتاب وسنت کا باہمی تعلق کیا ہے؟

یہ امر واقعہ ہے کہ ان سے ملاقات سے پہلے میں نے اس سوال پر غور نہیں کیا تھا لیکن اس نشست کے بعد واقعتاً یہ محسوس ہوا کہ دین کے ایک سنجیدہ طالب علم کے لیے یہ بہت ہی بنیادی سوال ہے۔ اس سوال پر مطالعہ اور غور وفکر شروع کیا اور پھر اس موضوع پر کافی کچھ لکھا بھی کہ جس کا خلاصہ ذیل میں بیان کر رہا ہوں۔

سلف صالحین کا اس بارے اختلاف ہے کہ سنت، کتاب کے علاوہ کوئی دین کا مصدر

ہے یا یہ دونوں ایک ہی مصدر ہیں۔ یہ بہت باریک نکتہ ہے کہ جسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ جمہور کا موقف یہ ہے کہ کتاب ایک علیحدہ مصدر دین ہے اور سنت ایک علیحدہ مصدر دین ہے جبکہ امام شاطبیؒ کا موقف یہ ہے کہ نہیں، کتاب وسنت ایک ہی مصدر ہے، یہ دو مصادر نہیں ہیں[1] اور امام شافعیؒ کا رجحان بھی اسی طرف معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی "کتاب الرسالۃ" میں بہت سی ایسی احادیث کہ جنہیں علماء کتاب اللہ پر اضافہ سمجھتے تھے، انہیں کتاب اللہ کا بیان ثابت کیا ہے۔

اس بات کو یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ جمہور کے نزدیک سنت، کتاب اللہ کے احکامات کی شرح اور بیان بھی ہے اور اس پر اضافہ بھی ہے کہ سنت میں بعض احکامات ایسے ہیں کہ جن کا ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے۔ امام شافعیؒ کا کہنا یہ ہے کہ سنت کل کی کل، قرآن مجید کا بیان ہے۔ یعنی سنت کا کوئی حکم ایسا نہیں ہے جو کتاب اللہ کی کسی آیت کی شرح اور بیان نہ ہو۔ امام شافعیؒ نے ایسی بہت سی احادیث کو کہ جنہیں لوگ کتاب اللہ پر اضافہ سمجھتے تھے، کتاب اللہ کا بیان ثابت کیا ہے۔

راقم کی رائے اس بارے یہ ہے کہ اگرچہ موقف دونوں درست ہیں کہ اصولی طور اللہ کے رسول ﷺ ہی دین کا مصدر ہیں۔ چاہے کتاب اللہ ہو یا سنت رسول ﷺ دونوں آپ ﷺ کی ذات ہی سے صادر ہوتے ہیں۔ لہذا آپ ﷺ کی سنت کو کتاب اللہ سے علیحدہ مصدر ماننے میں کوئی شرعی مانع موجود نہیں لیکن عملی بات امام شافعیؒ کی زیادہ صحیح ہے کہ سنت، کتاب اللہ کا بیان ہے اور یہ دونوں مل کر ایک ہی مصدر ہیں۔

سنت سے مراد اللہ کے رسول ﷺ کا قول، فعل اور تقریر ہے جو حدیث میں موجود ہے۔ اس مجلس کے بعد سے راقم کے سامنے جب بھی کوئی اہم سنت آتی ہے تو فوراً ذہن قرآن مجید کی کسی آیت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ یہ سنت اس آیت کا بیان ہے۔ پس صحیح بات یہی ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی احادیث کے ذریعے کتاب اللہ کو کھول کر بیان

[1] مصطفى بن حسني السباعي (المتوفى: 1384هـ)، السنة ومكانتها في التشريع الإسلامي، المكتب الإسلامي، دمشق، الطبعة الثالثة، 1402 هـ - 1982 م، ص 380

کیا ہے اور ہر حدیث، کسی نہ کسی آیت ہی کا بیان ہے۔

پس قرآن مجید الفاظ ہیں اور سنت ان الفاظ کا معنی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں لفظ اہم ہے اور سنت میں معنی۔ قرآن مجید میں لفظ کی حفاظت پر زور ہے اور سنت میں معنی کی۔ لفظ اور معنی کا تعلق لازم وملزوم کا ہے۔ جو لوگ سنت کا انکار کرتے ہیں، وہ صرف اللہ کے الفاظ کو قبول کرتے ہیں اور ان الفاظ سے اللہ کی مراد کو نکال کر اپنی مراد ڈال دیتے ہیں۔

قادیانیت، رافضیت، باطنیت، خوارجیت، اعتزال وغیرہ جیسی جتنی فکری گمراہیاں ہیں، سب کی بنیاد قرآن مجید ہے۔ اور قرآن مجید اسی وقت گمراہی کی بنیاد بن جاتا ہے جب اس کے الوہی معنی یعنی سنت کا انکار کر دیا جائے۔ اور پھر تو صرف الفاظ ہیں، اب آپ ان سے جو کھیل کھیلنا چاہیں، کھیل سکتے ہیں۔ اور اسی لیے خود قرآن مجید نے کہا ہے:

﴿يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا﴾[1]

"اس قرآن مجید کے ذریعے اللہ عزوجل بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو اسی سے ہدایت دیتا ہے۔"

سنت اور حدیث میں فرق

ایک دوست نے پوچھا کہ کیا سنت اور حدیث میں فرق ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں میں فرق ہے۔ انہوں نے پوچھا ہے کہ ماخذ دین سنت ہے یا حدیث؟ تو اس سوال کا جواب پہلے سوال کے جواب میں موجود ہے۔ اصل سوال پہلا ہے اور پہلے سوال کا جواب صحیح تصور دین کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ سلف صالحین کی اصطلاح میں سنت، اللہ کے رسول ﷺ کے قول، فعل اور تقریر کو کہتے ہیں[2] اور حدیث، اس سنت کی روایت کا نام

---

[1] البقرة: 2: 26

[2] وَأَمَّا مَعْنَاهَا شَرْعًا: أَيْ: فِي اصْطِلَاحِ أَهْلِ الشَّرْعِ فَهِيَ: قَوْلُ النبي صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَفِعْلُهُ وَتَقْرِيرُهُ [الشوكاني، محمد بن علي بن محمد بن عبد الله اليمني (المتوفى: 1250هـ)، إرشاد الفحول إلي تحقيق الحق من علم الأصول، دار الكتاب العربي، بيروت، الطبعة الأولى، 1419هـ - 1999م، 95/1]

ہے۔ پس سنت پہلے ہے اور حدیث بعد میں ہے۔ سنت آپ ﷺ کا قول، فعل اور تقریر ہے اور حدیث اس قول، فعل اور تقریر کے بیان کا نام ہے کہ جو صحابی کا ہوتا ہے۔[1] اس لیے صحیح اور ضعیف حدیث ہوتی ہے نہ کہ سنت کیونکہ سنت تو اللہ کے رسول ﷺ کا قول، فعل اور تقریر ہے تو وہ کیسے ضعیف یا موضوع ہو سکتا ہے؟ البتہ وہ حدیث ضعیف یا موضوع ہو سکتی ہے کہ جس میں سنت منقول ہو۔ سنت اور حدیث کے اس فرق کو ملحوظ نہ رکھنے کے سبب سے بہت سے لوگ بہت سی غلط فہمیوں کا شکار ہوئے۔

پس سنت مظروف ہے اور حدیث اس کا ظرف ہے۔ سنت مکین ہے اور حدیث اس کا مکان ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جب آپ اہمیت کی بات کریں گے تو اصل اہمیت مظروف اور مکین کی ہے نہ کہ ظرف اور مکان کی۔ لیکن یہ بھی واضح رہے کہ بعض اوقات مظروف اپنے ظرف سے پہچانا جاتا ہے اور مکین کا تشخص اس کا مکان بن جاتا ہے۔ لہذا دونوں کی اہمیت مسلم ہے۔

تو جہاں تک دوسرے سوال کا جواب ہے تو وہ یہی ہے کہ سلف صالحین کے نزدیک مصادر شریعت کتاب وسنت ہی ہیں نہ کہ کتاب وحدیث جیسا کہ جمیع مذاہب کی کتبِ اصول میں مصادر دین کی بحث کے تحت کتاب اللہ کے بعد سنت رسول ﷺ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اور ہمیشہ سے کتاب وسنت کی اصطلاح ہی مستعمل رہی ہے۔ کتاب سے مراد قرآن مجید ہے اور سنت سے مراد اللہ کے رسول ﷺ کا قول، فعل اور تقریر ہے۔ کتاب تو "مابین الدفتین" موجود ہے اور سنت کہاں ہے؟ یہ اہم سوال ہے کہ جس سے حدیث کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔ سنت کا صرف اور صرف ایک ہی مصدر ہے اور وہ احادیث کی کتب ہیں۔

ہمارے ہاں سنت اور حدیث میں فرق کے حوالہ سے دو غلط فہمیاں پیدا ہوئیں بلکہ جان بوجھ کر پیدا کی گئی ہیں۔ اور یہ دونوں غلط فہمیاں امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ نے پیدا کی

---

[1] فَحَقِيقَةُ الرِّوَايَةِ: نَقْلُ السُّنَّةِ وَنَحْوِهَا وَإِسْنَادُ ذَلِكَ إِلَى مَنْ عُزِيَ إِلَيْهِ بِتَحْدِيثٍ أَوْ إِخْبَارٍ أَوْ غَيْرِ ذَلِكَ [السيوطي، عبد الرحمن بن أبي بكر، جلال الدين (المتوفى: 911هـ)، تدريب الراوي في شرح تقريب النواوي، دار طيبة، الرياض، 26/1]

ہے اور اس کا سبب یہ بنا کہ حدیث ان کا میدان نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب مولانا عطاء اللہ حنیف رحمہ اللہ کو یہ خبر پہنچی کہ امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ تدبر قرآن کے بعد تدبر حدیث لکھ کر حدیث کی بھی خدمت کرنا چاہتے ہیں تو مولانا نے کہا کہ اللہ ان سے یہ خدمت نہ ہی لے تو بہتر ہے۔ اور وجہ یہی تھی کہ حدیث امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ کا میدان نہ تھا۔

امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ نے سنت سے مراد اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل لیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول اور تقریر اس سے نکال دیا[1] حالانکہ اصول فقہ کی تمام کتابوں میں جمیع مکاتب فکر کے اصولیین کے نزدیک سنت کی تعریف میں فعل کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول اور تقریر بھی شامل کیا گیا ہے۔ دوسری غلط فہمی جو امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ نے پیدا کی، وہ یہ ہے کہ سنت کا مصدر احادیث کی کتابیں نہیں ہیں۔ پس سنت ہمیں کہاں ملے گی؟ اس کا جواب اصلاحی صاحب کے ہاں یہ نہیں ہے کہ حدیث کی کتابوں میں بلکہ اس کا جواب ان کے ہاں یہ ہے کہ سنت ہمیں "تواتر عملی" میں ملے گی۔ حالانکہ اس امت میں بشمول امام مالک رحمہ اللہ کسی مذہب کے بانی کا یہ موقف نہیں رہا ہے کہ سنت ہمیں تواتر عملی میں ملے گی بلکہ سب نے اخبار آحاد ہی کو سنت کا ماخذ مانا اور قرار دیا ہے۔ اصلاحی صاحب کے اس تصورِ سنت کو غامدی صاحب نے ایک جامع فکر کی صورت میں نہ صرف پیش کیا بلکہ اس کی تشہیر بھی فرمائی۔[2]

پس سنت اور حدیث میں فرق معمولی ہے اور یہ فرق ایسا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو لازم وملزوم ہیں کہ سنت مکین ہے اور حدیث اس کا مکان ہے، سنت مظروف ہے اور حدیث اس کا ظرف ہے۔ یہ سلف کی اصطلاح میں ہے کہ جب وہ سنت کو بطور مصدر شریعت بیان کرتے ہیں تو اس سے یہی مراد لیتے ہیں۔ پس حدیث، سنت کا ماخذ اور مصدر ہے۔ اور سنت دین کا ماخذ اور مصدر ہے۔

---

[1] اصلاحی، امین احسن، مولانا، مبادی تدبر حدیث، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، 1994ء، ص 19، 28

[2] غامدی، جاوید احمد، میزان، المورد، لاہور، 2009ء، ص 13-15

تواتر عملی کی سند کہاں ہے؟

مکتب اصلاحی، فکر غامدی اور ان کے متاثرین کا کہنا ہے کہ دین، سنت میں ہے اور سنت، تواتر عملی میں ہے۔ لیکن سوال یہاں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ تواتر عملی کی سند کہاں ہے؟ امر واقعہ یہ ہے کہ یہ لوگ صرف لفظ استعمال کرنا جانتے ہیں لیکن اس لفظ پر انہوں نے کبھی غور نہیں کیا کہ وہ کیا استعمال کر رہے ہیں؟

تواتر عملی سے مراد وہ عمل ہے جو مسلم معاشرے میں نسل در نسل اور پے در پے ہو رہا ہو۔ آج مسلم معاشرے میں جو کچھ ہو رہا ہے، چاہے وہ پے در پے ہی کیوں نہ ہو، تو وہ مستند نہیں ہے کیونکہ اکثر بدعات اور معاصی پے در پے ہی ہوتی ہیں۔ اور اگر آپ بدعات اور معاصی کو بدعت اور معصیت کا عنوان دینا بھی چاہیں گے تو خبر کی بنیاد پر ہی دیں گے۔ لہذا کسی معاصر معاشرتی عمل کو سنت ثابت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی سند کو اللہ کے رسول ﷺ کے قدموں تک پہنچایا جائے۔

پس کسی عمل کو متواتر عملی کہنے کا مطلب یہ ہے اس عمل کو اللہ کے رسول ﷺ کے زمانے سے لے کر آج تک مسلسل ہر زمانے میں ثابت کیا جائے۔ آپ ﷺ سے لے کر آج تک تقریبا بتیس نسلیں اور چودہ صدیاں گزر چکی ہیں۔ پس ایک عمل، تواتر عملی سے ثابت ہے تو اسکا مطلب ہے کہ وہ امت مسلمہ کی تاریخ میں چودہ صدیوں میں ہر صدی میں رائج رہا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ چودہ صدیوں میں ایک عمل ہر صدی میں امت مسلمہ میں رائج رہا ہے اور میں اور آپ اس وقت چودھویں صدی میں ہیں تو ہمارے پاس پہلی تیرہ صدیوں میں جھانک کر دیکھنے کا کیا ذریعہ ہے کہ یہ عمل ان صدیوں میں بھی امت مسلمہ میں رائج تھا یا نہیں؟ اور اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ جو چودھویں صدی میں امت میں رائج ہے، وہ سب پہلی صدی ہی سے چلا آ رہا ہے؟ تو اس سے بڑی بے وقوفی کی بات نہ ہو گی۔

ماضی کے معاشروں کا تواتر عملی جاننے کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے، اور وہ خبر کا ذریعہ۔ اب اسے تاریخ کہہ لیں یا روایت، اس سے آپ کی جان نہیں چھوٹنے والی۔ ماضی

میں کسی عمل کا تواتر علمی سے ثابت ہونا بغیر خبر کے ممکن ہی نہیں ہے۔ لہذا جو حدیث کی خبر سے بھاگے ہیں، ان کے گلے تاریخ پڑ گئی ہے۔ اور اب تواتر عملی، تاریخ سے ثابت کرنے چلے ہیں۔ تو خبر اصل ہوئی یا تواتر عملی؟

کیا اللہ کا دین صحیح اور ضعیف ہو سکتا ہے؟

یہ وہ اعتراض ہے جو اکثر منکرین حدیث کی زبانوں پر ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر قرآن کی طرح حدیث بھی اللہ کا دین ہے تو اس میں صحیح اور ضعیف کا اختلاف کیوں ہے؟ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ حدیث کی طرح قرآن مجید میں بھی متواتر اور شاذ کا اختلاف موجود ہے۔

اگر آپ کے علم میں نہیں ہے تو حسن بصری متوفی 110ھ، ابن محیصن متوفی 123ھ، اعمش اسدی متوفی 148ھ اور یحیی یزیدی متوفی 202ھ کی مروی قراءات دیکھ لیں۔[1] ور یہ چاروں حضرات تو اتنے معروف ہیں کہ ان کی شاذ قراءات کے مصاحف بھی پبلش ہوتے ہیں۔ لیکن جس طرح شاذ قراءات کے وجود سے قرآن مجید مشتبہ نہیں قرار پاتا، اسی طرح موضوع روایات کے موجود ہونے سے مقبول احادیث پر طعن وارد نہیں ہوتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ احادیث کا ایک بڑا اور غالب ذخیرہ ایسا ہے کہ جس کی صحت وضعف میں اختلاف نہیں ہے اور کم احادیث ہیں کہ جن کی صحت وضعف کی بابت ائمہ سلف کا اختلاف ہوا ہے۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ جن احادیث کی صحت وضعف میں ائمہ سلف کا اختلاف نقل ہوا ہے، وہ احادیث اصول ومبادی دین سے متعلق نہیں ہیں بلکہ جزئیات اور فروعات سے بحث کرتی ہیں لہذا دین کے اصول ومبادی کل کے کل مقبول روایات سے ہی ثابت ہیں۔

چوتھی بات یہ ہے کہ ہم بار بار یہ واضح کر رہے ہیں کہ اللہ کا دین حدیث ہے یہ عوامی

---

[1] أبو الفتح عثمان بن جني الموصلي (المتوفى: 392هـ)، المحتسب في تبيين وجوه شواذ القراءات والإيضاح عنها، وزارة الأوقاف-المجلس الأعلى للشئون الإسلامية، المملكة العربية السعودية، 1420هـ- 1999م

بیان ہے جبکہ علمی بیان یہ ہے کہ اللہ کا دین حدیث میں موجود ہے یعنی اللہ کا دین سنت ہے جو حدیث میں موجود ہے لہذا حدیث کے صحیح اور ضعیف ہونے کا مطلب دین کی صحت اور ضعف نہیں ہے بلکہ دین کی اپنے شارع کی طرف نسبت کا صحیح یا ضعیف ہونا ہے۔اور نسبت کا صحیح یا ضعیف ہونا کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔

پانچویں بات یہ ہے کہ کسی حدیث کی صحت وضعف میں اختلاف مخاطبین کی جہت سے ہے نہ کہ خدا کی جہت سے۔ پس اگر قرآن مجید میں موجود اللہ کے دین اور حکم تک بذریعہ فہم پہنچنے میں مجتہدین اور فقہاء کا اختلاف ہو جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ تھوڑا ہے کہ شریعتیں دو ہیں۔ ہم یہ کہیں گے کہ اللہ کا حکم ایک ہی ہے لیکن بعض فقہاء نے اس کو پالیا اور بعض نہ پا سکے۔ اور اجر وثواب دونوں کے لیے ہے اگرچہ جس نے حکم پالیا اس کے لیے دو گنا اجر اور جس نے نہ پایا تو اس کے لیے ایک گناہ اجر ہے۔ پس جس طرح اللہ کی کتاب میں موجود حکم کو بذریعہ استدلال واستنباط پالینے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں، اسی طرح احادیث میں موجود اللہ کے حکم کے اثبات و نفی میں بھی دو رائیں ہو سکتی ہیں۔

آخری اور چھٹی بات یہ ہے کہ جب ہم کہتے ہیں کہ اللہ کا دین کتاب اللہ اور احادیث رسول ﷺ میں محفوظ ہے تو یہ من جملہ حفاظت کی بات ہوتی ہے۔ یعنی امت کے پاس وہ احادیث موجود ہیں کہ جن میں اللہ کا حکم ہے، لہذا کسی محدث نے اپنی تحقیق سے اس حکم کو پالیا اور کوئی نہ پا سکا کہ جس طرح اللہ کی کتاب میں موجود حکم کو کسی مجتہد نے پالیا اور کوئی اس کو نہ پا سکا۔ تو جس مجتہد نے اللہ کا حکم نہ پایا تو اس نے جو پایا ہے، وہ اللہ کا حکم نہیں ہے لیکن پھر بھی اس کے لیے ایک گنا اجر ہے۔ یہ گہری بات ہے اور یہی قاعدہ محدثین کے لیے بھی جاری ہوتا ہے۔

عہد نبوی اور عہد صحابہ میں احادیث کی کتابت

آغازِ اسلام میں اللہ کے رسول ﷺ نے احادیث لکھنے سے منع فرمایا تھا کہ اس میں کئی حکمتیں تھیں۔ ایک یہ کہ لوگ ابھی تک قرآن مجید کے اسلوبِ کلام سے مانوس نہ تھے لہذا وہ قرآن مجید کے ساتھ حدیث کو خلط ملط کر دیتے تھے۔ دوسرا یہ کہ شروع

اسلام میں قرآن مجید میں جن موضوعات کو زیر بحث لایا گیا، وہ عقائد، سابقہ اقوام کے قصص اور اخلاقیات تھیں کہ جن کی وضاحت کی ضرورت نہیں تھی۔ مکی سورتوں کے مضامین عموماً یہی ہیں لہذا مکہ کے ابتدائی تیرہ سالوں میں احادیث کی ضرورت نہ تھی، صرف قرآن مجید ہی کافی تھا۔ شریعت مدنی سورتوں میں مدینہ میں جا کر نازل ہوئی کہ جس کی تفصیل اور وضاحت اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی احادیث سے بیان فرمائی۔

صحیح مسلم کی ایک روایت کے مطابق شروع اسلام میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھ سے قرآن کے علاوہ کچھ نہ لکھو اور جس نے قرآن مجید کے علاوہ لکھا ہے، تو وہ مٹا دے۔[1] اس کے بعد جبکہ مسلمان قرآن مجید کے اسلوب کلام سے مانوس ہو گئے اور شرعی احکام کا نزول شروع ہو گیا تو آپ ﷺ نے احادیث لکھنے کی اجازت دے دی۔ سنن ابوداؤد میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے سوال کیا کہ میں آپ سے بہت سی باتیں سنتا ہوں، کیا انہیں لکھ لیا کروں؟ تو آپ ﷺ نے کہا کہ ہاں! لکھ لیا کرو۔ انہوں نے کہا کہ آپ کبھی خوش ہوتے ہیں اور کبھی غصے میں ہوتے ہیں [تو کیا ہر حال میں کہی ہوئی بات لکھ لیا کروں]۔ تو آپ ﷺ نے کہا کہ ہاں، اللہ کی قسم! میری زبان سے حق کے علاوہ کچھ جاری نہیں ہوتا [چاہے میں کسی حال میں بھی ہوں]۔[2]

صحیح بخاری کی ایک روایت کے مطابق ابو شاہ یمنی رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے درخواست کی تھی کہ جو باتیں انہوں نے فتح مکہ کے خطبہ عام میں آپ ﷺ سے سنی ہیں، وہ انہیں لکھ کر دے دی جائیں۔ تو آپ ﷺ نے صحابہ کو حکم دیا کہ ابو شاہ کو میرے خطبہ کی باتیں لکھ کر دے دو۔ اس کے علاوہ اور بہت سی احادیث ہیں کہ جن میں نبی ﷺ کے زمانے میں ہی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے احادیث لکھنے کا بیان ہے۔[3] صحیح بخاری ہی

---

[1] مسلم بن الحجاج أبو الحسن القشيري النيسابوري (المتوفى: 261هـ)، المسند الصحيح المختصر بنقل العدل عن العدل إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم، دار إحياء التراث العربي، بيروت، كِتَابُ الزُّهْدِ وَالرَّقَائِقِ، بَابُ التَّثَبُّتِ فِي الْحَدِيثِ وَحُكْمِ كِتَابَةِ الْعِلْمِ، 2298/4

[2] أبو داود، سليمان بن الأشعث بن إسحاق الأزدي (المتوفى: 275هـ)، سنن أبي داؤد، المكتبة العصرية، بيروت، كِتَاب الْعِلْمِ، بَابٌ فِي كِتَابِ الْعِلْمِ، 318/3

[3] محمد بن إسماعيل أبو عبدالله البخاري الجعفي، صحيح البخاري، دار طوق النجاة، مصر، الطبعة

کی ایک روایت کے مطابق حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے زیادہ کوئی بھی حدیث نبوی کو مجھ سے زیادہ جاننے والا نہیں تھا کیونکہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث لکھ بھی لیتے تھے اور یاد بھی کرتے تھے جبکہ میں صرف یاد رکھتا تھا اور لکھتا نہ تھا۔[1] حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ نے جب یہ سوال کیا کہ کیا آپ کے پاس قرآن مجید کے علاوہ بھی وحی کا علم ہے؟ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ بس قرآن مجید کا فہم ہے اور یہ ایک صحیفہ ہے۔ تو انہوں نے پوچھا کہ اس صحیفے میں کیا ہے؟ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ دیت، قیدیوں کو چھوڑنے اور کافر کے بدلے مسلمان کو قتل نہ کرنے جیسے احکامات ہیں۔[2] پس تربیت یافتہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ایک جماعت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہی احادیث کو لکھا کرتی تھی۔

حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے جو احادیث لکھی ہیں، اسے "الصحيفة الصادقة" کہتے ہیں، یہ حدیث کی پہلی کتاب تھی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہی مدون ہوئی اور محدثین میں نہ صرف اس کا تذکرہ عام ہے بلکہ بہت سے محدثین اپنی کتابوں میں اس سے روایات بھی لائے ہیں۔ اسی طرح حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کا صحیفہ اہم ہے کہ جو ان احادیث پر مشتمل ہے جو انہوں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھی۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کا صحیفہ اہم ہے کہ جو ان احادیث پر مشتمل ہے جو انہوں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھی۔ اسی طرح ہمام بن منبہ رحمہ اللہ نے حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے جو احادیث سنی تھیں، انہیں ایک صحیفہ میں جمع کر دیا جو کہ "صحيفة همام بن منبه" کہلاتا ہے۔ یہ کل 138 احادیث ہیں، اور اس صحیفے سے امام بخاری، امام مسلم، امام احمد رحمہم اللہ جیسے جلیل القدر محدثین نے احادیث لی ہیں۔[3] اس صحیفے کے دو قلمی نسخے، دمشق اور برلن، میں موجود ہیں کہ جن میں فرق نہیں ہے۔

الأولى، 1422هـ، كِتاب فِي اللُّقَطَةِ، بَابُ كَيْفَ تُعَرَّفُ لُقَطَةُ أَهْلِ مَكَّةَ، 125/3

[1] صحيح بخاري، كِتَابُ العِلْمِ، بَابُ كِتَابَةِ العِلْمِ، 34/1

[2] صحيح بخاري، كِتَابُ الجِهَادِ وَالسِّيَرِ، بَابُ فَكَاكِ الأَسِيرِ، 69/4

[3] محمد عجاج بن محمد تميم بن صالح بن عبد الله الخطيب، السنة قبل التدوين، دار الفكر، بيروت، الطبعة الثالثة، 1400 هـ - 1980م، ص 348-361

معروف محقق ڈاکٹر حمید اللہ رحمہ اللہ نے صحیفہ ہمام بن منبہ کو ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے کہ جس کا اردو ترجمہ مارکیٹ میں عام دستیاب ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا حجیت احادیث اور آثار صحابہ کے بارے موقف

حضرت الامام رحمہ اللہ نے اپنے ہاں دین کے مصادر کی جو تعداد اور ترتیب بیان کی ہے، وہ قرآن، حدیث اور قول صحابی ہے۔ ذیل میں حدیث کے حجت ہونے اور مصدر دین ہونے کے بارے میں علامہ صیمری متوفی 436ھ اپنی سند سے امام رحمہ اللہ کا ایک قول نقل کر رہے ہیں:

أُخْبُرُنَا أَبُو الْقَاسِم عبد الله بن مُحَمَّد الْبَزَّاز قَالَ ثَنَا مكرم قَالَ ثَنَا أَحْمد بن عَطِيَّة قَالَ ثَنَا ابْن سَمَّاعَة عَن أبي يُوسُف قَالَ سَمِعت أَبَا حنيفَة يَقُول إِذا جَاءَ الحَدِيث عَن النَّبِي صلى الله عَلَيْهِ وَسلم عَن الثِّقَات أَخذنَا بِهِ فَإِذا جَاءَ عَن أَصْحَابه لم نخرج عَن أقاويلهم فَإِذا جَاءَ عَن التَّابِعين زاحمتهم.[1]

"امام ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کو یہ کہتے سنا ہے کہ جب ثقہ راویوں سے اللہ کے رسول ﷺ کی کوئی حدیث ہم تک پہنچ جائے تو ہم اس کو پکڑ لیتے ہیں۔ اور اگر آپ ﷺ کے صحابہ سے کوئی بات ہم تک پہنچ جائے تو ہم صحابہ کے اقوال سے باہر نہیں نکلتے۔ اور جب تابعین کی بات آتی ہے تو ہم ان سے اختلاف کرتے ہیں۔"

اسی طرح امام ابن قیم رحمہ اللہ، نعیم بن حماد کی سند سے حدیث کی حجیت کے بارے میں امام صاحب کا قول نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

قَالَ نُعَيْمُ بْنُ حَمَّادٍ: ثنا ابْنُ الْمُبَارَكِ قَالَ: سَمِعْت أَبَا حَنِيفَةَ يَقُولُ: إذَا جَاءَ عَنْ النَّبِيِّ - صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - فَعَلَى الرَّأْسِ وَالْعَيْنِ، وَإِذَا جَاءَ عَنْ الصَّحَابَةِ نَخْتَارُ مِنْ قَوْلِهِمْ، وَإِذَا جَاءَ عَنْ التَّابِعِينَ

---

[1] الحسين بن علي بن محمد بن جعفر، أبو عبد الله الصَّيْمَري الحنفي (المتوفى: 436هـ)، أخبار أبي حنيفة وأصحابه، دار عالم الكتب، بيروت، الطبعة الثانية، 1405هـ - 1985م، ص 24

زَاحَمْنَاهُمْ.[1]

"عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جب کوئی بات اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہمارے پاس آجائے تو وہ ہمارے سر آنکھوں پر۔ اور جب صحابہ سے کوئی بات آئے تو ہم صحابہ کے اقوال میں سے کسی ایک قول کو اختیار کر لیتے ہیں اور جب تابعین کی بات آتی ہے تو ہم ان سے اختلاف رکھتے ہیں۔"

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک صحیح حدیث مطلقاً حجت ہے بلکہ وہ تو اس قدر روایت پسند ہیں کہ حدیث تو کجا صحابہ کے اقوال کی موجودگی میں بھی اپنے اجتہاد کا اظہار کرنا درست نہیں سمجھتے ہیں۔ اور پھر جس دین کی یہ شان ہو کہ اس کے جلیل القدر ائمہ کے اقوال کی اسناد تک محفوظ ہوں، تو عجب نہیں ہے کہ کچھ لوگ اس دین کے پیغمبر کے اقوال کے بارے شکوک وشبہات پیدا کر رہے ہوں۔

اور امام صاحب کے نزدیک صحیح حدیث وہی ہے جو کہ ثقہ راویوں سے مروی ہو جیسا کہ محدثین کے ہاں بھی حدیث کی صحت کا یہی معیار مقرر ہے۔ لہٰذا اس حوالے سے فقہاء اور محدثین کے منہج میں کوئی فرق نہیں ہے۔ فقہاء سے ہماری مراد متاخرین نہیں بلکہ بانیانِ مذاہب ہیں۔

خبر واحد سے دین کا قطعی علم ثابت ہوتا ہے

قرآن مجید اور احادیث دونوں اللہ کا دین ہے۔ اللہ نے اپنے دین کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے نہ کہ صرف قرآن مجید کی حفاظت کا۔ یہ دین ہمیں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے قطعی خبر کے ذریعے ملا ہے۔ جس طرح قرآن مجید کی خبر قطعی ہے، اسی طرح احادیث کی خبر بھی قطعی ہے کیونکہ قرآن مجید اور احادیث ایک ہی ذریعہ سے اس امت کو منتقل ہوئے ہیں اور وہ ذریعہ "خبر قطعی" کا ہے۔

[1] ابن قيم الجوزية، محمد بن أبي بكر بن أيوب بن سعد شمس الدين (المتوفى: 751هـ)، إعلام الموقعين عن رب العالمين، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى، 1411هـ - 1991م، 94/4

اور جس طرح فتنہ پروروں نے احادیث وضع کی ہیں، اسی طرح قرآن مجید بھی گھڑا گیا۔ جس طرح احادیث کی خبر میں "موضوع" اور "صحیح" کی مصطلحات موجود ہیں، اسی طرح قرآن مجید میں بھی "شاذ" اور "متواتر" کی اصطلاحات موجود ہیں۔[1] جس طرح محدثین نے احادیث میں "صحیح" کو "موضوع" سے جدا کیا، اسی طرح قراء کرام نے "متواتر" کو "شاذ" سے ممیز کیا۔

جس طرح احادیث میں طبقات المحدثین ہیں، اسی طرح قرآن مجید میں طبقات القراء ہیں۔[2] جس طرح احادیث کی خبر کی صحت کی شرائط منقول ہیں جو کہ عام طور محدثین کے نزدیک پانچ ہیں، اسی طرح قرآن مجید کی خبر کی صحت کی بھی شرائط منقول ہیں جو عام طور قراء کے نزدیک تین ہیں کہ جن کا ذکر ہم ایک مستقل مقالہ میں کر چکے ہیں جبکہ تفصیل کے لیے علامہ ابن الجزری رحمہ اللہ کی "منجد المقرئين ومرشد الطالبين" دیکھی جا سکتی ہے۔[3] جس طرح حدیث کی صحت کے اصول، اصولِ حدیث کی کتابوں میں منقول ہیں، اسی طرح قرآن مجید کی صحت کے اصول، علومِ قرآن کی کتب میں مذکور ہیں۔ پس جس طرح حدیث سند سے نقل ہوئی ہے، اسی طرح قرآن مجید بھی سند سے نقل ہوا ہے۔

اس موضوع پر کچھ دوستوں سے ہمارا ایک مکالمہ ہوا تھا کہ خبر واحد سے ثابت شدہ دین قطعی ہوتا ہے یا ظنی۔[4] ہمارا موقف یہ ہے کہ خبر واحد سے قطعی دین ثابت ہوتا ہے

---

[1] السيوطي، عبد الرحمن بن أبي بكر، جلال الدين (المتوفى: 911هـ)، الإتقان في علوم القرآن، الهيئة المصرية العامة للكتاب، مصر، 1394هـ/ 1974 م، 258/1

[2] جیسا کہ طبقات القراء کے بیان میں علامہ ابن الجزری رحمہ اللہ کی کتاب "غاية النهاية في طبقات القراء" اور امام ذہبی رحمہ اللہ کی کتاب "معرفة القراء الكبار على الطبقات والأعصار" معروف ہیں۔

[3] ابن الجزري، شمس الدين أبو الخير محمد بن محمد بن يوسف (المتوفى: 833هـ)، منجد المقرئين ومرشد الطالبين، دار الكتب العلمية، الطبعة الأولى، 1420هـ -1999م، ص 18

[4] یہ مکالمہ راقم اور مولانا زاہد صدیق مغل صاحب کے مابین فیس بک پر ہوا تھا۔ اس مکالمے میں اگرچہ بعد دوسرے حضرات کے کمنٹس بھی آ گئے جیسا کہ جناب قاری حنیف ڈار صاحب، جناب عمار خان ناصر صاحب، جناب ڈاکٹر خضر۔ یاسین صاحب، جناب محمد حسن صاحب، مولانا سرفراز فیضی صاحب، جناب شکیل بن حسن صاحب، جناب محمد امجد مغل صاحب وغیرہ لیکن اصلاً یہ میرے اور زاہد مغل صاحب کے مابین ہی رہا ۔ یہ مکالمہ مولانا زاہد صدیق مغل

کہ یہی سلف صالحین کا موقف ہے۔ سرِ دست اس مکالمے کے چند نکات یہاں رکھ رہا ہوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ خبر واحد، حدیث کے مترادف ہے اور حدیث کو خبر متواتر اور خبر واحد میں تقسیم کرنا بے کار کی تقسیم ہے۔ متواتر کی اصطلاح سے قطع نظر عملی صورت حال یہ ہے کہ ذخیرہ حدیث میں صرف ایک حدیث ایسی ہے کہ جسے محدثین نے متواتر مانا ہے بقیہ سب اخبار آحاد ہی ہیں لہذا ایک حدیث کے لیے اصطلاح وضع کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح متواتر کی اصطلاح سلف صالحین کی نہیں ہے، نہ ہی ائمہ اربعہ نے اسے استعمال کیا ہے۔ یہ یونانی اصطلاح ہے جو منطق کے رستے اصول فقہ میں داخل ہوئی۔ ہمارے سلف اس اصطلاح سے ناواقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابن الصلاح رحمہ اللہ نے اصول حدیث کی معروف کتاب "معرفة أنواع علوم الحديث" جو کہ مقدمہ ابن الصلاح کے نام سے بھی معروف ہے، میں لکھا ہے کہ متواتر محدثین کی اصطلاح نہیں ہے بلکہ یہ منطق کے رستے اصول فقہ میں آئی ہے اور وہاں سے خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے اسے اصول حدیث میں داخل کیا ہے۔[1]

دیکھیں! خبر کو متواتر اور آحاد میں تقسیم کرنے میں ہمیں اعتراض نہیں کہ "لا مشاحة في الاصطلاح" یعنی اصطلاح بنانے میں کنجوسی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ لیکن اگر آپ یہ کہیں کہ اس تقسیم کا مقصود یہ ہے کہ متواتر سے قطعی دین ثابت ہوتا ہے اور آحاد سے ظنی، تو پھر ہم یہی کہیں گے کہ یہ تقسیم سلف سے دکھائیں کیونکہ اب آپ اس تقسیم کے ذریعے دین کو تقسیم کر رہے ہیں۔ آپ کی حدیث کا کل ذخیرہ ہے ہی خبر

صاحب کی وال پر موجود ہے۔ میں نے وہاں سے بعینہ اٹھا کر اس کی امیج بنا کر اپنی وال پر تصویر کے طور پبلش کر دیا ہے۔ اور یہ 32 صفحات پر مشتمل ہے۔

[1] وَمِنَ الْمَشْهُورِ: الْمُتَوَاتِرُ الَّذِي يَذْكُرُهُ أَهْلُ الْفِقْهِ وَأُصُولِهِ، وَأَهْلُ الْحَدِيثِ لَا يَذْكُرُونَهُ بِاسْمِهِ الْخَاصِّ الْمُشْعِرِ بِمَعْنَاهُ الْخَاصِّ، وَإِنْ كَانَ الْحَافِظُ الْخَطِيبُ قَدْ ذَكَرَهُ، فَفِي كَلَامِهِ مَا يُشْعِرُ بِأَنَّهُ اتَّبَعَ فِيهِ غَيْرَ أَهْلِ الْحَدِيثِ، وَلَعَلَّ ذَلِكَ لِكَوْنِهِ لَا تَشْمَلُهُ صِنَاعَتُهُمْ، وَلَا يَكَادُ يُوجَدُ فِي رِوَايَاتِهِمْ، فَإِنَّهُ عِبَارَةٌ عَنِ الْخَبَرِ الَّذِي يَنْقُلُهُ مَنْ يَحْصُلُ الْعِلْمُ بِصِدْقِهِ ضَرُورَةً، وَلَا بُدَّ فِي إِسْنَادِهِ مِنِ اسْتِمْرَارِ هَذَا الشَّرْطِ فِي رُوَاتِهِ مِنْ أَوَّلِهِ إِلَى مُنْتَهَاهُ. وَمَنْ سُئِلَ عَنْ إِبْرَازِ مِثَالٍ لِذَلِكَ فِيمَا يُرْوَى مِنَ الْحَدِيثِ أَعْيَاهُ تَطَلُّبُهُ. [ابن الصلاح، عثمان بن عبد الرحمن، أبوعمرو، تقي الدين (المتوفى: 643هـ)، معرفة أنواع علوم الحديث، ويُعرف بمقدمة ابن الصلاح، دار الفكر المعاصر، بيروت، 1406هـ - 1986م، ص 267-268]

واحد۔ متواتر تو ایک اصطلاح ہے، بس! کہ جس کا اطلاق ڈھونڈے کو نہیں ملتا۔ محدثین کو صرف ایک روایت ملی ہے کہ جسے متواتر کہہ سکیں۔ ایک روایت کے لیے اصطلاح بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ اس لیے خبر واحد برابر ہے حدیث کے، یہ کہنا ٹھیک ہے کیونکہ کل ذخیرہ احادیث ہے ہی خبر واحد۔ خبر واحد اور متواتر میں حدیث کی تقسیم کے رستے دراصل حدیث سے ثابت شدہ دین کو ظنی قرار دیا جاتا ہے۔ اور یہ رویہ ہماری نظر میں خطرناک ہے۔

تواتر، تواتر، تواتر، ایک رانگ نمبر ہے، جس پر ابھی تک کسی کی کال نہیں ملی۔ اگر کسی کی کال ملی ہو تو صرف اتنا بتلا دے کہ کتنے ہوں تو تواتر حاصل ہوتا ہے؟ بس جس دن یہ بتلا دیا گیا کہ اتنوں سے تواتر حاصل ہوتا ہے، اس دن کال مل گئی۔ کچھ نے کہا کہ تواتر چار سے حاصل ہوتا ہے، کچھ نے پانچ، کچھ نے سات، کچھ نے دس، کچھ نے بارہ، کچھ نے چالیس، کچھ نے ستر اور کچھ نے تین سو تیرہ وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ اسی لیے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جمہور کا موقف یہ ہے کہ متواتر وہ ہے کہ جس سے علم قطعی حاصل ہو اور اس میں تعداد کا کوئی عمل دخل نہیں ہے کہ بعض اوقات خبر واحد سے بھی علم قطعی حاصل ہو جاتا ہے لہذا صحیحین کی اکثر روایات متواتر ہیں اور بعض اوقات جم غفیر کی خبر کا بھی کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔[1] خدا کے دین میں ذریعہ ثبوت کے اعتبار سے

---

[1] وَأَمَّا الْمُتَوَاتِرُ فَالصَّوَابُ الَّذِي عَلَيْهِ الْجُمْهُورُ: أَنَّ الْمُتَوَاتِرَ لَيْسَ لَهُ عَدَدٌ مَحْصُورٌ بَلْ إذَا حَصَلَ الْعِلْمُ عَنْ إخْبَارِ الْمُخْبِرِينَ كَانَ الْخَبَرُ مُتَوَاتِرًا وَكَذَلِكَ الَّذِي عَلَيْهِ الْجُمْهُورُ أَنَّ الْعِلْمَ يَخْتَلِفُ بِاخْتِلَافِ حَالِ الْمُخْبِرِينَ بِهِ. فَرُبَّ عَدَدٌ قَلِيلٌ أَفَادَ خَبَرُهُمْ الْعِلْمَ بِمَا يُوجِبُ صِدْقَهُمْ وَأَضْعَافُهُمْ لَا يُفِيدُ خَبَرُهُمْ الْعِلْمَ؛ وَلِهَذَا كَانَ الصَّحِيحُ أَنَّ خَبَرَ الْوَاحِدِ قَدْ يُفِيدُ الْعِلْمَ إذَا احْتَفَتْ بِهِ قَرَائِنُ تُفِيدُ الْعِلْمَ. وَعَلَى هَذَا فَكَثِيرٌ مِنْ مُتُونِ الصَّحِيحَيْنِ مُتَوَاتِرُ اللَّفْظِ عِنْدَ أَهْلِ الْعِلْمِ بِالْحَدِيثِ وَإِنْ لَمْ يَعْرِفْ غَيْرُهُمْ أَنَّهُ مُتَوَاتِرٌ؛ وَلِهَذَا كَانَ أَكْثَرُ مُتُونِ الصَّحِيحَيْنِ مِمَّا يَعْلَمُ عُلَمَاءُ الْحَدِيثِ عِلْمًا قَطْعِيًّا أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَهُ تَارَةً لِتَوَاتُرِهِ عِنْدَهُمْ وَتَارَةً لِتَلَقِّي الْأُمَّةِ لَهُ بِالْقَبُولِ. وَخَبَرُ الْوَاحِدِ الْمُتَلَقَّى بِالْقَبُولِ يُوجِبُ الْعِلْمَ عِنْدَ جُمْهُورِ الْعُلَمَاءِ مِنْ أَصْحَابِ أَبِي حَنِيفَةَ وَمَالِكٍ وَالشَّافِعِيِّ وَأَحْمَد وَهُوَ قَوْلُ أَكْثَرِ أَصْحَابِ الْأَشْعَرِيِّ كالإسفراييني وَابْنِ فورك؛ فَإِنَّهُ وَإِنْ كَانَ فِي نَفْسِهِ لَا يُفِيدُ إلَّا الظَّنَّ؛ لَكِنْ لَمَّا اقْتَرَنَ بِهِ إجْمَاعُ أَهْلِ الْعِلْمِ بِالْحَدِيثِ عَلَى تَلَقِّيهِ بِالتَّصْدِيقِ كَانَ بِمَنْزِلَةِ إجْمَاعِ أَهْلِ الْعِلْمِ بِالْفِقْهِ عَلَى حُكْمٍ مُسْتَنِدِينَ فِي ذَلِكَ إلَى ظَاهِرٍ أَوْ قِيَاسٍ أَوْ خَبَرِ وَاحِدٍ فَإِنَّ ذَلِكَ الْحُكْمَ يَصِيرُ قَطْعِيًّا عِنْدَ الْجُمْهُورِ وَإِنْ كَانَ بِدُونِ الْإِجْمَاعِ لَيْسَ بِقَطْعِيِّ؛ لِأَنَّ الْإِجْمَاعَ مَعْصُومٌ فَأَهْلُ الْعِلْمِ بِالْأَحْكَامِ الشَّرْعِيَّةِ لَا يَجْمَعُونَ عَلَى تَحْلِيلِ حَرَامٍ وَلَا تَحْرِيمِ حَلَالٍ كَذَلِكَ أَهْلُ الْعِلْمِ بِالْحَدِيثِ لَا يُجْمِعُونَ عَلَى التَّصْدِيقِ بِكَذِبِ وَلَا التَّكْذِيبِ بِصِدْقِ. وَتَارَةً يَكُونُ عِلْمُ أَحَدِهِمْ لِقَرَائِنَ تَحْتَفُ بِالْأَخْبَارِ تُوجِبُ لَهُمْ

قرآن مجید اور حدیث کے ذریعہ میں کوئی فرق نہیں رکھا گیا کیونکہ دونوں دین ہیں۔ دونوں سند سے نقل ہوئے ہیں۔ دونوں سند ہی سے حجت قرار پاتے ہیں۔ دونوں سند ہی کی بنیاد پر قطعی ہیں۔

باقی صحیح موقف یہ ہے کہ قرآن بھی قطعی ذریعے سے ثابت ہے اور حدیث بھی۔ اور وہ قطعی ذریعہ سند ہے۔ نمبروں کے کھیل کا تعلق اس تصورِ دین سے ہے جسے انسانوں نے بنایا ہے۔ اگر نمبروں کی گیم اتنی ہی اہم ہوتی تو اللہ عزوجل قرآن مجید میں ہی امت کو حکم دے دیتے کہ جب تک چار، دس، سترہ، تیس، چالیس، ستر، سو، تین سو تیرہ وغیرہ جتنی تعداد سے قرآن نہ سن لینا، اس وقت تک اس کے قرآن ہونے پر ایمان نہ لانا۔ جن لوگوں نے متواتر کی اصل تعداد کو بنایا ہے، وہ آج تک یہ واضح نہ کر سکے کہ چار سے تواتر حاصل ہوتا ہے، دس سے، سترہ سے، تیس سے، چالیس سے، ستر سے، سو سے، تین سو تیرہ سے، کتنوں سے؟ پھر تواتر کے لیے مطلوب تعداد کے اثبات کے لیے جو دلائل بیان کیے گئے ہیں، وہ بھی مذاق ہی ہیں جیسا کہ جن لوگوں کا قول ہے کہ پانچ سے تواتر حاصل ہوتا ہے تو انہوں نے کہا کہ اس کی دلیل یہ ہے کہ الوالعزم رسول پانچ ہیں۔ جنہوں نے کہا کہ سات سے تواتر حاصل ہوتا ہے تو انہوں نے کہا کہ اس کی دلیل یہ ہے کہ اصحاب کہف سات تھے۔ جنہوں نے کہا کہ دس سے تواتر حاصل ہوتا ہے تو ان کی دلیل یہ ہے کہ جمع قلت کے لیے کم از کم دس افراد کا ہونا شرط ہے۔ جنہوں نے کہا کہ بارہ سے تواتر حاصل ہوتا ہے تو انہوں نے کہا کہ بنی اسرائیل کے نقباء کی تعداد بارہ تھی۔ اور جنہوں نے کہا کہ چالیس سے تواتر حاصل ہوتا ہے تو ان کی دلیل یہ ہے کہ جمعہ قائم کرنے کے لیے چالیس افراد کا ہونا معتبر ہے۔ جنہوں نے کہا کہ ستر افراد سے تواتر حاصل ہوتا ہے تو ان کی دلیل یہ ہے کہ حضرت موسی علیہ السلام نے اللہ عزوجل سے ملاقات کے لیے اپنی قوم

الْعِلْمَ وَمَنْ عَلِمَ مَا عَلِمُوهُ حَصَلَ لَهُ مِنْ الْعِلْمِ مَا حَصَلَ لَهُمْ. [ابن تيمية، تقي الدين أبو العباس أحمد بن عبد الحليم الحراني (المتوفى: 728هـ)، مجموع الفتاوى، مجمع الملك فهد، المملكة العربية السعودية، 1416هـ/1995م، 18/40-41]

میں سے ستر افراد کا انتخاب کیا تھا۔ اور جنہوں نے کہا کہ تین سو تیرہ کی تعداد سے تواتر حاصل ہوتا ہے تو ان کی دلیل یہ ہے کہ اصحاب بدر کی تعداد اتنی تھی۔ اور جنہوں نے کہا کہ سات یا چودہ سو سے تواتر حاصل ہوتا ہے تو انہوں نے کہا کہ بیعت رضوان میں اتنے صحابہ تھے وعلی ہذا القیاس۔[1]

اگر خبر واحد سے دین کی قطعیت ثابت نہ ہوتی تو اللہ عزوجل ہر قوم کی طرف ایک رسول کیوں بھیجتے؟ اور رسول کی طرف وحی بھی ایک ہی فرشتہ کیوں لے کر آتا؟ پس اللہ کے رسول ﷺ کی خبر جو کہ آپ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو دی ہے، متواتر ہے، اس معنی میں کہ اس سے علم قطعی حاصل ہوتا ہے کہ قرآن مجید بھی اللہ کے رسول ﷺ کی خبر واحد ہی ہے۔

تواتر اگر محض انفارمیشن کے لیے ایک اصطلاح ہے تو ہمیں اصطلاحات سے کوئی مسئلہ نہیں ہے جیسا کہ خبر واحد کو تین حصوں مین تقسیم کر دیں: غریب، عزیز اور مشہور۔ لیکن اگر آپ کی اصطلاح سے تصورِ دین بگڑنے لگے تو ہم اس وقت اس اصطلاح کا رد کریں گے۔ لوگوں نے تواتر کی یونانی اصطلاح سے اللہ کے دین کو تقسیم کر دیا۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بات کو تقسیم کر دیا۔ قطعی کو ظنی بنا دیا۔

ایک ایسے دور میں بیٹھ کر قرآن مجید کے متواتر ہونے کی باتیں کرنا جبکہ مصاحف لاکھوں کی تعداد میں شائع ہو رہے ہوں، اور بات ہے۔ اور تابعین کے دور میں پہنچ کر یہ بات ثابت کرنا کہ انہیں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے قرآن مجید تواتر سے ملا ہے، اور بات ہے۔ وہاں تو ایک دوسرے کی قرآن کی وجہ سے تکفیر ہو رہی تھی۔ صحیح بخاری کی روایت کے مطابق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں آذربائیجان اور آرمینیہ کے محاذوں پر سپاہیوں میں قرآن مجید پڑھنے کے بارے جو اختلاف ہوا تھا تو سپہ سالار حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خط لکھ کر اس اختلاف کی اطلاع دیتے ہوئے کہا تھا کہ یہ اللہ کی

[1] إرشاد الفحول إلي تحقيق الحق من علم الأصول: 1/132-133

کتاب میں اختلاف کر رہے ہیں لہذا ان کو کسی بات پر جمع کر دیں۔[1] اس کے بعد جمع عثمانی کا معاملہ ہوا۔ پس خلاصہ یہ ہے کہ اگر تواتر سے مراد قطعیت ہے تو ہم اس کے قائل ہیں کہ قرآن مجید اور حدیث دونوں متواتر ہیں اور اگر مراد تعداد ہے تو آپ بیان کر دیں۔

تابعین کے دور میں اگر قرآن مجید کی کسی آیت کی تحقیق کے لیے کسی کو مکہ یا مدینہ نہیں جانا پڑا تو کسی حدیث کی تحقیق کے لیے بھی نہیں جانا پڑا۔ خلافت راشدہ میں جب ایک تابعی ایک صحابی سے قرآن مجید سنتے تھے، تو اس کے قرآن مجید ہونے کا ایمان رکھتے تھے۔ یہ نہیں تھا کہ جب تک ایک تابعی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے جم غفیر سے قرآن مجید نہیں سن لیتا تھا تو اس وقت تک اسے قرآن مجید نہیں مانتا تھا۔ خیر القرون کے بعد جب تحقیق کا دور شروع ہوا تو قرآن اور حدیث دونوں کی تحقیق ہوئی۔ طبقات المحدثین مرتب ہوئیں تو طبقات القراء بھی لکھی گئی۔ جب احادیث کی چھانٹ ہوئی تو قرآن بھی چھانٹ کر مرتب ہوا، اسی لیے تو موضوع، شاذ، ضعیف اور حسن قراءات وجود میں آئیں۔[2] یہ تو تاریخ قرآن کے موضوع کی بہت ہی بنیادی بات ہے۔ باقی ہمیں یہ فرق ضرور کرنا چاہیے کہ قرآن مجید کے نقل میں تلقی و تلاوت تھی جبکہ حدیث میں تحمل واداء۔ تلقی و تلاوت میں الفاظ اصل ہیں جبکہ تحمل واداء میں معنی کی اہمیت ہے۔ حدیث میں نہ تلقی تھی اور نہ ہی تلاوت۔ البتہ قرآن مجید اور حدیث دونوں کے منتقل ہونے کا ذریعہ ایک ہی تھا اور وہ قطعی سند تھی۔

ایک اور طرح سے بات کو سمجھیں تو یوں ہے کہ خبر میں دو پہلو ہوتے ہیں؛ جھوٹ اور سچ۔ جب ایک پہلو متعین ہو جائے تو اسے کہتے ہیں کہ خبر قطعی ہو گئی ہے یعنی دوسرا پہلو قطع ہو گیا، ختم ہو گیا۔ اور قطعیت کے لیے تعداد کا ہونا ضروری نہیں ہے، بس یہی ہمارا مقدمہ ہے۔ مثال کے طور آج میرے لیے امام مالک رحمہ اللہ کی المؤطا کی خبر قطعی ہے

---

[1] أَنَّ حُذَيْفَةَ بْنَ اليَمَانِ، قَدِمَ عَلَى عُثْمَانَ وَكَانَ يُغَازِي أَهْلَ الشَّأْمِ فِي فَتْحِ أَرْمِينِيَةَ، وَأَذْرَبِيجَانَ مَعَ أَهْلِ العِرَاقِ، فَأَفْزَعَ حُذَيْفَةَ اخْتِلاَفُهُمْ فِي القِرَاءَةِ، فَقَالَ حُذَيْفَةُ لِعُثْمَانَ: يَا أَمِيرَ المُؤْمِنِينَ، أَدْرِكْ هَذِهِ الأُمَّةَ، قَبْلَ أَنْ يَخْتَلِفُوا فِي الكِتَابِ اخْتِلاَفَ اليَهُودِ وَالنَّصَارَى [صحيح البخاري: 183/6]

[2] الإتقان في علوم القرآن: 1/258-281

کہ اس کے قلمی نسخے موجود ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ کے لیے امام نافع رحمہ اللہ کی خبر قطعی ہے۔ امام نافع رحمہ اللہ کے لیے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی خبر قطعی ہے۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے لیے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر قطعی ہے۔

پس میں تواتر کو مان رہا ہوں، لیکن یہ کہہ رہا ہوں کہ اس میں تعداد اصل نہیں ہے۔ اگر آپ تعداد کو نکال دیں تو مجھ میں اور آپ میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ لیکن اگر آپ تعداد پر حساس ہیں تو تعداد پھر آپ ہی بیان کریں گے کہ جس سے تواتر حاصل ہوتا ہے اور اس تعداد سے تواتر حاصل ہونے کی عقلی و نقلی دلیل بھی آپ کے ذمے ہے۔ اگر آپ کے نزدیک تعداد بھی تواتر کے مفہوم میں شامل ہے تو فرق یہ پڑے گا کہ میرے نزدیک تواتر ایک سے بھی حاصل ہو جائے گا جبکہ آپ کے نزدیک اس تعداد سے حاصل ہو گا جو آپ لوگ بیان کریں گے۔ پس ہمارے نزدیک تواتر سے مراد قطعیت ہے نہ کہ تعداد، لہذا امام مالک عن نافع عن عبد اللہ بن عمر ایک متواتر خبر ہے۔ یہ کہنے والا میں پہلا نہیں ہوں۔

خلاصہ یہ ہوا کہ خبر واحد اور متواتر کی تقسیم ہماری نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ تواتر سے مراد قطعیت ہو تو صحیح اصطلاح ہے، اگر تعداد ہو تو لا یعنی مصطلح ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ قطعیت، خبر کا خاصہ ہو یا مخاطب کا فیصلہ دونوں صورتوں میں ایک کی خبر سے بھی قطعیت حاصل ہو جاتی ہے۔ چوتھی بات یہ ہے کہ خبر تحقیق سے پہلے ظن کا فائدہ دیتی ہے اور تحقیق کے بعد یقین کا۔ بس جسے آپ خبر واحد کہتے ہیں، وہ ہر حال میں قطعی نہیں ہوتی، تحقیق کے بعد قطعی ہوتی ہے۔ پانچویں بات یہ ہے کہ کچھ اخبار آحاد ایسی ہیں جو تحقیق کے بغیر ہی قطعی ہیں اور یہی صحیح معنوں میں متواتر اخبار ہیں جیسا کہ مالک عن نافع عن ابن عمر۔ چھٹی بات یہ ہے کہ وہ خبر واحد جو کہ محتف بالقرائن ہو جیسا کہ صحیحین کی خبر واحد ہے یا جس خبر واحد کو تلقی بالقبول حاصل ہو تو یہ بھی عامی کے لیے بغیر تحقیق کے قطعی ہے اور صحیح معنی میں یہ بھی متواتر اخبار ہی ہیں۔ ساتویں بات یہ ہے کہ قرآن مجید کیسے ثابت ہو گا، یہ بھی قرآن ہی بیان کرے گا، کیونکہ یہ دین کا سب سے

بنیادی موضوع ہے۔ قرآن نے ہمیں یہ کہا ہے کہ اللہ کی کتاب جب تمہیں ایک شخص سے بھی پہنچے تو تم تحقیق کے بعد اس کو قبول کر لو۔ بس اس کے بعد ہمیں کسی خارجی ذریعہ کی ضرورت نہیں ہے۔

اور یہ دعوی درست نہیں ہے کہ قرآن مجید کے اثبات کے لیے سند کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ قرآن مجید کی بیس روایات میں سے کوئی ایک روایت بھی بغیر سند کے ثابت کر دیں۔ باقی قرآن کی اسناد کے لیے علامہ ابن الجزری رحمہ اللہ کی "النشر في القرءات العشر" دیکھ لیں۔[1] اب چونکہ قراء نے کتابوں میں اسناد نقل کر دی ہیں تو متاخرین کو ضرورت نہیں ہے کہ اسناد پڑھیں پڑھائیں۔ ورنہ علمی طور تو قرآن مجید جہاں بھی پڑھیں گے، اگر روایت حفص بھی پڑھیں تو استاد جی، چاہے حنفی ہوں یا اہل حدیث، شافعی ہوں یا مالکی، پہلے یہ بتائیں گے کہ یہ روایت حفص بھی "شاطبیہ" کے طریق سے ہے یا "طیبہ" کے طریق سے۔

اور آج بھی شائع شدہ قرآن، قاری قرآن کی تصدیق کا محتاج ہوتا ہے۔ اور جب تک قاری صاحب تصحیح کا سرٹیفکیٹ نہ دے دیں، اس وقت تک قرآن مجید شائع نہیں ہو سکتا۔ تو اصل قاری صاحب ہیں نہ کہ لکھا ہوا۔ اور قرآن بھی تو بیس روایات میں سے ایک روایت ہے، یعنی روایت حفص۔ پس جسے آپ قرآن کہتے ہیں، علمی زبان میں وہ قراءتِ عاصم اور روایتِ حفص ہے۔ باقی آج سند کی ضرورت نہ قرآن مجید کے لیے اس طرح ہے، نہ حدیث کے لیے۔ دورِ تدوین کے بعد تو سند ایک اعزاز ہے۔

علاوہ ازیں اس بات کو یوں بھی سمجھ سکتے ہیں کہ کیا صحابہ کے لیے خبر واحد سے ثابت شدہ شریعت قطعی تھی اور ہمارے لیے ظنی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں جب ایک صحابی کسی حدیث کو سنتا اور اپنے گھر، محلے اور قبیلے میں جا کر وہ حدیث بتلاتا تو کیا مخاطبین کے لیے قطعی دین ثابت ہو رہا تھا یا ظنی؟ اسی طرح اگر اکیلا صحابی قرآن مجید کی تدوین

[1] ابن الجزري، شمس الدين أبو الخير، محمد بن محمد بن يوسف (المتوفى : 833 هـ)، النشر في القراءات العشر، المطبعة التجارية الكبرى، مصر، 58-198

سے پہلے اپنے شہر کے لوگوں کو قرآن مجید پڑھائے تو وہ تو قطعی ہے اور اگر حدیث بتلائے تو وہ ظنی ہے؟ پس ایسا نہیں ہے کہ واسطہ بڑھ جانے سے ایک چیز قطعی سے ظنی بن جائے کہ قطعیت شیٔ کا خاصہ ہے نہ کہ واسطے کا۔ اور اسی طرح ایسا بھی نہیں ہے کہ قرآن مجید کو ایک شخص نقل کرے تو وہ تو قطعی کہلائے لیکن حدیث کو ایک شخص نقل کرے تو وہ ظنی کہلائے۔

ایک صحابی جب اللہ کے رسول ﷺ سے قرآن مجید کی آیات یا کوئی سورت سیکھتے تھے اور اپنے گھر میں اپنی اہلیہ کو جا کر سناتے تھے تو ان کی اہلیہ کے لیے قرآن مجید کی وہ آیات یا سورت اسی قطعیت کے ساتھ ثابت ہو رہی تھی جس قطعیت کے ساتھ اس صحابی رسول ﷺ کے لیے۔ مانا کہ نبی کریم ﷺ کے زمانے میں خبر واحد کی صورت میں ملنے والے قرآن مجید کے بارے لوگ آپ ﷺ سے تصدیق کر سکتے تھے کہ یہ قرآن مجید ہے بھی یا نہیں لیکن کیا کسی نے ایسی تصدیق کی؟ پس یہ کہنا کہ یہ ہو سکتا تھا، فلاں کر سکتے تھے، تو بھئی! ہو سکتا تھا، کر سکتے تھے، کوئی دلیل ہے کیا؟ کیا ہوا ہے، وہ بیان کریں۔ ورنہ تو ہر صحابی کا ہر فعل حجت بن جائے گا۔ پس قرون اولی میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے لیے جس ذریعہ سے قرآن مجید ثابت ہوتا تھا، اسی سے حدیث بھی ثابت ہوتی تھی۔ ہمارے لیے بھی ایسا ہی ہے۔ اور وہ ذریعہ سند ہے، بس!

اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اگر دو چار روایات میں ایک دوسرے سے روایت کو قبول نہیں کیا تو اس سے زیادہ مرتبہ ایک دوسرے سے قرآن کو بھی قبول نہ کیا۔ آرمینیہ اور آذر بائیجان کی جنگوں میں ایک دوسرے کے قرآن ہی کا تو انکار ہو رہا تھا۔ تو کیا اس انکار سے قرآن مجید ظنی ہو گیا تھا؟ ہر گز نہیں! آپ پہلے قطعی کا مفہوم ہضم کر لیں اور اس پر غور کر لیں کہ قطعیت خبر کا خاصہ ہے یا مخاطب کا فیصلہ۔ ہم نے یہ نہیں کہا کہ قطعی اور ظنی کی تقسیم نہیں ہے۔ ہم نے یہ کہا ہے کہ یہ کہنا غلط ہے کہ قرآن مجید قطعی اور حدیث ظنی ذریعے سے ثابت ہے۔ اللہ کے دین میں یہ تقسیم غلط ہے۔

اور قطعیت کے لیے اجماع کا ہونا ضروری نہیں ہے کہ قرآن مجید اس وقت بھی

قطعی تھا جبکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں اس کے بارے اختلافات ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب دنیا سے رخصت ہوئے تو قرآن پر اجماع نہیں تھا۔ اگر اس وقت قرآن مجید پر اجماع ہوتا تو جمع وتدوین قرآن کی ساری کہانی اور اس کی وجوہات واسباب سب جھوٹ تسلیم کرنا ہوگا۔ اجماع مصحف عثمانی پر ہوا ہے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں۔ اس سے پہلے قرآن مجید پر بہت اختلاف تھا جیسا کہ صحیح روایات میں موجود ہے۔ اس کے بیان کے لیے ابن ابی داؤد رحمہ اللہ کی کتاب المصاحف کافی ہے۔[1] لیکن اس اختلاف کا یہ مطلب نہیں تھا کہ قرآن مجید قطعی نہیں تھا۔

اسی طرح جب ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید کے علاوہ حدیث بھی دین ہے۔ جب یہ مان لیا تو اب پروردگار مجھے آدھا دین قطعی ذریعے سے دے اور آدھا ظنی ذریعے سے، یہ رانگ نمبر ہے۔ قرآن مجید اور حدیث نبوی ہر دور میں قطعی سند سے ثابت ہوتے رہیں ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ یہی تاریخی حقیقت بھی ہے اور فرد پر اتمام حجت کے لیے پروردگار کی دلیل بھی۔

خبر واحد سے ثابت شدہ عقیدہ قطعی ہے یا ظنی؟

مکتب فراہی اور فکر غامدی سے متاثر لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ خبر واحد سے کوئی عقیدہ ثابت نہیں ہوتا حالانکہ ایسی بات سلف صالحین میں سے کسی نے بھی نہیں کی ہے۔ روایتی مکاتب فکر میں خبر واحد جس طرح فقہی اعمال کا مصدر رہے، اسی طرح دینی عقائد کا بھی ماخذ ہے البتہ ان میں اس بارے اختلاف ہے کہ خبر واحد سے جو عقائد ثابت ہوتے ہیں، وہ قطعی ہیں یا ظنی ہیں۔ ہماری رائے میں خبر واحد سے ثابت شدہ عقائد قطعی ہیں کہ وہ عقیدہ ہی کیا ہے کہ جو ظن پر قائم ہو۔ عقیدہ اور اس کا ظنی ہونا، یہ دو متضاد باتیں ہیں۔ اگر وہ ظنی ہے تو وہ عقیدہ نہیں ہے اور اگر عقیدہ ہے تو ظنی نہیں ہو سکتا۔ چاہے آپ بغیر سوچے سمجھے زبان سے اس کو ظنی کہہ رہے ہوں لیکن آپ کا عمل اس کی قطعیت کی

---

[1] ابن أبي داود، أبو بكر عبد الله بن سليمان بن الأشعث الأزدي السجستاني (المتوفى: 316هـ)، كتاب المصاحف، الفاروق الحديثة، القاهرة، الطبعة الأولى، 1423هـ - 2002م

گواہی دے رہا ہو گا۔

وہ عقیدہ ہی کیا کہ جسے شک لاحق ہو۔ اور ظن تو کہتے ہی اس کو ہیں کہ جس میں شک کا پہلو مغلوب ہو۔ البتہ شک اور شبہے میں فرق ہے کہ شبہ عارضی ہوتا ہے لہذا ایک حال ہے نہ کہ صفت جبکہ شک تو ایسا خلجان ہے کہ جس میں سلب وایجاب میں سے کوئی بھی پہلو غالب نہ ہو سکے۔ مومن کو شبہ لاحق ہو سکتا ہے لیکن وہ شک میں مبتلا نہیں رہ سکتا۔ امام مالک، امام شافعی، امام احمد، امام ابن حزم اور حنفیہ کی ایک جماعت رحمہم اللہ کے نزدیک خبر واحد سے علم یقین حاصل ہوتا ہے نہ کہ محض ظن۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے جب سوال کیا گیا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ خبر واحد سے عمل تو واجب ہو جاتا ہے لیکن اس سے یقینی علم حاصل نہیں ہوتا تو انہوں نے جواب میں کہا کہ مجھے نہیں معلوم کہ یہ کہاں سے یہ بات لے آئے ہیں! [1]

خبر واحد سے کون سے اسلامی عقائد ثابت ہوتے ہیں؟ ذرا اس پر ہم کچھ روشنی ڈال دیتے ہیں۔ پھر جو ان عقائد کو ظنی سمجھتے ہیں، وہ ذرا اس پر غور کر لیں کہ ان کا یہ عقیدہ ہے بھی یا نہیں!

① اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء سے افضل ہیں۔

② میدان محشر میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم شفاعت کریں گے۔

③ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات جو احادیث میں نقل ہوئے ہیں۔

④ انسان اور کائنات کی ابتداء، جنات اور فرشتوں کی صفات، جنت اور جہنم کی صفات۔

⑤ عشرہ مبشرہ جنتی ہیں۔

⑥ قیامت والے دن جو میزان لگایا جائے گا، اس کے دو پلڑے ہوں گے۔

⑦ حوض کوثر پر ایمان، اور اس پر ایمان کہ جو حوض کوثر سے پانی پیے گا، کبھی بھی

---

[1] ابن قيم الجوزية، محمد بن أبي بكر بن أيوب بن سعد شمس الدين (المتوفى: 751هـ)، مختصر الصواعق المرسلة على الجهمية والمعطلة، دار الحديث، القاهرة، الطبعة الأولى، 1422هـ - 2001م، ص 553

پیاسا نہ ہو گا۔

⑧ قلم پر ایمان اور اس پر کہ قلم نے ہر شیء کو لکھ دیا ہے۔

⑨ اس پر ایمان کہ اللہ تعالی نے انبیاء کا جسم زمین پر حرام کر دیا ہے۔

⑩ امام مہدی کے خروج، دجال کی آمد، اور عیسی علیہ السلام کے نزول پر ایمان۔

⑪ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آسمانوں پر جانے اور اللہ کی ان نشانیوں پر ایمان جن کے دیکھنے کا ذکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی احادیث میں کیا۔ وغیرہ

حدیث کی درایتی تحقیق

حدیث کی درایتی تحقیق کی معاصر تحریک کو اس بارے دو بنیادی غلط فہمیاں لاحق ہوئیں۔ ایک یہ کہ ان کا خیال ہے کہ محدثین نے احادیث کی روایتی تحقیق کی ہے جبکہ درایتی نہیں لہذا ہمیں حدیث کی درایتی تحقیق کی ضرورت ہے۔ اور دوسری یہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے چند واقعات میں قلت تدبر کے نتیجے میں وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ صحابہ بھی درایت بمعنی عقل کی بنیاد پر احادیث کو رد کر دیتے تھے۔

پہلی غلط فہمی تو صحیح حدیث کی شرائط پر غور نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ محدثین نے احادیث کی روایت اور درایت دونوں اعتبارات سے جانچ پڑتال کی ہے۔ صحیح حدیث کی پہلی تین شرائط کا تعلق روایت اور آخری دو کا درایت سے ہے کہ شذوذ اور علت کی بحث متن میں زیادہ ہوتی ہے۔ اور علت کی بیسیوں قسمیں ایسی ہیں کہ جن کا تعلق متن سے ہوتا ہے اور اس کا اندازہ "کتب العلل" کے مطالعہ سے ہو جاتا ہے۔

پس محدثین نے احادیث کی اسناد اور متن دونوں کی تحقیق کے اصول وضع کیے اور ان دونوں پر اخبار آحاد کی جانچ پڑتال کی ہے۔ البتہ یہ واضح رہے کہ درایت یعنی متن کی تحقیق کا معنی و مفہوم محدثین کے ہاں کچھ اور ہے اور مکتب فراہی اور ان کے متاثرین کے ہاں کچھ اور ہے۔

ہمارے استاذ ڈاکٹر حافظ حمزہ مدنی صاحب نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ بعنوان "علم حدیث میں اسناد و متن کی تحقیق کے اصول" میں استدراکات صحابہ پر بہت عمدہ عقلی

و منطقی گفتگو فرمائی ہے اور معاصر محققین میں سے مولانا فراہی رحمہ اللہ، مولانا اصلاحی رحمہ اللہ، غامدی صاحب، پروفیسر تقی امینی صاحب اور جناب عمار خان ناصر صاحب کے حدیث کی درایتی تحقیق کے بارے نظریات کا خوب تعاقب فرمایا ہے۔ ششماہی "رشد" کے حالیہ دو شماروں جنوری اور جولائی 2015ء میں حدیث کی درایتی تحقیق کے بارے صحیح فکر پر مشتمل قابل قدر مضامین شائع کیے گئے ہیں۔

دوسری غلط فہمی کی بنیاد دوہرا معیار ہے۔ یعنی جب پہلے سے ذہن میں یہ طے ہو کہ ہم نے ان احادیث کو قبول نہیں کرنا تو انسانی ذہن قابل توجیہ واقعات میں بھی اعتراضات تلاش کر لیتا ہے۔ یہی کام مستشرقین میں سے نولڈکے، رچرڈ بیل اور آرتھر جیفری نے قرآن مجید کے ساتھ کیا ہے۔ اور انہوں نے قرآن مجید کے متن کی تحقیق اس کے متن سے کی ہے کہ جسے وہ "انتقاد اعلی کے اصول" (Principle of Higher Criticism) کا نام دیتے ہیں۔ مستشرقین کی ایک جماعت قرآن مجید کی درایتی تحقیق سے یہ نتیجہ نکالتی ہے کہ یہ خدا کا کلام نہیں ہو سکتا ہے۔[1] اور ہم مستشرقین کے

[1] Harald Motzk, "Alternative accounts of the Quran's formation", in The Cambridge Companion to the Quran, ed. Jane Dammen McAuliffe, UK: Cambridge University Press, 2006,pp. 59-71

Higher Critical scholarship of the Koran, using methodologies adapted from biblical criticism, is still largely confined to scholars working in Western universities. So, sensitive is this area for Muslims that `Ibn Warraq′, a Muslim-born writer trained in Arabic who accepts the findings of radical Western scholarship, has felt it necessary to publish his work under a pseudonym. [Malise Ruthven, Fundamentalism: A Very Short Introduction, London: Oxford University Press, 2007, p. 49]

As Richard Bell and Montgomery Watt argue in their scholarly Introduction to the Quran: The assumption that God is himself the speaker in every passage leads to difficulties. [Ibid., p. 50]

The Egyptian academic Nasr Abu Zaid, who ventured to use modern literary critical methodology in his approach to the Koran, was forced into exile. Higher criticism of the Koran, where the text is deconstructed in accordance with methods developed by biblical scholars since the 18th century, is still

اعتراضات کے بھی جوابات اپنی ایک مستقل تصنیف میں دے چکے ہیں۔

ہمیں یہ نہیں کہنا کہ حدیث کی درایتی تحقیق کا مطالبہ کرنے والے مستشرقین سے متاثر ہیں بلکہ یہ کہنا ہے کہ جب انسانی ذہن پہلے سے ایک متن (text) کے مقام اور مرتبے کا تعین کر چکا ہوتا ہے تو اس کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کا سوچنے کا انداز بالکل ایک جیسا ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی درایتی تحقیق کے دعوی کے نتیجے میں قرآن مجید کا انکار اور حدیث کی درایتی تحقیق کے دعوی کے نتیجے میں احادیث کا انکار کرنے والوں کا سوچنے کا انداز بالکل ایک جیسا ہے یعنی ان کے ذہنی پیٹرن ملتے ہیں۔ اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ دونوں کی تحقیق ان کے خیال میں غیر جانبدارانہ ہے۔ حدیث کے معاصر درایتی محققین کا بس یہ ایمان ہے کہ انہوں نے قرآن مجید کی درایتی تحقیق نہیں کرنی ہے ورنہ وہ بھی مستشرقین کے نتائج کے حامل ہوں گے لہذا یہ درایتی محققین جب قرآن مجید کے معاملے میں ویسے ہی جانبدار ہیں جیسا کہ روایت پسند حدیث کے معاملے میں، تو یہ روایت پسندوں کو حدیث کے معاملے میں جانبداری کا طعنہ کیسے دے سکتے ہیں؟

ایک ملحد سے احادیث کے معانی پر مکالمہ

ملحد (atheist) کس طرح احادیث کو اپنے معانی پہناتے ہیں تو اس بارے ایک مکالمہ راقم اور ایک ملحد غلام رسول کے درمیان ہوا۔ راقم نے اس مکالمے کی امیج فائل اپنی فیس بک وال پر شیئر کی ہے۔ غلام رسول، ظاہری بات ہے کہ فیس بک پر اس ملحد کا فرضی نام ہے جبکہ وہ ایک ملحدانہ فیس بک پیج کا ایڈمن ہے اور فیس بک کی دنیا میں کافی معروف شخصیت ہے۔ غلام رسول صاحب نے اپنے پیج پر ایک حدیث شیئر کی کہ جس میں حدیث کا ترجمہ ایسا لگایا جو کہ بنتا نہیں تھا اور اپنے اسی ترجمے سے وہ صاحب اس حدیث میں عریانی اور فحاشی ثابت کر رہے تھے۔

---

very largely confined to scholars who are not Muslims. Examples include the work of John Wansbrough, Patricia Crone, and Gerald Hawting, Western scholars of Islam who do not accept the traditional view of its origins as related in the earliest texts. [Ibid., pp. 40-41]

اس مکالمے کا حاصل یہ ہے کہ ملحدین اور منکرین کس طرح حدیثوں کا معنی تبدیل کرتے ہیں اور اپنے ذہن کا گند احادیث سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب ان سے پوچھا جائے کہ انہوں نے اس حدیث کا یہ معنی کیسے کیا ہے؟ گرامر اور زبان کے کن اصول وضوابط کی روشنی میں کیا ہے؟ تو امر واقعہ یہ ہے کہ ان کے پاس اس کا کوئی علمی جواب نہیں ہوتا کہ انہوں نے یہ معنی کیوں کیا ہے؟

پس اگر آپ احادیث کا صحیح ترجمہ کر دیں تو محض صحیح ترجمہ بیان کر دینے سے ملحد اور منکر حدیث کا وہ اعتراض رفع ہو جاتا ہے کہ جسے وہ اپنے تئیں کوئی علمی اعتراض سمجھ رہا ہوتا ہے۔ اس کیس میں بھی حدیث پر اعتراض کی صرف ایک ہی بنیاد تھی اور وہ اس ملحد کا کیا ہوا ترجمہ تھا۔ جیسے ہی اس کے ترجمے پر سوالیہ نشان کھڑا ہوا اور وہ اپنے ترجمے سے رجوع کرنے لگا تو حدیث پر سے اعتراض بھی رفع ہو گیا۔ ملحد کا ترجمہ یہ تھا:

> "عروہ بن الزبیر سے روایت ہے۔ حضرت عائشہ نے کہا۔ مجھے معلوم نہ ہوا کہ اچانک زینب بنت جحش میرے گھر بغیر اجازت کے آ گئیں وہ غصہ میں تھیں انہوں نے کہا یا رسول ﷺ میں سمجھتی ہوں جب ابو بکر کی چھوکری اپنے قمیض الٹے تو وہ آپ ﷺ کو کافی ہے۔" [سنن ابن ماجہ، حدیث 1982][1]

جبکہ اس حدیث کا عربی متن یہ ہے:

> «عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ، قَالَ: قَالَتْ عَائِشَةُ: مَا عَلِمْتُ حَتَّى دَخَلَتْ عَلَيَّ زَيْنَبُ بِغَيْرِ إِذْنٍ وَهِيَ غَضْبَى، ثُمَّ قَالَتْ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، أَحَسْبُكَ إِذَا قَلَبَتْ بُنَيَّةُ أَبِي بَكْرٍ ذُرَيْعَتَيْهَا»[2]

ملحد نے اس روایت میں موجود «بُنَيَّةُ» کے لفظ کا ترجمہ چھوکری اور «ذُرَيْعَتَيْهَا» کا ترجمہ قمیص کیا ہوا ہے؟ جب میں نے ملحد کو اس بات پر پکڑا کہ چھوکری کسی عربی لفظ کا ترجمہ کیا ہے تو وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگا اور کہنے لگا کہ میں نے تو فلاں

---

[1]Retrieved 2 February, 2016 from Pakistani Free Thinkers Facebook Page. For detail please visit my Timeline "Hm Zubair" post on 2 February, 2016.

[2] سنن ابن ماجة: 637/1

مترجم سے ترجمہ لیا ہے۔ میں نے کہا کہ جو ترجمہ آپ نے کیا ہے، وہ کسی ایک مترجم سے دکھادو۔ اب اسے وہ بھی نہ ملے۔ دراصل اس نے کیا یہ تھا کہ مختلف ترجموں کو ملا کر ایک ترجمہ بنالیا تھا۔ یعنی جس ترجمے میں اس کے ذہنی گند کے مناسب کوئی لفظ اسے مل گیا، اس نے وہ اٹھالیا اور ایک ترجمہ بنالیا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ احادیث کی کتابوں کے مترجمین کو الفاظ کے انتخاب میں احتیاط کرنی چاہیے کہ اسلام مخالفین عناصر ان کے تراجم کو منفی مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اور ہماری رائے میں کتبِ احادیث کے بہت سے تراجم کو نظر ثانی کی ضرورت ہے کہ اس کی کافی ساری مثالیں ہیں کہ حدیث کا مناسب ترجمہ نہ ہونے کی وجہ سے ملحدین اور منکرین کو اعتراض کا موقع مل گیا جیسا کہ کچھ مثالیں ہم آگے چل کر بیان بھی کریں گے۔

منکرین حدیث کی شطحیات

منکرین حدیث، حدیث کے انکار میں کس حد تک اخلاقی اور علمی طور گر سکتے ہیں کہ اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ انعام رانا صاحب[1] نے اپنی فیس بک وال پر ڈاکٹر شبیر احمد کے حوالے سے کچھ ایسی احادیث نقل کی ہیں کہ جو ان کی نظر میں واہیات احادیث ہیں۔ ان میں سے ایک روایت یہ بھی ہے جو انہوں نے بیان کی ہے:

"ایک شخص نے حضور (ص) سے تنہا ہونے کی شکایت کی۔ کہا کبوتری کو زوجہ بنالو۔" [ابن القیم، المنار الحنیف، ص106][2]

اب یہ صاحب اپنی وال پر یہ نقل کر کے عام لوگوں کو یہ کہہ رہے ہیں کہ احادیث پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ ایسی باتوں کو اللہ کے رسول ﷺ کے اقوال مان لو۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ان صاحب کو اس کتاب کا صحیح نام بھی لکھنا نہیں آتا کہ جہاں سے وہ حدیث نقل کر رہے ہیں۔ چلیں! مان لیا کہ ٹائپنگ کی غلطی ہے لیکن اگر کتاب کا مکمل

[1] پیشے کے اعتبار سے وکیل ہیں، لندن میں مقیم ہیں اور مکالمہ کے نام سے ایک ویب سائیٹ کے ایڈیٹر ہیں۔

[2] Retrieved 2 February, 2016 from Inam Rana Sb Facebook Page. For detail please visit my Timeline "Hm Zubair" post on 2 February, 2016.

نام نقل کر دیتے تو وہ فحش غلطی نہ کرتے جو کہ یہ کر چکے ہیں۔ اس کتاب کا مکمل نام "المنار المنيف في الصحيح والضعيف" ہے کہ جس میں امام ابن قیم رحمہ اللہ نے ضعیف احادیث کو صحیح سے علیحدہ کیا ہے۔

اب امام ابن القیم رحمہ اللہ نے یہ روایت نقل کرنے سے پہلے لکھا ہے کہ کبوتروں کے بارے تمام روایات ضعیف اور موضوع ہیں اور اس کے بعد انہوں نے ان ضعیف اور موضوع روایات کا ذکر کیا ہے جو کبوتروں کے بارے نقل ہوئی ہیں۔ اور جناب ڈاکٹر شبیر احمد صاحب نے امام ابن القیم رحمہ اللہ کی کتاب سے یہ روایت بغیر سمجھے اٹھالی ہے اور اب ان کے مقلدین بھی بغیر سمجھے اسے نقل کیے جا رہے ہیں۔ اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ جواب دوناں! جواب دوناں! کی رٹ لگا رکھی ہے۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ کی اصل عبارت ملاحظہ ہو:

فَصْلٌ فِي ذِكْرِ جَوَامِعِ وَضَوَابِطِ كُلِّيَّةٍ فِي هَذَا الْبَابِ: فَمِنْهَا أَحَادِيثُ الْحَمَامِ -بِالتَّخْفِيفِ- لا يَصِحُّ مِنْهَا شَيْءٌ. وَمِنْهَا حَدِيثِ "كَانَ يُعْجِبُهُ النظر إلى الحمام"...وَحَدِيثِ "شَكَا رَجُلٌ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْوَحْدَةَ فَقَالَ لَهُ: لَوِ اتَّخَذْتَ زَوْجًا مِنَ حَمَامٍ فَآنَسَكَ ".[1]

"اس فصل میں ہم ضعیف روایات کے بارے کچھ کلیات اور ضوابط کا تذکرہ کریں گے۔ ان کلیات میں سے ایک کلیہ یہ ہے کہ کبوتر کے بارے مروی تمام روایات ضعیف ہیں۔ ان ضعیف روایات میں سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو کبوتر دیکھنا پسند تھا... اور ان ضعیف روایات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایک شخص نے آپ سے تنہائی کی شکایت کی ہے تو آپ نے اسے کہا کہ تم کبوتر کو اپنی بیوی بنالو تو تمہاری تنہائی دور ہو جائے گی۔"

علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو اپنی کتاب "الموضوعات" میں نقل کیا ہے۔ اور اگر اس کتاب کا اردو ترجمہ ہو جائے تو یقین مانیے کہ حدیث پر اعتراض کرنے

[1] ابن قيم الجوزية، محمد بن أبي بكر بن أيوب بن سعد شمس الدين (المتوفى: 751هـ)، المنار المنيف في الصحيح والضعيف، مكتبة المطبوعات الإسلامية، حلب، الطبعة الأولى، 1390هـ/1970م، ص 106

والوں کا بنیادی مصدر قرار پائے کہ کتاب کے نام اور موضوع پر غور کیے بغیر تھوک کے حساب سے حدیثوں پر اعتراضات کا ریکارڈ قائم کر دیں۔ اب معلوم نہیں، ان منکرین کو ہماری یہ بات سمجھ بھی آئی ہے یا نہیں۔ یہ منکرین جن احادیث پر اعتراضات قائم کرتے ہیں، ان کی بڑی تعداد ضعیف اور موضوع روایات پر مشتمل ہے کہ جنہیں پہلے ہی سے امت نے رد کر رکھا ہے۔

احادیث کے بارے قاری حنیف ڈار صاحب کے مغالطے

قاری حنیف ڈار صاحب نے آج کل اپنی وال سے احادیث کے بارے شکوک وشبہات کی تحریک چلا رکھی ہے کہ جس پر بعض دوستوں نے تبصرہ کرنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ عرض یہ ہے کہ محض اعتراض وارد کر دینے سے اگر کوئی کلام مشکوک ٹھہرتا تو سب سے پہلے اللہ کی کتاب مشکوک قرار پاتی کہ خود قرآن مجید کے بیان کے مطابق مشرکین مکہ کے اعتراضات میں سے یہ بھی تھا کہ جہنم میں زقوم کا درخت کیسے ممکن ہے؟ جہنم آگ کا دوسرا نام ہے اور اس میں درخت کا باقی رہنا ممکن نہیں ہے۔ پس محض اعتراض سے کوئی کلام مشکوک نہیں ہو جاتا بلکہ اعتراض کی نوعیت، معیار اور قوت دیکھی جاتی ہے۔

پس منکرین حدیث کا یہ قضیہ بہت ہی سطحی ہے کہ بخاری ومسلم انسانوں نے مرتب کی ہیں، اور انسانی کام میں غلطی کا امکان ہے، پس بخاری ومسلم غلط ہیں۔ اگر بخاری ومسلم انسانوں نے مرتب کی ہے تو قرآن مجید کس نے مرتب کیا ہے؟ کیا جو قرآن مجید ہمارے پاس اس وقت موجود ہے، وہ ہمیں براہ راست حضرت جبرئیل علیہ السلام سے موصول ہوا ہے؟ کیا اس قرآن مجید کو فرشتوں نے لکھ کر ایک کتاب کی صورت دی ہے؟ کیا اس قرآن مجید کو آسمانوں سے ایسے ہی نازل کیا گیا تھا کہ جس صورت میں اب یہ ہمارے پاس ہے یعنی وزارت اوقاف کے رجسٹرڈ قاریوں کی مہرِ تصدیق کے ساتھ؟

بلاشبہ انسانوں نے ہی اس قرآن مجید کو یاد کیا، انسانوں نے ہی اس قرآن مجید کو نقل

کیا، انسانوں نے ہی اس کو لکھا ہے، انسانوں نے ہی اس کے حرکات اور اعراب لگائے، انسانوں نے اس کے نقطے، رموز اور اوقاف ایجاد کیے، انسانوں نے اس کو رکوعوں اور پاروں میں تقسیم کیا، انسانوں نے ہی اس کو کتابی صورت دی، تو کیا انسانی کام میں غلطی نہیں ہو سکتی؟

یہاں سے ملحد اور مومن میں فرق ہو جاتا ہے۔ ملحد اور مستشرق یہ ثابت کرتا ہے کہ قرآن مجید کی تالیف وتدوین ایک انسانی کام ہے لہذا اس میں غلطیاں ہوئی ہیں۔ اور ملحدین کی دو صد تحریریں، جو ہمارے علم میں ہیں، اس مقدمے کو ثابت کرنے کے لیے موجود ہیں۔ لیکن مومن کا ایمان یہ ہے کہ یہ سب کچھ انسانوں نے ہی کیا ہے لیکن خدا نے ان سے کروایا ہے لہذا غلطی کا امکان نہیں ہے۔ اور حدیث کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے کہ خدا نے اس کی تدوین انسانوں سے کروائی گئی ہے جبکہ اس کی حفاظت اللہ عزوجل نے اسی طرح فرمائی ہے جیسے قرآن مجید کی فرمائی ہے۔

اگر منکر حدیث کو حدیث پر یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ سورج اللہ کے عرش کے نیچے جا کر کیسے سجدہ کر سکتا ہے؟ تو ملحد کو قرآن مجید سے یہ شکایت ہے کہ قرآن کا سورج ایک گدلے پانی کے چشمے میں غروب ہوتا ہے؟ اگر منکر حدیث کو یہ اعتراض ہے کہ حضرت موسی علیہ السلام اپنی قوم کے سامنے بے لباس ہو گئے تھے تو ملحد کو قرآن سے یہ شکایت ہے کہ آدم اور حوا علیہما السلام اپنے دشمن کے سامنے بے لباس ہو گئے؟ اگر منکر حدیث کو یہ اعتراض ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم چھوٹی عمر کی لڑکی سے کیسے نکاح کر سکتے ہیں؟ تو ملحد کو یہ شکایت ہے کہ خدا چھوٹے بچے کے قتل کا حکم خضر علیہ السلام کو کیسے دے سکتا ہے؟ اگر منکر حدیث کو یہ اعتراض ہے کہ مرتد کی سزا قتل کیسے ہو سکتی ہے؟ تو ملحد کو قرآن مجید سے یہ شکایت ہے کہ بچھڑے کی پوجا کرنے پر توبہ کی یہ صورت کہ آپس میں ہی ایک دوسرے کی گردنیں اڑائیں، کیسے خدا کی طرف سے ہو سکتی ہے؟ وعلی ہذا القیاس، حدیث پر کوئی اعتراض ایسا نہیں ہے جو قرآن مجید پر بھی وارد نہ ہوتا ہو۔

ہمارے علم کی حد تک غلام احمد پرویز صاحب، جناب قاری حنیف ڈار صاحب سے

زیادہ ذہین، زیادہ محنتی اور زیادہ علم رکھنے والے تھے۔ یقین نہ آئے تو ان کی کتابیں اٹھا کر دیکھ لیں۔ لیکن آج کتنے لوگ ان کے پیروکار ہیں؟ ہاں! لوگ پرویز صاحب کو جانتے ہوں گے، بہت لوگ جانتے ہوں گے، لیکن کن الفاظ میں؟ اور احادیث پر ایمان لانے والے آج بھی لاکھوں نہیں کروڑوں میں ہیں جیسا کہ ماضی میں ہر دور میں رہے ہیں اور علی وجہ البصیرۃ رہے ہیں۔

دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ منکرین حدیث میں سے کتنے ہیں کہ جنہوں نے قرآن مجید کا دفاع کیا ہو؟ امر واقعہ یہ ہے کہ ملحدین اور مستشرقین نے قرآن مجید پر جو کیچڑ اچھالا ہے، اس کا بھی علمی و تحقیقی جواب سینکڑوں کتب و مقالات کی صورت میں اگر کسی نے دیا ہے تو یہ وہی لوگ ہیں جو حدیثوں پر ایمان رکھنے والے ہیں۔ باقی یہ بات درست ہے کہ لوگوں کی ایک جماعت تماش بین ہوتی ہے کہ جہاں مداری کا تماشا دیکھیں گے، جمع ہو جائیں گے اور لائنک مار چھوڑیں گے۔ لیکن یہ ہجوم ہمیشہ عارضی ہوتا ہے اور ثبات ہمیشہ حق کے لیے ہی ہوتا ہے۔

امام ابن شہاب زہری رحمہ اللہ ائمہ محدثین، مفسرین اور فقہاء کی نظر میں

قاری حنیف ڈار صاحب نے اپنے پیش رو مفکرین کے اس اعتراض کو شد و مد کے ساتھ دہرایا ہے کہ تابعین کے دور میں احادیث کو سب سے زیادہ نقل کرنے والے امام ،ابن شہاب زہری رحمہ اللہ ناقابل اعتبار شخصیت ہیں لہذا حدیث کا اکثر ذخیرہ ناقابل اعتماد ہے۔[1] ہم ذیل میں امام ابن شہاب زہری رحمہ اللہ (متوفی ۱۲۵ھ) کے بارے میں ائمہ جرح وتعدیل، ائمہ محدثین اور ائمہ فقہاء اور ان کے معاصر علماء کی آراء نقل کر رہے ہیں کہ جس سے منکرین حدیث کے اس اعتراض کی حقیقت واضح ہو جائے گی۔

حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ فرماتے ہیں: عليكم بابن شهاب هذا فإنكم لا

---

[1] ڈاکٹر غلام جیلانی برق صاحب کا تو انکار حدیث سے رجوع صریح ہے لیکن علامہ تمنا عمادی کے بارے بھی بعض محققین کا کہنا ہے کہ انہوں نے بھی اپنے انکار حدیث کے موقف سے رجوع کر لیا تھا۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: محمد تنزیل الصدیقی الحسینی، کیا علامہ تمنا عمادی منکر حدیث تھے؟، مجلہ الواقعہ، کراچی، شمارہ 1، اپریل 2012ء

تلقون أحدا أعلم بالسنة الماضية منه۔ تم ابن شہاب کو لازمی پکڑو (ان سے استفادہ کرو) کیونکہ گزری ہوئی سنن کے بارے میں ان سے بڑھ کر کوئی جاننے والا نہیں ہے۔

معروف تابعی قتادہ رحمہ اللہ (متوفی ۱۰۹ھ) فرماتے ہیں: ما بقی أحد أعلم بسنة ماضية من ابن شهاب۔ گزشتہ سنن کے بارے میں ابن شہاب سے زیادہ علم رکھنے والا کوئی بھی باقی نہیں رہا۔

تابعی مکحول رحمہ اللہ (متوفی ۱۰۹ھ) فرماتے ہیں: ما بقی علی ظهرها أحد أعلم بسنة ماضية من الزهري۔ زمین کی پشت پر گزری ہوئی سنت کے بارے میں زہری رحمہ اللہ سے بڑھ کر کوئی عالم باقی نہیں رہا ہے۔

ابو ایوب سختیانی رحمہ اللہ (متوفی ۱۳۱ھ) فرماتے ہیں: ما رأيت أعلم منه۔ میں نے ان سے بڑا عالم کوئی نہیں دیکھا۔

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بقی ابن شهاب وماله فی الناس نظير۔ ابن شہاب رحمہ اللہ باقی رہ گئے اور ان کی کوئی مثال اس دنیا میں نہیں ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: الزهري أحسن الناس حديثا وأجود الناس إسنادا۔ زہری رحمہ اللہ لوگوں میں حدیث کے اعتبار سے سب سے بہتر اور سند کے اعتبار سے سب سے عمدہ ہیں۔

امام لیث بن سعد (متوفی ۱۷۵ھ) رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے ابن شہاب زہری سے زیادہ جامع العلوم کسی عالم کو نہیں دیکھا۔

ابو بکر الھذلی رحمہ اللہ (متوفی ۱۶۷ھ) فرماتے ہیں: قد جالست الحسن وابن سيرين فما رأيت أحدا أعلم منة يعنى الزهري۔ میں حسن بصری اور ابن سیرین رحمہما اللہ کے ساتھ بیٹھا، لیکن میں نے زہری رحمہ اللہ سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں دیکھا۔

محمد بن سعد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وكان الزهري ثقة كثير الحديث والعلم والرواية فقيها جامعا۔ محدثین کا کہنا ہے کہ زہری ثقہ راوی ہے اور کثرت سے علم

رکھنے والا، احادیث کو جاننے والا اور احادیث کو نقل کرنے والا ہے۔

سعید بن عبد العزیز رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ما كان الا بحرا۔ وہ تو علم کا ایک سمندر ہے سمندر۔

سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: كان الزهري أعلم أهل المدينة۔ امام زہری رحمہ اللہ اہل مدینہ میں سب سے بڑے عالم ہیں۔

عمرو بن دینار رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ما رأيت أنص للحديث من الزهري۔ میں نے حدیث کی سند بیان کرنے میں زہری رحمہ اللہ سے بڑھ کر کسی کو نہیں دیکھا۔

امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: قال الدارمي قلت له (يعني يحيي بن معين) الزهري أحب إليك في سعيد بن المسيب أو قتادة فقال كلاهما فقلت فهما أحب اليك أو يحيى بن سعيد فقال كل ثقة۔ امام دارمی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے یحییٰ بن معین رحمہ اللہ سے کہا کہ زہری آپ کو سعید بن مسیب سے زیادہ محبوب ہے یا قتادہ؟ تو انہوں نے کہا دونوں۔ تو میں نے پھر کہا کہ وہ دونوں آپ کو زیادہ محبوب ہیں یا یحییٰ بن سعید؟ تو یحییٰ بن معین نے کہا: یہ سب ثقہ راوی ہیں۔

امام علی بن مدینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حفظ العلم على أمة محمد ستة فلأهل مكة عمرو بن دينار ولأهل المدينة بن شهاب الزهري۔ حدیث کا علم اُمت محمد میں چھ افراد نے محفوظ کیا: اہل مکہ میں سے عمرو بن دینار نے اور اہل مدینہ میں ابن شہاب الزہری نے۔

امام یحییٰ بن سعید رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ما بقي عند أحد من العلم ما بقي عند ابن شهاب۔ کسی ایک کے پاس بھی وہ علم نہیں رہا جو ابن شہاب کے پاس ہے۔

امام ابو حاتم الرازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: أثبت أصحاب أنس الزهري۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیٹھنے والوں میں سب سے زیادہ ثابت زہری رحمہ اللہ ہیں۔

امام نسائی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: أحسن أسانيد تروى عن رسول الله أربعة منها: الزهري عن علي بن الحسين عن الحسين بن علي عن علي ابن أبي طالب

عن رسول الله ﷺوالزهری عن عبیدالله بن عبدالله بن عتبة بن مسعود عن ابن عباس عن عمر عن رسول الله۔ سب سے بہتر اسناد جو کہ اللہ کے رسول ﷺ سے مروی ہیں وہ چار ہیں: زہری، علی بن حسین سے، وہ حسین بن علی سے، وہ علی بن ابی طالب سے اور وہ اللہ کے رسول ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔ اور زہری، عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ بن مسعود سے، وہ عبد اللہ بن عباس سے، وہ عمر بن خطاب سے اور وہ اللہ کے رسول ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔

امام ابن حبان رحمہ اللہ لکھتے ہیں: رأى عشرة من أصحاب رسول اللهﷺوكان أحفظ أهل زمانه وأحسنهم سياقا لمتون الأخبار وكان فقيها فاضلا۔ ابن شہاب الزہری رحمہ اللہ نے دس صحابہ کی زیارت کی ہے اور اپنے زمانے کے سب سے بڑے حدیث کے حافظ تھے اور احادیث کے متون کو بیان کرنے میں سب سے اچھے تھے اور فقیہ اور فاضل تھے۔

امام احمد العجلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: تابعی ثقة۔ تابعی اور ثقہ تھے۔

امام ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: الفقيه الحافظ متفق على جلالته وإتقانه۔ ابن شہاب زہری رحمہ اللہ فقیہ اور الحافظ ہیں، علم حدیث میں ان کی بزرگی اور حافظے کی پختگی پر محدثین کا اتفاق ہے۔

امام ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: محمد بن مسلم الزهري الحافظ الحجة۔ محمد بن مسلم الزہری رحمہ اللہ 'الحافظ' اور 'الحجۃ' ہیں۔ ان تمام اقوال کے حوالہ جات اور اس بارے تفصیل ہماری کتاب "فکر غامدی" میں موجود ہے۔[1]

امر واقعہ یہ ہے کہ امام المحدثین، امام ابن شہاب زہری رحمہ اللہ کی تعدیل و توصیف سے اسماء الرجال کی کتب بھری پڑی ہیں۔ اب امام ابن شہاب الزہری رحمہ اللہ کے معاصر فقہاء، محدثین اور ائمہ دین کی شہادت ان کے حق میں ہم رد کر دیں کہ وہ حدیث کے امام

[1] محمد زبیر، حافظ، فکر غامدی: ایک تحقیقی وتجزیاتی مطالعہ، مکتبہ رحمۃ للعالمین، لاہور، 2012ء، ص 88-95

تھے اور آج کے ان جدید محققین یا متجددین کی گواہی قبول کر لیں کہ جو تیرہ صدیوں بعد انہیں حدیث میں ناقابل اعتماد کہہ رہے ہیں۔

کتب احادیث میں شیعہ راویوں سے روایت

احادیث کی اکثر کتابوں میں شیعہ راویوں سے بھی روایت لی گئی ہے اور منکرین حدیث کا حدیث پر ایک بڑا اعتراض یہ بھی ہے کہ شیعہ راویوں سے روایت کیوں؟ قاری حنیف ڈار صاحب نے بھی اس اعتراض کو مرچ مسالہ لگا کر دہرایا ہے۔ اس اعتراض کی حقیقت یہ ہے کہ مثال کے طور صحیح بخاری کی تدوین تیسری صدی ہجری کے نصف اول میں ہوئی ہے۔ اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تیسری صدی ہجری کے نصف اول میں جو تشیع تھا، کیا وہ یہی تھا جو آج چودھویں صدی ہجری میں ہے؟

محدثین نے شیعہ راویوں سے روایت اس لیے لی ہے کہ شروع میں تشیع محض ایک سیاسی رجحان تھا جو بنو امیہ کے مقابلے میں اہل بیت کے لیے مسلمانوں کے بعض گروہوں میں موجود تھا۔ اور اس رجحان نے بہت بعد میں غلو کی صورت میں رافضیت کی شکل اختیار کی ہے۔

امام ابن حجر رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ شروع میں تشیع دو قسم کا تھا۔ ایک طرف وہ لوگ تھے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر ترجیح دیتے تھے لیکن یہ شیخین ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے افضل مانتے تھے۔ اور دوسرا گروہ وہ تھا کہ جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مطلق فضیلت کے قائل تھے۔[1] لیکن ان دونوں گروہوں میں سے کوئی بھی شیخین یعنی ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما یا ازواج مطہرات یا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو سب و شتم نہیں کرتے تھے۔

پس بخاری و مسلم میں کسی ایسے شیعہ راوی کی روایت نہیں ہے کہ جو رافضی ہو یا شیخین اور ازواج مطہرات پر لعن طعن کرتا ہو وغیرہ یا ان کی تکفیر کرتا ہو۔ امام ذہبی رحمہ اللہ

---

[1] ابن حجر العسقلاني، أبو الفضل أحمد بن علي بن محمد بن أحمد (المتوفى: 852هـ) تهذيب التهذيب، دائرة المعارف النظامية، الهند، الطبعة الأولى، 1326هـ، 94/1

نے بھی اس کا ذکر کیا ہے کہ محدثین بدعت کبری کے مرتکب سے روایت نہیں لیتے ہیں اور بدعت کبری کا ارتکاب کرنے والوں میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو شیخین پر زبان درازی کرتے ہیں۔[1] ور محدثین نے تو یہ بھی اہتمام کیا ہے کہ مذکورہ بالا دو گروہوں میں سے اس شیعہ راوی سے بھی روایت نہیں لی ہے کہ جو اپنے عقیدے کا داعی اور مبلغ ہو۔ شارح بخاری اور معروف محدث علامہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب تہذیب میں یہی بات بیان کی ہے۔

مزید اگر کسی کو شیعہ راوی سے محدثین کے روایت کرنے کے اصولوں کے بارے جاننے کا اشتیاق ہو تو اس موضوع پر محمد خلیفہ الشرع کی کتاب "منهج الإمامين البخاري ومسلم في الرواية عن رجال الشيعة في صحيحيهما" اور کریمہ سودانی کی کتاب "منهج الإمام البخاري في الرواية عن المبتدعة من خلال الجامع الصحيح : الشيعة أنموذجا" کا مطالعہ کر لینا چاہیے۔

انکارِ حدیث کیا ہے؟

دوست نے کہا کہ چند حدیثوں کے انکار سے کوئی منکر حدیث تھوڑا ہو جاتا ہے۔ ہم نے عرض کیا کہ ہاں! ٹھیک کہتے ہو، چند آیتوں کے انکار سے کوئی منکر قرآن تھوڑا ہو جائے گا؟ اس نے کہا کہ یہ کیا بات ہوئی! میں نے کہا کہ وہی بات ہوئی کہ جو آپ نے کی۔ جیسی منطق ویسا جواب۔

امر واقعہ یہ ہے کہ اگر کوئی حدیث اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو جائے اور اس کے ثبوت پر محدثین اور فقہاء کا اتفاق ہو تو اس ایک روایت کا انکار کرنے والا بھی منکر حدیث ہی کہلائے گا۔

یہ امت اپنی اجتماعی حیثیت میں معصوم ہے کہ اللہ عزوجل نے اسے ﴿شُهَدَاءَ عَلَى

---

[1] الذهبي، شمس الدين أبو عبد الله محمد بن أحمد بن عثمان بن قَايْماز (المتوفى: 748هـ)، ميزان الاعتدال في نقد الرجال، دار المعرفة للطباعة والنشر، بيروت، الطبعة الأولى، 1382 هـ - 1963 م، 6/1

النَّاسِ﴾ بنایا ہے[1] اور یہ شہادت اس دنیا میں تو اسی صورت قائم ہو سکتی ہے جبکہ یہ امت اجتماعی حیثیت میں معصوم قرار پائے۔ اگر امت اپنی اجتماعی حیثیت میں بھی غلط ہو سکتی ہے تو یہ دوسروں پر اللہ کے دین کے معاملے میں کبھی گواہ نہیں بن سکتی۔ البتہ یہ بات درست ہے کہ بعض احادیث کا انکار کر دینا اور تمام احادیث کا انکار کر دینا تو یہ دونوں رویے اپنی شناعت میں برابر نہیں ہیں کہ دوسرا پہلے سے کہیں زیادہ شنیع فعل ہے۔

صحیح بخاری کے قلمی نسخے

اہل تشیع اور منکرین حدیث اہل سنت سے صحیح بخاری کے اصل قلمی نسخے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ صحیح بخاری کو نوے ہزار لوگوں نے ان کی زندگی میں ان سے سنا[2] تو اب بھی انہیں قلمی نسخے کی ضرورت ہے کیا؟ بھئی! ایسا قلمی نسخہ تو قرآن مجید کا بھی ہمارے پاس نہیں کہ جو اللہ کے رسول ﷺ لکھوا کر گئے ہوں۔ نہ جمع ابی بکر الصدیق موجود ہے، نہ حضرت عثمان کا نسخہ رضی اللہ عنہم بلکہ جو کچھ قدیم مصاحف میں سے موجود ہے تو وہ پہلی یا دوسری صدی ہجری کے مصاحف ہیں۔ تو کیا صرف اس بات پر قرآن مجید کا انکار کر دیں؟

اگر قرآن مجید قولی تواتر سے ثابت ہو سکتا ہے تو صحیح بخاری نہیں؟ اب نوے ہزار کی روایت سے تواتر حاصل نہ ہو گا کیا؟ اور قرآن مجید کی طرح بخاری کے حفاظ ہر دور میں رہے ہیں اور خود امام بخاری رحمہ اللہ لاکھوں حدیثوں کے حافظ تھے تو ان کے شاگرد جو خود کبار محدثین تھے، ہزاروں روایتوں کے حافظ نہیں ہو سکتے تھے کیا؟ حفظ تو کجا آج بھی بلاد مغرب مراکش وغیرہ میں صحیح بخاری کی باقاعدہ تلاوت کی جاتی ہے۔

ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ ہمارا دین اصل میں حفظ و نقل، تحمل واداء اور تلقی و تلاوت سے منتقل ہوا ہے نہ کہ کتابت سے۔ کتابت تو اس کے انتقال کا ایک اضافی ذریعہ

[1] البقرة: 2: 143؛ الحج: 22: 78

[2] الخطيب البغدادي، أحمد بن علي بن ثابت بن أحمد بن مهدي (المتوفى: 463هـــــ)، تاريخ بغداد، دار الغرب الإسلامي، بيروت، الطبعة الأولى، 1422هـ - 2002م، 322/2

رہا ہے۔ لہذا دین میں کتابت کی شرط لگائیں گے تو قرآن مجید تک غیر محفوظ ہو جائے گا کہ اس وقت دنیا میں تین نسخے ایسے ہیں کہ جن کے بارے دعوی ہے کہ وہ مصحف عثمانی ہے اور تینوں نسخوں پر ﴿فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ﴾ کے الفاظ پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کے نشانات ہیں۔ پس قرآن مجید اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جن چیزوں پر لکھا گیا، وہ آج ہمارے پاس محفوظ نہیں ہیں البتہ ان صحف سے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا مصحف تیار ہوا۔ اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا مصحف بھی موجود نہیں ہے البتہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے مصحف سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مصاحف تیار ہوئے۔ آج حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مصاحف بھی موجود نہیں ہیں البتہ مصاحف عثمانیہ کی روشنی میں تیار ہونے والے مصاحف موجود ہیں۔[1]

تو ہمارا دین نسخوں سے منتقل نہیں ہوا، یہ نسخے تو کمزور لوگوں کے لیے تیار کیے گئے تھے جبکہ علماء شروع سے ہی حفاظ قرآن بھی ہوتے تھے اور حفاظ حدیث بھی بلکہ حفاظ علوم بھی۔ اور آج بھی ہماری درس گاہوں میں حفاظ قرآن اور حفاظ حدیث تو کجا تفسیر، نحو اور منطق جیسی درسی کتابوں کے حافظ بھی مل جاتے ہیں۔ اس دین کے نقل ہونے کا طریقہ جس دن آپ کو سمجھ آجائے گا تو اس دن آپ کا بخاری سے بغض بھی ختم ہو جائے گا۔ اور بخاری کے قلمی نسخوں کے بارے دوسری بات اگلی تحریر میں۔

صحیح بخاری کا قدیم ترین نسخہ

بعض مفکرین کا دعوی ہے کہ ہمارے پاس بخاری کا کوئی ایک بھی محفوظ قلمی نسخہ موجود نہیں ہے۔ جو موجود ہیں، ان میں بھی باہمی اختلافات ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بخاری کے کاتبوں نے اپنی طرف سے حدیثیں صحیح بخاری میں شامل کر دیں کہ جسے علمی اصطلاح میں الحاق کہتے ہیں۔ لہذا آج ہمارے پاس جو بخاری موجود ہے، وہ امام بخاری رحمہ اللہ کی چھوڑی ہوئی صحیح بخاری نہیں ہے۔

---

[1] سحر السيد عبد العزيز سالم، أضواء على مصحف عثمان بن عفان رضي الله عنه ورحلته شرقا وغربا، مؤسسة شباب الجامعة، الإسكندرية، 1991م، ص 22

امر واقعہ یہ ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ سے نوے ہزار لوگوں نے صحیح بخاری کی سماعت کی کہ جن میں سے محمد بن یوسف الفربری، ابراہیم بن معقل النسفی، ابن سویہ حماد بن شاکر، منصور بن محمد البزدوی اور حسین بن اسماعیل المحاملی رحمہم اللہ امام بخاری سے صحیح بخاری روایت کرنے میں معروف ہیں۔[1]

محمد بن یوسف الفربری رحمہ اللہ نے تین سال تک امام بخاری رحمہ اللہ سے صحیح بخاری کی سماعت فرمائی اور الفربری رحمہ اللہ سے بے شمار لوگوں نے صحیح بخاری کی سماعت کی لیکن ان سے صحیح بخاری کو روایت کرنے میں جو لوگ معروف ہیں، ان میں ابراہیم بن احمد المستملی، ابن حمویہ عبد اللہ بن احمد، محمد بن مکی الکشھمینی، ابن شبویہ محمد بن عمر، سعید بن عثمان البزار، محمد بن احمد المروزی اور محمد بن محمد الجرجانی رحمہم اللہ شامل ہیں۔[2]

الفربری رحمہ اللہ کے شاگرد المستملی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

انتسخت كتاب البخاري من أصله كما عند ابن يوسف، فرأيته لم يتم بعد، وقد بقيت عليه مواضع مبيضة كثيرة، منها تراجم لم يثبت بعدها شيئا، ومنها أحاديث لم يترجم عليها، فأضفنا بعض ذلك إلى بعض.[3]

"میں نے صحیح بخاری کو اس کے اصل نسخے سے نقل کیا ہے جو کہ الفربری کے پاس تھا۔ میں نے وہ نسخہ دیکھا کہ وہ ابھی تک مکمل نہیں تھا اس معنی میں کہ اس میں کچھ جگہیں خالی تھیں۔ بعض مقامات پر ترجمۃ الباب تھا لیکن اس کے نیچے کوئی حدیث نہیں تھی۔ اور بعض مقامات پر احادیث تھیں لیکن ان پر ترجمۃ الباب نہیں تھا۔ تو ہم نے وہ ترجمۃ الباب کہ جس کے نیچے احادیث نہیں تھیں، اسے وہاں درج کر دیا کہ جہاں احادیث تھیں لیکن ترجمۃ الباب نہیں تھا۔"

[1] محمد بن عبد الكريم بن عبيد، روايات ونسخ الجامع الصحيح للإمام أبي عبد الله محمد بن إسماعيل البخاري دراسة وتحليل، دار إمام الدعوة، الرياض، 1426ھ، ص 19، 21-22

[2] ايضا: ص 20-21

[3] الباجي، أبو الوليد سليمان بن خلف بن سعد بن أيوب الأندلسي (المتوفى: 474هـ)، التعديل والتجريح لمن خرج له البخاري في الجامع الصحيح، دار اللواء للنشر والتوزيع، الرياض، الطبعة الأولى، 1406 – 1986، ص 310-311

امام بخاری رحمہ اللہ اپنی زندگی میں ہی صحیح بخاری لکھوا چکے تھے اور انہوں نے اسے مکمل کرنے کے بعد امام احمد بن حنبل، یحی بن معین اور علی بن مدینی رحمہم اللہ جیسے جلیل القدر ائمہ محدثین کی خدمت میں پیش بھی کیا تو ان تمام محدثین نے چار احادیث کے علاوہ جمیع احادیث کو صحیح قرار دیا۔

اسی طرح الفربری رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں نے اپنی صحیح بخاری میں کوئی حدیث ایسی نہیں لکھی ہے کہ جس سے پہلے غسل کر کے دو رکعت نماز استخارہ نہ پڑھی ہو۔ تو یہ بہت واضح دلیل ہے کہ صحیح بخاری کو امام صاحب اپنی زندگی میں مکمل کر چکے تھے۔

البتہ بعض تراجم بیان کر کے امام صاحب ان کے تحت کوئی حدیث لانا چاہتے تھے لیکن جب نہیں ملی تو انہوں نے اس کی جگہ خالی چھوڑ دی۔ یا بعض احادیث پر وہ کوئی جامع ترجمۃ الباب قائم کرنا چاہتے لیکن جب ان کے ذہن میں ان احادیث سے اخذ ہونے والے متنوع مسائل کے لیے کوئی جامع ترجمۃ الباب نہیں آیا تو انہوں نے ترجمۃ الباب کی جگہ خالی چھوڑ دی۔

اب الفربری رحمہ اللہ کے شاگردوں نے یہ کام کیا کہ جہاں ترجمۃ الباب کے نیچے احادیث نہیں تھیں، اس ترجمۃ الباب کو وہاں سے اٹھایا اور وہاں رکھ دیا کہ جہاں احادیث تھیں اور وہاں ترجمۃ الباب نہیں تھا۔ تو صحیح بخاری میں کسی نے کوئی اضافہ یا الحاق نہیں کیا، البتہ یہ ہوا ہے کہ تقدیم وتاخیر کر دی ہے۔ اسی لیے ابو الولید الباجی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ الفربری رحمہ اللہ سے جن چار لوگوں نے صحیح بخاری کو روایت کیا ہے، ان کی روایت میں تقدیم وتاخیر کا اختلاف ہے کہ حدیثیں آگے پیچھے ہیں یا ترجمۃ الباب آگے پیچھے ہے۔ اور یہ اختلاف ایسا نہیں ہے کہ جو موجب طعن ہو۔[1]

اور مولانا انور شاہ کاشمیری رحمہ اللہ فیض الباری میں لکھتے ہیں کہ صحیح بخاری کے انیس قدیم نسخے ہیں کہ جن میں تین تو امام بخاری کے حنفی شاگردوں کے ہیں کہ جن میں

---

[1] ایضا: ص 311

ابراہیم بن معقل النسفی الحنفی رحمہ اللہ اور حماد بن شاکر الحنفی رحمہ اللہ دونوں امام بخاری کے براہ راست شاگرد ہیں۔ اور تیسرا شمس الدین صغانی رحمہ اللہ کا ہے۔[1]

امام بخاری سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر بغض رکھنے والوں کی خدمت میں

بعض مفکرین صحیح بخاری کی بعض احادیث کو بنیاد بنا کر امام بخاری رحمہ اللہ سے جو بغض کا اظہار کر رہے ہیں تو اس کا سبب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت بیان کر رہے ہیں۔ تو ان سے عرض ہے کہ کبھی تنہائی میں اس پر غور کرنا کہ کیا امام بخاری رحمہ اللہ ان روایات یا احادیث کو اپنی کتاب میں نقل کرنے کے سبب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نظروں میں قیامت والے دن ایسے ہی مبغوض ٹھہریں گے جیسا کہ آج اس دنیا میں تمہارے دلوں میں ان کے بارے میں کینہ ہے؟

اگر ہاں تو اللہ تعالی کبھی صحیح بخاری کو وہ مقام نہ دیتا جو اسے اس امت میں حاصل ہے کہ مبغوضِ رسول، رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پہچان کا مقبول اور معروف ترین واسطہ بن جائے! ممکن نہیں ہے۔ اور اگر نہیں تو پھر اپنے آپ کو سمجھاؤ کہ جب آخرت میں وہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے محبین میں سے ہوں گے تو پھر تم بخاری کے تذکروں سے اپنا خون کیوں جلا رہے ہو؟ ریلیکس رہو، کھاؤ پیو، لائف کو انجوائے کرو۔ اور بخاری کے بغض میں اپنے عشقِ رسول کی ایڈورٹزمنٹ کی بجائے کوئی مثبت کام کر لو تو سب روایت پسند تمہارے لیے دعائیں کریں گے۔

صحیح بخاری کا مقام علمائے دیوبند کی نظر میں

سوال: صحیح بخاری شریف ایک صحیح کتاب ہے کیا آپ کے پاس اس کی کوئی دلیل یا ثبوت ہے؟ برائے کرم قرآن اور حدیث یا اقوال یا اسلامی کتابوں سے، صحابہ کرام،

---

[1] (أمالي) محمد أنور شاه بن معظم شاه الكشميري الديوبندي (المتوفى: 1353هـــ)، فيض الباري على صحيح البخاري، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى، 1426 هـ - 2005م، ص 33

تابعین، تبع تابعین رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین سے دلیل عنایت فرماویں کہ صحیح بخاری شریف ایک مستند کتاب ہے، اور دلیل یا ثبوت ان لوگوں کی جانب سے نہیں ہونے چاہئیں جو کہ تبع تابعین کے بعد پیدا ہوئے ہیں۔

جواب: بخاری شریف اپنی مختلف خصوصیات کی بنا پر قرآنِ کریم کے بعد سب سے زیادہ صحیح کتاب ہے، یہ کتاب آپ ﷺ اور اصحاب کے زمانے میں تو تھی نہیں، تو پھر بخاری شریف کے بارے میں فرمانِ نبوی اور اقوالِ صحابہ کہاں ملیں گے؟ البتہ بخاری شریف یہ آپ ﷺ کی احادیث کا مجموعہ ہے اور اس میں بھی وہ احادیث ہیں جن کی صحت میں شبہ نہیں۔ واضح رہے کہ احادیث سب ہی صحیح ہوتی ہیں، اس میں جو ضعف آتا ہے وہ راویوں کی وجہ سے آتا ہے۔ تو امام بخاری رحمہ اللہ نے جو احادیث نقل کی ہیں، اس میں راوی وغیرہ انتہائی ثقہ ہیں، جس سے اس میں موجود احادیث کے حدیثِ رسول ہونے میں شبہ نہیں رہ جاتا۔ اور جو بات حدیث ہو اس کے صحیح ہونے میں قرآن کی آیات بھی ہیں، احادیث بھی ہیں، اقوال صحابہ بھی ہیں۔ بخاری شریف کی صحت پر اجماعِ امت ہے، اور اجماع یہ حجت شرعیہ ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کے معاصرین اور اس کے بعد کے معتبر علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ وہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے۔ بخاری لکھنے کا آغاز ۲۱۷ھ میں ہوا اور سولہ سال میں یہ کتاب مکمل ہوئی۔[1]

کیا صحیح بخاری منزل من اللہ ہے کہ اس میں کوئی غلطی نہیں؟

جب بھی حدیث کا دفاع کیا جائے تو منکرین حدیث عموماً یہ سوال کرتے ہیں۔ تو پہلی بات یہ واضح رہے کہ صحیح بخاری کے دو گتوں کے مابین جو کچھ ہے، اس سب کو کوئی بھی "منزل من اللہ" نہیں کہتا۔ صحیح بخاری میں "منزل من اللہ" ہے نہ کہ کل صحیح بخاری "منزل من اللہ" ہے۔

[1] Hadith wa Sunnat, Dar ul Ifta Dar ul Uloom Deoband, India, QA No. 11124, Retrieved 01 November 2016 from http://www.darulifta-deoband.com/home/ur/Hadith--Sunnah/11124

دوسری اور اہم تر بات یہ ہے کہ حدیث کو وحی کہا جاتا ہے نہ کہ صحیح بخاری کو۔ اور صحیح بخاری میں حدیث موجود ہے نہ کہ صحیح بخاری کی ہر بات حدیث ہے۔ حدیث سے مراد وہ روایت ہے کہ جس میں اللہ کے رسول ﷺ کا قول، فعل اور تقریر موجود ہو اور صحیح بخاری میں صحابہ کے اقوال بھی ہیں اور تابعین کے بھی۔ سلف کے اقوال بھی ہیں اور ائمہ کے بھی۔

تیسری اور اہم تر بات یہ ہے کہ حدیث کو لفظی وحی کوئی بھی نہیں کہتا بلکہ حدیث معنوی وحی ہے۔ پس حدیث کا معنی "منزل من اللہ" ہے جبکہ حدیث کے الفاظ اللہ کے رسول ﷺ کے ہوتے ہیں اگر وہ قولی سنت ہو۔ اور اگر فعلی یا تقریری سنت ہو تو حدیث کے الفاظ صحابی کے ہوتے ہیں۔ حدیث میں اگرچہ اللہ کے رسول ﷺ کے الفاظ کو محفوظ رکھنے کا اہتمام کیا گیا ہے اور بہت حد تک محفوظ بھی ہیں لیکن اصل بات یہی ہے کہ اس میں معنی محفوظ ہے۔

منکرین حدیث عموماً اپنی نقد میں ان اصولی باتوں کا لحاظ نہیں رکھتے۔ مثال کے طور وہ صحیح بخاری پر یوں نقد کریں گے کہ اس میں یہ واقعہ موجود ہے کہ ایک بندر نے زنا کیا تو بقیہ بندروں نے اس کو رجم کر دیا۔[1] اب امام بخاری رحمہ اللہ نے اس واقعے کو عمرو بن میمون تابعی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ یمن میں ایسے ایسے دیکھا۔ اور وہ دیکھا بھی زمانہ جاہلیت میں ہے۔ اب یہ حدیث ہے ہی نہیں بلکہ ایک تابعی کا مشاہدہ ہے، اگرچہ واقعہ بخاری میں موجود ہے۔

رہی بات صحیح بخاری پر نقد کی تو ائمہ فن نے اس کی روایات پر نقد کی اور ائمہ فن نے ہی اس نقد کا جواب بھی دے دیا ہے۔ اور اب اس نقد اور دفاع سے یہ متعین ہو گیا ہے کہ صحیح بخاری میں کلام کی گنجائش کہاں کہاں ہے اور اس کا جواب کیا کیا ہے؟ یہ عمل علم کی دنیا میں ایک ہزار سال کے عرصے میں مکمل ہو چکا۔ اب آپ صحیح بخاری پر کوئی نیا

---

[1] عَنْ عَمْرِو بْنِ مَيْمُونٍ، قَالَ: «رَأَيْتُ فِي الجَاهِلِيَّةِ قِرْدَةً اجْتَمَعَ عَلَيْهَا قِرَدَةٌ، قَدْ زَنَتْ، فَرَجَمُوهَا، فَرَجَمْتُهَا مَعَهُمْ» [صحيح البخاري: 44/5]

اعتراض پیدا نہیں کر سکتے اور جو پیدا ہوئے تھے، ان کا جواب موجود ہے۔

اسی لیے صحیحین کی احادیث پر نقد کے بارے اپنے ایک مفصل مضمون کا خلاصہ یہاں نقل کر رہا ہوں[1] کہ صحیحین پر ہونے والی کبار محدثین کی تمام نقد اور کبار محدثین ہی کی طرف سے اس کے جواب کے بعد ان دونوں کتب میں وہ مقامات متعین ہو گئے کہ جن میں کوئی علل پائی جاتی ہیں اور ان علل کے درجہ کا تعین بھی ہو گیا ہے کہ وہ علل قادحہ ہیں یا نہیں؟

اب اگر کوئی شخص امام الدار قطنی رحمہ اللہ یا ائمہ سلف میں سے کسی اور محدث کی بیان کردہ تحقیقات کی روشنی میں صحیح بخاری یا صحیح مسلم کی کسی حدیث پر نقد کرتا ہے تو اس کی یہ تنقید صحیحین پر کوئی مستقل بالذات تنقید شمار نہ ہو گی اور ایسی تنقید کا ائمہ سلف ہی میں سے بہت سے ائمہ نے کافی و شافی جواب دے دیا ہے۔

اور اگر کوئی شخص صحیحین کی کسی ایسی روایت پر تنقید کرتا ہے کہ جس پر ائمہ سلف میں سے کسی نے بھی کلام نہ کیا ہو تو ایسا شخص اجماع محدثین کی مخالفت کر رہا ہے کیونکہ جن روایات پر محدثین نے نقد نہ کی تو اس سے یہ طے ہو گیا کہ تمام محدثین کے نزدیک یہ روایات صحیح ہیں لہذا ان روایات پر کلام کرنا جمیع محدثین کے دعوی صحت کو چیلنج کرنا ہے اور ایسا دعوی ہی ناقابل التفات ہے چہ جائیکہ اس کی تحقیق کی جائے۔

نکاح کے وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہی مروی متفق علیہ روایت کے مطابق اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کے وقت ان کی عمر چھ سال تھی جبکہ رخصتی کے وقت نو سال تھی۔[2] اس روایت پر ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ یہ ظلم ہے۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ جس پر ظلم ہونے کا دعوی کیا جاتا ہے، اس سے کوئی نہیں پوچھ رہا۔ یعنی عائشہ رضی اللہ عنہا نو سال

[1] محمد زبیر، حافظ، کیا صحیحین کی صحت پر اجماع ہے، ماہنامہ محدث، مارچ 2008ء، مجلس تحقیق اسلامی، لاہور، 3/40

[2] صحیح البخاري: 55/5

کی عمر میں رخصتی پر راضی، ان کے والد ابو بکر رضی اللہ عنہ اس پر راضی، ابو بکر رضی اللہ عنہ کے خاندان کے کسی فرد کو اعتراض نہیں، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم راضی۔ اب انہیں، دوسری دنیا کے لوگوں کو، یہ ظلم نظر آرہا ہے۔

قاری حنیف ڈار صاحب نے یہ اعتراض کیا ہے کہ یہ تو مانتے ہو کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا چھ سال کی عمر میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں لیکن اپنی بیٹی چھ سال کی عمر میں کسی کے نکاح میں نہیں دیتے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں! واللہ! اگر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہوتے تو چھ سال کی عمر میں اپنی بیٹی ان کے نکاح میں دینے میں آج بھی لاکھوں اپنے لیے سعادت سمجھتے۔

قاری حنیف ڈار صاحب کی خدمت میں عرض ہے کہ عام انسان اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں کچھ فرق سمجھیں۔ ایک امتی کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو ایمانی تعلق ہے، اسے کسی مرشد اور پیر سے جذباتی تعلق پر قیاس نہ کریں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جو خود اس روایت کی راویہ ہیں، انہوں نے کبھی اس پر افسوس کا اظہار کیا کہ وہ نو سال کی عمر میں کیوں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت میں آئیں؟ اور بعض لوگوں کو خواہ مخواہ کا بخار چڑھا جا رہا ہے۔

ایک پروفیسر صاحب نے کہا کہ امتی تو اپنی بیٹی دے دے گا لیکن رسول صلی اللہ علیہ وسلم لے نہیں سکتے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ اتنے لوگ اگر کہہ رہے ہیں اور اتنی روایات اگر بیان کر رہی ہیں تو امکان تو ہے کہ قیامت دن معلوم ہو کہ ایسا ہی ہوا تھا تو اس وقت رسول کا رسول ہونا کیسے جسٹیفائی کرو گے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نو سال کی عمر میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں، اس کا جواب چاہیے تو وہ عقلی نہیں ایمانی ہے۔ آج اپنے آپ سے یہ سوال کر لیں کہ اگر بالفرض تم سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری بیٹی نو سال کی عمر میں مانگ لیتے تو تمہارا ردعمل کیا ہوتا؟ اور پھر یہ کہ تمہارا ردعمل جو ہوتا سو ہوتا لیکن یہ بھی سوچ لو کہ اگر ابو بکر کا ایمان ہوتا تو اس کا اس پر کیا ردعمل ہوتا؟

ہمیں یہ کہنے میں کوئی حرج محسوس نہیں ہوتا کہ مغربی عقلیت پرستی کے زیر اثر کچھ لوگوں کو یہاں مشرق میں جذبات کی مخالفت کا بخار چڑھا ہوا ہے حالانکہ انہیں یہ معلوم

نہیں کہ ایمان بھی ایک جذبہ ہی ہے۔ کائنات کا کل حسن جذبات میں ہے، اگر ایسا نہیں تو ہر زبان کے ادب کو اٹھا کر دریا میں پھینک دو۔ ہاں، ہاں، یہ کیا، جذباتی بات کر رہے ہو۔ تو کیا جذبات کے بغیر تمہارا ایمان مکمل تو کجا موجود بھی ہو سکتا ہے؟

ہماری نظر میں ہر سوال کا جواب نہ تو علمی ہوتا ہے اور نہ عقلی۔ بعض سوالوں کا جواب صرف ایمانی ہوتا ہے، جو صرف ایمان سے ہی دیا جا سکتا ہے اور محض ایمان ہی کی بدولت سمجھا جا سکتا ہے۔ اور مذہب کو اس کے بغیر چارہ نہیں ہے۔ اس نکتے کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے کیونکہ یہ تکمیل ایمان میں سے ہے۔ ایک دوست کا کیا خوب کہنا ہے کہ ایمان دلیل بھی ہے اور مدلول بھی لیکن اس جملے کو سمجھنے کے لیے بھی ایمان چاہیے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر پر تحقیقی نظر از سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ

اپنے اس رسالے میں جناب سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ نے اپنے معاصرین میں سے منکرین اور متجددین کے ان دلائل کی خوب خبر لی ہے کہ جن سے یہ ثابت کیا جا رہا تھا کہ نکاح کے وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر بڑی تھی۔ یہ رسالہ سید صاحب کی کتاب سیرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے آخر میں موجود ہے کہ جسے مکتبہ اسلامیہ نے شائع کیا ہے۔ منکرین اور متجددین نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر کے بارے میں صاحب مشکوۃ ولی الدین خطیب رحمہ اللہ کے ایک رسالہ "الإكمال في أسماء الرجال" کی ایک عبارت کو بطور دلیل پیش کیا ہے کہ جس کے مطابق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنی بہن سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا سے دس سال چھوٹی تھیں۔[1]

صاحب مشکوۃ کے رسالہ "الإكمال في أسماء الرجال" کی عبارت کے بارے سید صاحب کا کہنا ہے کہ صاحب مشکوۃ نے اس رائے کو "قیل" کے صیغے سے پیش کر کے اس کے مجہول اور ضعیف ہونے کی طرف اشارہ کیا تھا لیکن منکرین اور متجددین نے اسی قول کو اپنے حق میں دلیل بنا لیا جبکہ صاحب مشکوۃ کی اپنی رائے اس باب میں وہی ہے جو عام علماء کی رائے ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا نکاح چھ سال کی عمر میں اور رخصتی نو سال کی

[1] سلمان ندوی، سید، سیرت عائشہ، دار الابلاغ، لاہور، 2010ء، ص 316

عمر میں ہوئی تھی۔[1]

سید صاحب نے لکھا ہے کہ احادیث میں صرف نو کا عدد نہیں ہے کہ جس کے بارے یہ دعوی کیا جا سکے کہ یہ انیس تھا اور راویوں نے اسے نو سمجھ لیا بلکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے نکاح کے وقت کے احوال بھی بیان کیے ہیں کہ وہ ہنڈولے جھولتی تھیں، گڑیاں کھیلتی تھیں، اور ایک روایت میں "جارية حديثة السن" کے الفاظ بھی ہیں۔ یعنی طرح طرح کے الفاظ اور قرائن سے نکاح کے وقت ان کے چھوٹے ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔[2]

سید صاحب کا یہ بھی کہنا ہے کہ عربوں میں نہ صرف کمسن بچیوں کے نکاح کا رواج تھا بلکہ شیر خوار بچوں کا بھی وہ نکاح کر دیتے تھے بلکہ ان بچوں کا بھی ان کے ہاں نکاح کر دیا جانا عام تھا کہ جو ابھی حمل میں ہوتے تھے جیسا کہ سنن ابوداؤد میں تو باقاعدہ ایک باب "باب في تزويج من لم يولد" کے عنوان سے موجود ہے کہ جس میں ان بچیوں کے نکاح کا تذکرہ ہے کہ جو ابھی پیدا بھی نہیں ہوئی تھیں۔

سید صاحب نے امام رازی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے کمسن لڑکے سلمہ رضی اللہ عنہ کا نکاح حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی نابالغ لڑکی سے پڑھایا تھا۔ سید صاحب نے علامہ عینی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ قدامہ بن مظعون رضی اللہ عنہ نے حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کی نومولود لڑکی سے نکاح پڑھوایا تھا۔ سید صاحب کا یہ رسالہ اس موضوع پر ایک تحقیقی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔[3]

حدیثوں پر غیرت اور ان کا انکار

عجب حال ہے کہ جنہیں حدیثوں پر غیرت آتی ہے اور اس غیرت کے سبب حدیثوں کا انکار شروع کر دیتے ہیں، انہیں آیتوں پر غیرت نہیں آتی بلکہ وہاں ایمان یاد آ

---

[1] ایضا: ص 317-318

[2] ایضا: ص 341

[3] ایضا: 339

جاتا ہے۔ چھوٹی عمر کی لڑکی کا نکاح تسلیم نہیں ہے کیونکہ یہ حدیث میں آیا ہے لیکن چھوٹی عمر کے لڑکے کو بلاوجہ قتل کرنے پر ہم ایمان لائیں گے کہ یہ قرآن میں آیا ہے۔ یہ وہ تذبذب ہے کہ جس کا شکار آج کل کے منکرین حدیث اور متجددین ہیں۔

حضرت خضر علیہ السلام کا نابالغ بچے کو قتل کرنا، حضرت جبرئیل کا مریم علیہا السلام کی تنہائی میں مرد کی صورت میں آ جانا، حضرت لوط علیہ السلام کا اپنی بیٹیوں کو اپنی قوم پر پیش کرنا وغیرہ جیسے قرآنی واقعات میں توہین، عقل، منطق سب بھول جاتا ہے، صرف ایمان یاد رہ جاتا ہے۔ تو غیرت، عقل اور منطق کے جس ترازو سے حدیث کو تول رہے ہیں، اسی ترازو سے اگر قرآن مجید کو بھی تولیں گے تو اپنے بوجھ میں کچھ نہیں بچے گا سوائے الحاد کے۔

اور حقیقت یہی ہے کہ رویے اصل میں دو ہی ہیں یا ایمان یا الحاد۔ اور جو ان کے بیچ کا ہے تو وہ یا تو منافقت ہے یا پھر وسعت مطالعہ کی کمی ہے کہ حدیث کے خلاف جتنے اعتراضات سوجھ رہے ہیں، وہ سب قرآن مجید کے خلاف مستشرقین بہت پہلے ہی نقل فرما چکے ہیں۔ قرآن بھی خبر ہے اور حدیث بھی خبر ہے۔ خبر کے اصولوں پر دونوں کو پرکھ لیں۔ اگر حدیث کو غیرت اور عقل کے اصولوں پر پرکھیں گے اور اپنے اس رویے میں مخلص ہوئے تو ضرور بالضرور قرآن کا بھی انکار کریں گے کہ قرآن میں وہ باتیں زیادہ صراحت سے موجود ہیں کہ جن کا آپ احادیث میں انکار کر چکے ہیں۔

حضرت خضر علیہ السلام کا واقعہ اگر حدیث میں منقول ہوتا تو لازماً اس کا انکار کر دیا جاتا لیکن چونکہ قرآن مجید میں نقل ہو گیا تو اب درایت وروایت کے سارے اصول بھول گئے اور محیر العقول تفصیلات اور خلافِ عقل امور کو وحی الہی تسلیم کر لیا گیا۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ دین کے ثبوت کا اصل ذریعہ خبر مقبول ہے۔ اور جب خبر مقبول سے دین ثابت ہو گیا تو چاہے وہ خبر قرآن مجید کی ہو یا حدیث کی، اس کو ماننا پڑے گا کہ یہی ایمان کا تقاضا ہے۔ اور کئی اور مقامات پر ہم اس موضوع پر تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔[1]

[1] فکر غامدی: ایک تحقیقی وتجزیاتی مطالعہ، ص 21-71

لڑکی کی رضامندی کی قانونی عمر

مختلف ممالک میں لڑکی سے رضامندی کا تعلق (the age of consent) قائم کرنے کے لیے مختلف عمر کو قانونی حیثیت دی گئی ہے۔ شمالی امریکہ، فلپائن اور انگولا میں یہ قانونی عمر 12 سال ہے۔ اور جاپان، ایران، نائیجر اور ارجنٹینا میں یہ عمر قانونی طور 13 سال ہے۔ اور جرمنی، آسٹریا، بلغاریہ، ہنگری، پرتگال، مقدونیہ، ایسٹونیا، البانیا، بوسنیا، اسرائیل، چین، بنگلہ دیش وغیرہ میں یہ 14 سال ہے۔ اور 15 اور 16 سال کی قانونی عمر تو آدھی سے زیادہ دنیا میں ہے۔[1] اور یہ تو آج کی متمدن دنیا کے ہم احوال بیان کر رہے ہیں جبکہ آپ ان قوموں کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو معلوم پڑتا ہے کہ اس قانونی عمر کا تقرر بھی اچھی خاصی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔

اور یہ بحث کرنے کا مقصد یہ ہے کہ غلامی کے بارے میں مصادرِ احادیث میں جو روایات مروی ہیں، اگر ان کا تقابل آج کل کے تصورِ آزادی سے کریں گے تو اسلام پر طعن کرنا بہت آسان ہو جائے گا لیکن اگر احادیث میں مروی غلامی کے تصور کا اُسی دور کی معاصر اقوام میں رائج غلامی سے تقابلی مطالعہ کریں گے تو اسلام سے بڑی نعمت کوئی نہ معلوم ہو گی۔ پس ایک یہ ہے کہ اُس دور میں نکاح اور شادی بیاہ کے بارے میں کلچر اور رسوم ورواج کیا تھے؟ اور ایک یہ ہے کہ آج کے رسوم ورواج اور ثقافت کیا ہے؟ تو ظاہری بات ہے کہ دونوں میں فرق ہے۔۔ تو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ایک ہی بات کو دیکھنے کے دسیوں زاویے ہو سکتے ہیں لہذا ایک ہی زاویے سے کسی بات کو دیکھ کر اس پر کوئی قطعی حکم لگا دینا بالکل بھی مناسب نہیں ہے۔ اور دیکھنے کا ایک زاویہ یہ ہے کہ جس دور کی بات ہے، اس دور کے حالات میں اتر کر اس بات کے بارے کوئی مثبت یا منفی تبصرہ کیا جائے۔

---

[1] Unknown, Minimum age of sexual consent, Retrieved 31 October, 2016, from http://www.unicef.org/lac/2._20160308_UNICEF_LACRO_min_age_of_sexual_consent.pdf

ناقدین کو حدیثوں میں ایک مثال ملی تو چڑھائی کر دی کہ نو سال میں شادی کیسے ہو سکتی ہے۔ تو یہ جو ایشیا، افریقہ اور جنوبی امریکہ میں بارہ اور تیرہ اور یورپ میں چودہ سال کی عمر میں قانون کی چھتری تلے بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے، کبھی اس پر سوال یا اعتراض کی جرات ہوئی کہ یہ کیسے ممکن ہے؟ تیرہ یا چودہ سال کی لڑکی شادی کے قابل ہوتی ہے؟ اگر ہوتی ہے تو کیا اپنی بیٹی کا نکاح اس عمر میں کرنا پسند کریں گے؟ یہ وہ انداز ہے کہ جو منکرین حدیث عام طور حدیث پر اعتراض کرتے وقت اختیار کرتے ہیں۔

شکریہ قاری حنیف ڈار صاحب

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کے وقت کی عمر کی متفق علیہ احادیث پر ایک تنقیدی پوسٹ قاری حنیف ڈار صاحب نے لگائی۔ دراصل متقدمین مفسرین، فقہاء اور محدثین کا اتفاق ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کے وقت ان کی عمر چھوٹی تھی جیسا کہ روایات میں بیان ہوا ہے اور اس مسئلے میں انہوں نے قرآن مجید کی اس آیت سے بھی دلیل پکڑی ہے کہ جس میں ان عورتوں کی عدت بیان ہوئی ہے کہ جنہیں حیض نہیں آیا۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَاللَّائِي يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيضِ مِن نِّسَائِكُمْ إِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلَاثَةُ أَشْهُرٍ وَاللَّائِي لَمْ يَحِضْنَ﴾[1]

"تمہاری عورتوں میں سے جو عورتیں حیض سے ناامید ہو گئی ہوں، اگر تمہیں شبہ ہو تو ان کی عدت تین مہینے ہے اور ان کی بھی جنہیں حیض آنا شروع ہی نہ ہوا ہو۔"

اس دلیل پر پہلے قاری صاحب کا تبصرہ ملاحظہ فرمائیں۔ پھر ہم کچھ عرض کریں گے۔

"جو آیت کوٹ کی جاتی ہے سورہ الطلاق کی (4)، ذرا اس کی شروعات دیکھیے اور ہمارے بزرگوں کی ترجمانیاں دیکھیے، یہ بات سمجھنے کے لئے مفتی ہونے کی ضرورت نہیں بس عقل ہونے کی ضرورت ہے کہ بات عورتوں کی ہو رہی

[1] الطلاق: 65: 4

ہے بچیوں کی نہیں، اور 8 یا 9 یا 10 سال کی بچی کو عربی میں کبھی نساء اور اردو میں کبھی عورت نہیں کہتے اور اللہ پاک فرما رہے کہ تمہاری عورتوں میں سے جو حیض سے خشک ہو گئی ہیں یا وہ کہ جن کو کسی بیماری یا کسی عذر کی وجہ سے حیض آیا ہی نہیں وہ سدا سے خشک ہیں ان کی عدت کی مدت تین حیض کی بجائے تین ماہ ہے۔"

عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب قول کے علاوہ تابعین میں سے سدی، قتادہ، ضحاک اور مقاتل بن سلیمان رحمہ اللہ نے قرآنی الفاظ "لم يحضن" سے مراد وہ بچیاں لی ہیں کہ جو حیض کی عمر کو نہ پہنچی ہوں۔ علاوہ ازیں امام ابن جریر طبری، امام قرطبیؒ، امام بیضاوی، امام بغوی، امام ابن کثیر، امام سیوطی، امام رازی، امام نسفی، امام ابو حیان الاندلسی، امام ابن عطیہ، امام شوکانی، امام بقاعی، امام ابو السعود، علامہ ابن جوزی، علامہ زمخشری، علامہ مراغی، علامہ مظہری، علامہ صدیق حسن خان، علامہ طنطاوی، علامہ الجزائری اور سید قطب رحمهم اللہ اور ان کے علاوہ بہت سے عربی مفسرین نے بھی اس آیت سے مراد وہ بچیاں لی ہیں کہ جنہیں چھوٹی عمر ہونے کی وجہ سے حیض نہ آیا ہو۔

پہلے تو انہوں نے ہمارے علم میں یہ اضافہ فرمایا تھا کہ سلف کی قرآن فہمی درست نہیں ہے۔ اور اب ماشاء اللہ! یہ بھی بتلا دیا ہے کہ سلف کو عربی نہیں آتی تھی۔ یعنی ابن جریر طبری، علامہ زمخشری، ابو حیان اندلسی، ابن عطیہ رحمهم اللہ جیسے ماہرین لغت اور بلاغت بھی اتنی عربی نہیں جانتے تھے کہ جتنی کامن سینس رکھنے والے گجرات کے ایک قاری صاحب کے پاس ہے۔ شکریہ قاری صاحب! آپ واقعتاً چھا گئے ہیں۔ کیا آج سے ہم اہل عرب سے یہ گزارش کر لیں کہ عربی زبان کے الفاظ انہی معانی میں استعمال کریں کہ جو قاری صاحب نے متعین کر دیے ہوں؟

بکری کے قرآن مجید کی آیات کھا جانے کی روایت

ایک دوست نے سنن ابن ماجہ کی ایک روایت کے بارے سوال کیا ہے کہ جس میں یہ ذکر ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بکری قرآن مجید کی بعض آیات کھا گئی تھی تو کیا یہ

صحیح روایت ہے؟[1] تو اس بارے عرض ہے کہ حدیث کی کتابوں میں کوئی حدیث نقل ہو جانے کا مطلب ہر گز یہ نہیں ہے کہ وہ حدیث صحیح بھی ہے۔ صحیحین کے علاوہ کتب احادیث میں ضعیف روایات بھی موجود ہیں اور موضوع (fabricated) بھی۔ جہاں تک مذکورہ بالا روایت کا معاملہ ہے تو محققین نے اس روایت کو محمد بن اسحاق کے تفرد اور مخالفتِ ثقات کے سبب مردود قرار دیا ہے لہذا ایسا کوئی واقعہ کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں ہے۔[2]

اور اگر اس روایت کو صحیح مان بھی لیا جائے تو اس کی وجہ سے قرآن مجید پر کوئی طعن وارد نہیں ہوتا کہ اس روایت میں یہ ذکر ہے کہ جو آیات اس بکری نے کھائی تھیں، وہ منسوخ التلاوۃ آیات تھیں یعنی رجم کی آیات اور رضاعت کبیر کی آیات۔ اور منسوخ آیات کو ضائع کروا دینا اور ذہنوں سے بھلوا دینا، یہ اللہ کی ذمہ داریوں میں سے ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿مَا نَنسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾[3]

"ہم جس آیت کو منسوخ کر دیتے یا اسے فراموش کرا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا ویسی ہی اور آیت بھیج دیتے ہیں۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ اللہ عزوجل ہر بات پر قادر ہے۔"

رضاعت کبیر کے بارے روایات کی صحت

بعض صحیح روایات میں اس کا تذکرہ ہے کہ کسی ضرورت کے تحت کسی بڑے لڑکے کو دودھ پلا کر اپنا رضاعی بیٹا بنایا جا سکتا ہے لیکن کسی بھی صحیح روایت میں ایسا نہیں ہے کہ کوئی خاتون کسی بڑے لڑکے کو اپنے سینے سے لگا کر اسے دودھ پلا سکتی ہے بلکہ اس سے

---

[1] ابن ماجة، أبو عبد الله محمد بن يزيد القزويني (المتوفى: 273هـ)، سنن ابن ماجة، دار الرسالة العالمية، الطبعة الأولى، 1430 هـ - 2009 م، 125/3

[2] أيضا

[3] البقرة: 2: 106

مراد یہ ہے کہ کسی برتن میں نکال کر کسی بچے کو پلایا جا سکتا ہے جیسا کہ امام ابن عبد البر رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "الاستذکار" میں اس کا ذکر کیا ہے۔[1]

اور عصر حاضر میں تو باقاعدہ انسانی ملک بینک (human milk bank) وجود میں آ چکے ہیں جیسا کہ امریکہ اور یورپ میں بہت بڑے پیمانے پر انسانی دودھ کو ڈبے کی دودھ کی طرح محفوظ کر کے اس کا کاروبار کیا جا رہا ہے۔ اور کھلاڑی عموماً کھیلوں میں بہتر کارکردگی دکھانے کے لیے انسانی دودھ کا استعمال کرتے ہیں کہ اس میں انرجی زیادہ ہوتی ہے لیکن یہ سب درست نہیں ہے کہ اس سے رضاعت کے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن اس بات کا تذکرہ اس لیے کیا ہے کہ عورت کا اپنا دودھ نکال کر کسی اور کو پلا دینا یہ ایک عام سی بات ہے۔

رضاعت کبیر سے حرمت ثابت ہوتی ہے یا نہیں تو اس بارے علماء کا اختلاف ہے۔ جمہور علماء کہتے ہیں کہ حرمت ثابت نہیں ہوتی ہے۔ بعض کا کہنا یہ ہے کہ حرمت ثابت ہوتی ہے یعنی بڑی عمر کے بچے کو بھی اگر کوئی خاتون دودھ پلا دیں تو وہ ان کا رضاعی بیٹا بن جاتا ہے۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ اگر ضرورت اور نیت ہو تو ثابت ہوتی ہے اور یہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ، امام ابن قیم رحمہ اللہ اور علماء کی ایک جماعت کا قول ہے[2] اور ہماری رائے میں یہی قول بہتر معلوم ہوتا ہے۔

حدیث میں رضاعت کبیر یعنی بڑی عمر کے بچے کو دودھ پلانے کا جو واقعہ نقل ہوا ہے تو اس میں بھی ضرورت کا بیان ہے۔ ایک صحابی ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ایک بچے سالم رضی اللہ عنہ کو بچپن سے گود لیا اور جب وہ بالغ ہو گیا تو ان کی بیوی سہلہ بنت سہیل رضی اللہ عنہا نے کہا کہ اب مجھے اس سے پردہ کرنا پڑے گا۔ لہذا انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ پوچھا اور آپ نے خاتون اور بچے کے تعلق کو ملحوظ رکھتے ہوئے جواب دے دیا۔[3] اب ایک عورت نے ایک

---

[1] ابن عبد البر، أبو عمر يوسف بن عبد الله بن محمد النمري (المتوفى: 463هـ)، الاستذكار، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى، 1421 – 2000، 255/6

[2] ابن قيم الجوزية، محمد بن أبي بكر بن أيوب بن سعد شمس الدين (المتوفى: 751هـ)، زاد المعاد في هدي خير العباد، مؤسسة الرسالة، بيروت الطبعة السابعة والعشرون، 1415هـ /1994م، 527/5

[3] مالك بن أنس بن مالك بن عامر الأصبحي المدني (المتوفى: 179هـ)، موطأ الإمام مالك، مؤسسة زايد

بچے کو بچپن سے پالا پوسا ہو تو اس کا اس سے محبت، الفت اور مانوسیت کا ایک تعلق قائم ہو جاتا ہے کہ وہ گھر کا ایک فرد بن چکا ہوتا ہے۔

لہذا اس قسم کے حالات میں پردہ دین میں ایک مشقت پیدا کر دیتا ہے اور اگر بچے کو گھر سے باہر نکال کریں تو انسانی جذبات کا کیا کریں کہ یہ ایک دوسری بڑی مشقت ہے۔ تو اس کا علاج یہ بتلایا گیا کہ اگر ایسی خاتون ایسے بچے کو اپنا دودھ پلا کر اپنا رضاعی بیٹا بنا لیں تو اس کی اجازت ہے۔ لیکن دودھ کس طرح پلائیں، اس کی وضاحت اوپر ہو چکی ہے۔

اللہ نے آپ کو کسی ایسی آزمائش میں نہیں ڈالا تو اللہ کا شکر ادا کریں ورنہ تو اس اجازت کی اہمیت کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے کہ جنہوں نے کسی سے بچہ لے کر پالا ہو۔ ایمان سے بتائیں کہ ایسا شخص ایسی حدیثوں کو سینے سے نہیں لگائے گا تو اور کیا کرے گا؟

غزوہ احد میں اللہ کے رسول ﷺ کے دندان مبارک کا شہید ہونا

دو دوستوں نے یہ سوال کیا ہے کہ کیا وہ روایت صحیح ہے کہ جس میں غزوہ احد میں اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے کے دانتوں کے شہید ہونے کا تذکرہ ہے؟ اگر صحیح ہے تو ان روایات کا کیا کریں کہ جن میں ذکر ہے کہ آپ ﷺ جب مسکراتے تو سامنے کے دانت چمکتے تھے؟ اور اس اعتراض کا کیا کریں کہ نبی کی ذات میں کوئی عیب نہیں ہو سکتا۔

ہمیں یہ اعتراف ہے کہ ہمارے ہاں قرآن مجید کے تراجم جس محنت سے ہوئے ہیں، احادیث کے تراجم اس قدر محنت اور دقت نظری سے نہیں کیے گئے۔ یہ اشکال دراصل بعض مترجمین کے ترجمہ سے پیدا ہو کہ جنہوں نے اس واقعے میں مروی عربی الفاظ "رباعية" کا ترجمہ سامنے کے دانت کر دیا ہے کہ جس سے تین غلط تاثر پیدا ہوئے کہ یہ "ثنایا" کی بات ہو رہی ہے، اور ثنایا علیا کی، اور دو دانتوں کی بات ہو رہی ہے۔

یہ روایت صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے علاوہ احادیث کے تقریباً تمام بنیادی مصادر

بن سلطان آل نهيان، أبو ظبي، الطبعة الأولى، 1425 هـ - 2004 م، كِتَابُ الرَّضَاعِ، بَابُ مَا جَاءَ فِي الرَّضَاعَةِ بَعْدَ الْكِبَرِ، 873/4

میں موجود ہے[1] بلکہ سیرت اور تاریخ کے بنیادی مصادر میں بھی موجود ہے۔ یہ واقعہ سیرت ابن اسحاق اور سیرت ابن ہشام دونوں میں موجود ہے[2] اور ہر دور میں مسلمانوں میں اس قدر معروف اور رائج رہا ہے کہ ہمارے علم کی حد تک اس کا انکار کسی سے مروی نہیں ہے۔

ثنایا، سامنے کے دانتوں کو کہتے ہیں اور جن میں سے دو اوپر کو "ثنایا علیا" اور دو نیچے کو "ثنایا سفلی" کہتے ہیں۔ جو عام طور مسکراتے ہوئے نظر آتے ہیں، وہ "ثنایا علیا" ہیں۔ اور اللہ کے رسول ﷺ کا غزوہ احد میں ایک دانت مبارک شہید ہوا جو کہ "رباعية" تھا یعنی ثنایا کے ساتھ والا دانت تھا۔

اللہ کے رسول ﷺ کے بارے جو روایات میں ملتا ہے کہ سامنے کے دانت چمکتے تھے تو عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ثنایا علیا کا ذکر ہے کہ ان سے گویا نور نکلتا تھا۔[3] اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ ثنایا بہت چمکدار تھے۔[4] اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے کہ دانتوں کے مابین خلاء تھا۔[5]

یہ تو روایات میں جمع ہو گئی کہ دونوں قسم کی روایات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ جن روایات میں دانتوں کے چمکنے کا ذکر ہے تو وہاں ثنایا کی بات ہو رہی ہے اور غزوہ احد میں جو دانت مبارک شہید ہوا تو وہ رباعی تھا۔ اور دوسری بات یہ کہ نبی کی ذات میں عیب نہیں ہوتا تو یہ بات درست ہے۔ اور اللہ کے رسول ﷺ میں پیدائشی طور کوئی عیب نہیں ہے اور نہ ہی نبوت کے دعوی کے وقت ہے کہ لوگوں کو کوئی اشکال پیدا ہو۔

---

[1] صحيح مسلم: 1417/3

[2] عبد الملك بن هشام بن أيوب الحميري، جمال الدين (المتوفى: 213هـ)، السيرة النبوية لابن هشام، شركة مكتبة ومطبعة مصطفى البابي الحلبي وأولاده بمصر، الطبعة الثانية، 1375هـ - 1955 م، 80/2

[3] الدارمي، أبو محمد عبد الله بن عبد الرحمن (المتوفى: 255هـ)، سنن الدارمي، دار المغني للنشر والتوزيع، المملكة العربية السعودية، الطبعة الأولى، 1412 هـ - 2000 م، 203/1

[4] ابن عساكر، أبو القاسم علي بن الحسن بن هبة الله (المتوفى: 571هـ)، تاريخ دمشق، دار الفكر للطباعة والنشر والتوزيع، بيروت، 1415 هـ - 1995 م، 76/18

[5] البيهقي، أحمد بن الحسين بن علي، أبو بكر (المتوفى: 458هـ)، دلائل النبوة ومعرفة أحوال صاحب الشريعة، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى، 1405 هـ، 303/1

رہا، اللہ کے رسول ﷺ کا غزوہ احد میں دانت مبارک کا شہید ہونا تو یہ عیب نہیں یہ تو شہادت ہے، نبی کے اپنے دعوی نبوت میں سچے ہونے کی شہادت کہ جو انہوں نے اپنے وجود سے دی ہے۔ دنیا کی نظر میں اپنے دشمن کے ہاتھوں مقتول ہو جانے سے بڑا کوئی عیب ہے، اور رسول مقتول بھی ہوئے ہیں۔ لیکن اللہ کے لیے مقتول ہونا، چاہے دشمن سے ہو، یہ عیب نہیں ہے۔ اللہ سمجھ عطا فرمائے۔

چلیں! ایک اور مثال سے سمجھتے ہیں۔ آپ کے بال بہت خوبصورت ہیں، کندھوں تک آتے ہیں، ان بالوں کی وجہ سے آپ کی بہت وجاہت ہے، لیکن حج کے موقع پر آپ نے حلق کروالیا تو یہ عیب نہیں ہے کہ اللہ کے لیے قربان ہونے والی شیء عیب دار نہیں، مزید خوبصورت بنا دیتی ہے، لیکن دیکھنے والی آنکھ ایمان کی ہو کہ وہ تو جسم میں اللہ کا حکم دیکھتی ہے، کہ کتنا جاری ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ بھی کندھوں تک بال رکھ لیتے تھے اور حلق بھی کروا لیتے تھے۔ اور اس حلق سے آپ ﷺ کی خوبصورتی بڑھ جاتی تھی۔

واضح رہے کہ مذکورہ بالا روایات وہ ہیں کہ جن کو بنیاد بنا کر قاری حنیف ڈار صاحب نے حدیث کے خلاف فیس بک پر مہم جوئی فرمائی اور ہم نے انہی کے اعتراضات کو ان تحریروں میں ایڈریس کیا ہے جو کہ عموماً دوسرے منکرین حدیث سے سرقہ ہی ہیں۔

قاری حنیف ڈار صاحب پرویزی فکر کے نقش قدم پر

ناقدین کے مسلسل اصرار کے بعد بالآخر قاری حنیف ڈار صاحب نے اپنا نظریہ حدیث پیش کر ہی دیا ہے کہ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ "حدیث" کی حیثیت "تاریخ اسلام" کی جتنی ہے اور یہی تو پرویزی فکر کا خلاصہ ہے کہ وہ ساری زندگی یہی دعوی کرتے رہے کہ جس کی جگالی آج قاری حنیف ڈار کر رہے ہیں۔ یہ تو اس قابل بھی نہیں ہیں کہ کوئی ایسا نیا اعتراض ہی پیدا کر سکیں جو کہ ان کے فکری آباء واجداد نہ کر گئے ہوں۔ قاری حنیف ڈار صاحب لکھتے ہیں:

"حدیث کے سارے مجموعے تاریخ اسلام سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی 95٪ انہی راویوں کی روایات 12 جلدوں میں

تاریخِ بخاری کہلاتی ہیں جبکہ 13 ویں جلد صحیح بخاری کہلاتی ہے- ہیں سب تاریخ تاریخِ اسلام اور شخصیات کی بائیو گرافی ، یعنی کہ ہسٹری آف اسلام اکارڈنگ ٹو محمد اسماعیل بخاری، مگر ان کتابوں کو قرآن کی سوکن بنا کر رکھ دیا گیا، قرآن سے زیادہ تقدس ان کا بھرا گیا، ان کو قرآن کا محافظ کہا گیا- زہر تو ہوتا ہی زہر ہے مگر بعض دفعہ خود دوا بھی زہر بن جاتی ہے۔"

اور صحیح بات یہ ہے کہ حدیث نہیں سیرت، پیغمبر کی زندگی کا تاریخی ریکارڈ ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ سیرت اور حدیث کے مصادر جدا جدا ہیں۔ کتب سیرت کو کسی نے مصدر شریعت نہیں کہا لیکن کتب حدیث تمام مکاتب فکر کے نزدیک مصادر شریعت کے مآخذ میں سے ہیں۔ چلیں، مان بھی لیں کہ حدیث تاریخ کی جتنی حیثیت رکھتی ہے لیکن کس کی تاریخ؟ یہ اس پیغمبر اسلام کی تاریخ ہے کہ جن کی اطاعت کو فرض کیا گیا ہے اور سنت کو اسوہ حسنہ بنایا گیا ہے۔

سلف صالحین کی اصطلاح میں سنت، اللہ کے رسول ﷺ کے قول، فعل اور تقریر کو کہتے ہیں اور حدیث، اس سنت کی روایت کا نام ہے۔ پس سنت پہلے ہے اور حدیث بعد میں ہے۔ سنت آپ کا قول، فعل اور تقریر ہے اور حدیث اس قول، فعل اور تقریر کے بیان کا نام ہے کہ جو صحابی کا ہوتا ہے۔ اس لیے صحیح اور ضعیف حدیث ہوتی ہے نہ کہ سنت کیونکہ سنت تو اللہ کے رسول کا قول، فعل اور تقریر ہے تو وہ کیسے ضعیف یا موضوع ہو سکتا ہے؟ البتہ وہ حدیث ضعیف یا موضوع ہو سکتی ہے کہ جس میں سنت منقول ہو۔ سنت اور حدیث کے اس فرق کو ملحوظ نہ رکھنے کے سبب سے بہت سے لوگ بہت سی غلط فہمیوں کا شکار ہوئے ہیں۔

پس سنت مظروف ہے اور حدیث اس کا ظرف ہے۔ سنت مکین ہے اور حدیث اس کا مکان ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جب آپ اہمیت کی بات کریں گے تو اصل اہمیت مظروف اور مکین کی ہے نہ کہ ظرف اور مکان کی۔ لیکن یہ بھی واضح رہے کہ بعض اوقات مظروف اپنے ظرف سے پہچانا جاتا ہے اور مکین کا تشخص اس کا مکان بن

جاتا ہے۔ لہذا دونوں کی اہمیت مسلم ہے۔ سلف صالحین کے نزدیک مصادر دین، کتاب وسنت ہی ہیں۔ کتاب تو "ما بین الدفتین" موجود ہے اور سنت کہاں ہے؟ یہ اہم سوال ہے کہ جس سے حدیث کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔ سنت کا صرف اور صرف ایک ہی مصدر ہے اور وہ احادیث کی کتب ہیں۔

قاری حنیف ڈار اور محدثین کے منہج کا فرق

قاری حنیف ڈار صاحب کو شکایت ہے کہ انہوں نے دس حدیثوں کا انکار کیا ہے تو لوگ ان کے پیچھے پڑ گئے ہیں جبکہ وہ نماز روزے، حج زکوۃ، حلال وحرام، بیع شراء اور اخلاقیات وغیرہ کی حدیثوں کو مانتے ہیں۔

تو ہمیں یہ عرض کرنا ہے قاری صاحب کہ آپ کہتے ہیں کہ آپ نے دس حدیثوں کا انکار کر دیا تو آپ پر اتنی لعن طعن ہوئی لیکن یہ بھی تو سوچیں کہ ایک محدث دس ہزار حدیثوں کو رد کر دیتا ہے، کوئی اس پر لعن طعن نہیں کرتا۔ لوگ اسے سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں، اسے امیر المومنین فی الحدیث کہا جاتا ہے، اس کی تحقیقات سے علماء استفادہ کرتے ہیں، منبروں پر بیان شروع ہو جاتا ہے کہ یہ حدیث "مردود" (rejected) ہے، تو فرق کہاں ہے؟

پھر "انکار حدیث" اور "رد حدیث" میں فرق ہے۔ "انکار حدیث" کا کوئی اصول نہیں ہے، کوئی ضابطہ نہیں ہے، بس دل نہیں مان رہا لہذا حدیث کا انکار کر دو جبکہ "رد حدیث" ایک فن اور آرٹ ہے جو سیکھنے سے آتا ہے، حدیث کو مردود قرار دینے کے اصول وضوابط ہیں جو صدیوں میں متعین ہوئے ہیں، اس پر سینکڑوں کتب مرتب ہوئیں، ہزاروں شروحات لکھی گئیں۔

مسئلہ آپ کی اہلیت اور اسٹائل کا بھی ہے۔ اگر ایم۔ بی۔ ایس ڈاکٹر کسی مریض کی رسولی کا علاج کرنے کے لیے آپریشن تھیٹر میں اس کے پیٹ کی چیڑ پھاڑ کریں گے تو اگر مریض صحت یاب نہ بھی ہو تو لوگ ڈاکٹر کو الزام نہیں دیں گے کہ روزانہ ہسپتالوں میں ہزاروں مریض مرتے ہیں لیکن بات یہ ہے کہ ڈاکٹر اس مرض کے علاج کی اہلیت

رکھتا ہے اور وہ علاج کے طریقہ کار کی ہدایات (medical science) کو فالو کرتا ہے جبکہ "عطائی" کے پاس یہ سب کچھ نہیں ہوتا سوائے لوگوں کو بے وقوف بنانے کی خداداد صلاحیت کے۔

باقی میں نے شاید یہاں فیس بک پر ہر اچھے رائٹر کو پڑھا ہے، ان کو بھی کہ جن کے لائکس اور شیئرز ہزاروں میں ہوتے ہیں۔ لیکن میری رائے میں لفظ سے کھیلنا دو لوگوں کو آتا ہے؛ رعایت اللہ فاروقی صاحب اور قاری حنیف ڈار صاحب کو۔ چاہے کوئی ہماری مخالف ٹیم سے ہی کیوں نہ ہو لیکن ہم اس کے "کھیل" کو داد دینے میں بخل نہیں کریں گے۔ بھلے ان کی جیت پر لعنت بھیج کر داد دیں۔

اور اگر آپ میڈیکل سائنس کی دو چار کتابیں پڑھ کر کسی مریض کے پیٹ کی رسولی نکالنا شروع کر دیں گے تو ہر کوئی آپ کو لعن طعن کرے گا، چاہے آپ کتنے ہی مخلص کیوں نہ ہوں اور چاہے آپ اس کے پیٹ کی رسولی نکال بھی دیں تو بھی قانون کی نظر میں مجرم ہوں گے۔ علامہ البانی رحمہ اللہ نے ضعیف اور موضوع روایتوں کی نشاندہی کرتے کرتے انسائیکلوپیڈیاز مرتب کر دیے ہیں لیکن انہیں تو دنیا "محدث العصر" کا نام دے رہی ہے۔ اس فرق کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ آپ نے اپنی نااہلی کے سبب دس حدیثوں کا جس طرح انکار کیا ہے، اس اسٹائل نے پورے ذخیرہ حدیث کے صحیح ہونے پر ایک سوالیہ نشان کھڑا کر دیا ہے؟

احادیث کی جانچ پڑتال یا اس کے رد و قبول کی ایک سائنس مرتب ہو چکی ہے کہ جسے "اصول حدیث" کہتے ہیں۔ اسے صدیوں میں ہزاروں علماء نے مرتب کیا ہے اور اب اس پر تمام مکاتب فکر کے علماء کا اتفاق چکا ہے کہ اسی سائنس کی روشنی میں حدیث کے ذخیرہ کو پرکھا جائے گا۔ حدیث کا رد کرنا آپ کا اتنا مسئلہ نہیں ہے جتنا کہ وہ طریقہ کہ جس سے آپ رد کرتے ہیں۔ آپ مروجہ میڈیکل سائنس کا انکار کر کے ایک نیا طریقہ علاج متعارف کروانا چاہتے ہیں جو اسی طرح ممکن ہے کہ آپ میڈیکل سائنس میں اپنا اتنا نام پیدا کر لیں کہ آپ بات کریں تو اس میدان کے ماہرین آپ کی بات کو توجہ سے

سنیں، اور وہ اہلیت آپ میں بدقسمتی سے ہے نہیں۔

چچا، پھوپھی، ماموں اور خالہ کی بیٹی سے شادی

ایک دوست نے سوال کیا ہے کہ بعض منکرین حدیث کا دعوی ہے کہ چچا، پھوپھی، ماموں اور خالہ کی بیٹی سے نکاح جائز نہیں ہے، تو اس کی کیا حقیقت ہے؟ میں نے پوچھا کہ وہ اس دعوے کی کیا دلیل بیان کرتے ہیں؟ تو دوست نے کہا کہ سورۃ الاحزاب کی آیت 50 کا حوالہ دیتے ہیں۔ مذکورہ آیت یوں ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ اللَّاتِي آتَيْتَ أُجُورَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ مِمَّا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَيْكَ وَبَنَاتِ عَمِّكَ وَبَنَاتِ عَمَّاتِكَ وَبَنَاتِ خَالِكَ وَبَنَاتِ خَالَاتِكَ اللَّاتِي هَاجَرْنَ مَعَكَ وَامْرَأَةً مُّؤْمِنَةً إِن وَهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ إِنْ أَرَادَ النَّبِيُّ أَن يَسْتَنكِحَهَا خَالِصَةً لَّكَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ﴾[1]

"اے پیغمبر ہم نے تمہارے لئے تمہاری بیویاں جن کو تم نے ان کے مہر دے دیئے ہیں حلال کر دی ہیں۔ اور تمہاری لونڈیاں جو خدا نے تم کو (کفار سے بطور مال غنیمت) دلوائی ہیں اور تمہارے چچا کی بیٹیاں اور تمہاری پھوپھیوں کی بیٹیاں اور تمہارے ماموؤں کی بیٹیاں اور تمہاری خالاؤں کی بیٹیاں جو تمہارے ساتھ وطن چھوڑ کر آئی ہیں (سب حلال ہیں)۔ اور کوئی مومن عورت اگر اپنے تیئں پیغمبر کو بخش دے (یعنی مہر لینے کے بغیر نکاح میں آنا چاہے) بشر طیکہ پیغمبر بھی ان سے نکاح کرنا چاہیں (وہ بھی حلال ہے لیکن) یہ اجازت (اے محمد ﷺ) خاص تم ہی کو ہے سب مسلمانوں کو نہیں۔"

اب احادیث کا انکار کرنے والوں نے ﴿خَالِصَةً لَّكَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ﴾ کہ یہ اجازت اہل ایمان کے علاوہ خاص آپ ﷺ کے لیے ہے، کے الفاظ سے یہ استدلال کیا ہے کہ چچا، پھوپھی، ماموں اور خالہ کی بیٹی سے نکاح کی اجازت صرف آپ ﷺ کے لیے خاص ہے، عام مسلمانوں کے لیے نہیں ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ﴿خَالِصَةً لَّكَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ﴾ کا تعلق صرف

[1] الأحزاب: 33: 50

﴿وَامْرَأَةً مُّؤْمِنَةً إِن وَهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ إِنْ أَرَادَ النَّبِيُّ أَن يَسْتَنكِحَهَا﴾ سے ہے کہ اگر کوئی عورت خود سے اپنے آپ کو نبی ﷺ کے لیے ہبہ کر دے تو یہ صورت صرف آپ ﷺ کے لیے جائز ہے۔ عام مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ کوئی عورت خود سے اپنے آپ کو اس کے لیے ہبہ کر دے کہ اس عورت سے تمتع اس کے جائز ہو جائے۔ ہبہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ وہ عورت اپنے ولی کی اجازت اور حق مہر کے بغیر نبی کے نکاح میں آنا چاہے تو ایسا جائز ہے لیکن یہ حکم بھی عارضی تھا کہ بعد میں ﴿لَّا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِن بَعْدُ﴾ کے حکم کے ذریعے مزید کسی بھی قسم کے نکاح سے آپ ﷺ کو روک دیا گیا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر ﴿خَالِصَةً لَّكَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ﴾ کا تعلق تمام آیت سے مان لیا جائے تو اس کا مطلب ہے کہ شروع آیت میں جو بیان ہے کہ وہ بیویاں کہ جن کے حق مہر ادا کیے گئے ہوں، وہ بھی صرف نبی ﷺ کے لیے ہی حلال ہوں گی۔ اور اس طرح منکر حدیث کے لیے اس کی کوئی بھی بیوی کہ جس کا حق مہر وہ ادا کر چکا ہو، حلال نہ رہے گی۔ تیسری بات یہ کہ ﴿خَالِصَةً﴾ جو کہ نصب میں ہے حال ہے، ﴿وَامْرَأَةً﴾ سے جو کہ اس کا ذوالحال ہے لہذا وہ معنی جو کہ منکر حدیث بیان کر رہا ہے، عربی زبان اور گرامر کے خلاف ہے۔ اور حال اور صفت میں فرق یہ ہے کہ حال عارضی ہوتا ہے جبکہ صفت میں دوام ہوتا ہے جیسا کہ ہنسنا انسان کا حال ہے جبکہ گورا ہونا صفت ہے۔ چوتھی بات یہ ہے کہ سورۃ النساء کی آیت 24 میں عام مسلمانوں کے لیے محرمات کی فہرست بیان کر کے باقی سب کو حلال کر دیا گیا۔ اور باقی سب میں چچا، پھوپھی، ماموں اور خالہ کی بیٹی بھی شامل ہے۔

پانچویں بات یہ ہے کہ آل بیت میں ایسی شادیاں ہوئی ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹی زینب رحمہا اللہ کا نکاح ان کے چچازاد بھائی عبد اللہ بن جعفر رحمہ اللہ سے کیا۔ اسی طرح حضرت ام کلثوم بنت علی رحمہا اللہ کا نکاح حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ان کے چچازاد بھائی عون بن جعفر رحمہ اللہ سے ہوا۔ اور ان کی وفات کے بعد ان کے بھائی محمد

بن جعفر رحمہ اللہ سے ہوا۔ اور ان کی وفات کے بعد ان کے بھائی عبد اللہ بن جعفر رحمہ اللہ سے ہوا اور انہی سے زینب بنت علی رضی اللہ عنہ کا نکاح بھی ہو چکا تھا۔[1] اور اس کی مثالیں صحابہ میں بہت زیادہ ہیں بلکہ ایک اعتبار سے غور کریں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نکاح بھی اپنے چچا کی پوتی سے ہوا ہے جبکہ بنات کا لفظ بیٹیوں اور پوتیوں دونوں کو شامل ہے۔

خلاصہ کلام

خلاصہ کلام یہی ہے کہ احادیث پر اصولی اور فروعی اعتراضات یا تو نظری تعصب کا نتیجہ ہیں یا پھر مسلسل ایک مخصوص زاویے ہی سے احادیث کو دیکھنے کا اثر ہے۔ اور احادیث پر کوئی بھی اصولی یا فرعی اعتراض ایسا نہیں ہے کہ جس کا منقول و معقول جواب موجود نہ ہو۔ ہمیں احساس ہے کہ بعض ایسی روایات کا ابھی ہم نے طوالت کے خوف سے ذکر نہیں کیا ہے کہ جن پر اعتراضات کیے گیے ہیں۔

❁❁❁❁❁❁❁

[1] محمد بن سعد بن منيع البصري، أبو عبد الله (المتوفى: 230هـ)، الطبقات الكبرى، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى، 1410 هـ - 1990 م، 338/8